

فقہائے ہند

جلد سوم

www.KitaboSunnat.com

دسویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

ادارۃ ثقافت اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ
محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

فہمائے ہند

جلد سوم

دسویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

www.KitaboSunnat.com

ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

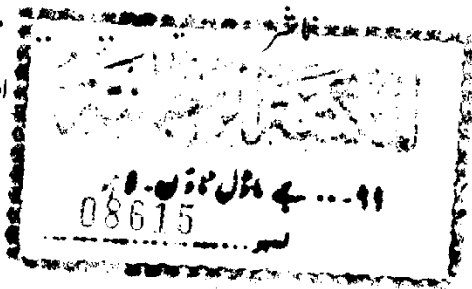
جملہ حقوق محفوظ

بار اول ۱۹۷۶

تعداد ۱۱۰۰

مطبع ندرت پرنٹرز، ۴۰- اردو بازار لاہور

محمد اشرف ڈار (اعزازی سکریٹری
ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور)



فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱	مقدمہ	
۱	سکندر لودھی	
۲۲	ابراہیم لودھی	
۲۶	بابر	
۳۱	ہمایوں	
۳۶	شیر شاہ سوری	
۴۶	ہمایوں کی ہندوستان میں واپسی	
۵۱	سلاطین گجرات	
۵۱	سلطان محمود بیگ	
۵۷	سلطان مظفر حلیم	
۶۲	بہادر شاہ	
۶۳	سلاطین سندھ	
۶۴	شاہی بیگ	
۶۵	مرزا شاہ حسین	
۶۷	جام نظام الدین	
۶۸	کشمیر	
۶۹	سلطنت مالوہ	
۷۰	دکن کی سلطنتیں	
۷۶	سلطنت ملتان	

فقہائے ہند جلد سوم

۷۸	سلطنتِ بنگال	
۷۸	ایک وضاحت	
۷۹	کچھ اس کتاب کے بارے میں	
	۱	
۸۱	سید ابراہیم بن احمد بغدادی	۱
۸۲	شیخ ابراہیم بن جمال الدین سندھی	۲
۸۲	مولانا ابراہیم بن فتح اللہ طمانی	۳
۸۷	قاضی ابراہیم بن محمد کالیپوری	۴
۸۸	شیخ ابراہیم بن معین الدین ایرجی	۵
۸۹	حاجی ابراہیم سرہندی	۶
۹۶	شیخ ابراہیم جون پوری	۷
۹۷	قاضی ابراہیم سندھی	۸
۹۷	شیخ ابوالسحاق لاہوری	۹
۹۹	شیخ ابوبکر اکبر آبادی	۱۰
۹۹	قاضی ابوسعید بھکری سندھی	۱۱
۱۰۰	شیخ ابوالغیث حسینی بخاری	۱۲
۱۰۱	شیخ ابوالفتح بن جمال الدین مکی	۱۳
۱۰۳	مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری	۱۴
۱۰۵	شیخ ابوالفضل خطیب گادرونی	۱۵
۱۰۶	سید ابوالفضل حسینی استر آبادی	۱۶
۱۰۷	شیخ ابوالقاسم بن احمد مکی	۱۷
۱۰۸	قاضی ابوالمعالی بخاری	۱۸
۱۱۰	شیخ ابویرید برہان پوری	۱۹

فہرست مضامین

۱۱۱	مولانا اشیر الدین کامبانی	۲۰
۱۱۲	شیخ احمد بن ابوالفتح غازی پوری	۲۱
۱۱۳	قاضی احمد بن اسماعیل ظفر آبادی	۲۲
۱۱۳	شیخ احمد بن اسحاق سندھی	۲۳
۱۱۳	شیخ احمد بن اسماعیل مندوی	۲۴
۱۱۳	شیخ احمد بن بدر الدین مصری	۲۵
۱۱۶	شیخ احمد بن جعفر گجراتی	۲۶
۱۱۶	شیخ احمد بن خلیل بیجا پوری	۲۷
۱۱۷	شیخ احمد بن زین الدین جون پوری	۲۸
۱۱۸	شیخ احمد بن ضیاء الدین مندوی	۲۹
۱۱۸	شیخ احمد بن عبدالقدوس گنگوہی	۳۰
۱۱۹	شیخ احمد بن عبدالملک لاہوری	۳۱
۱۱۹	شیخ احمد بن مجد الدین شیبانی	۳۲
۱۲۱	شیخ احمد بن محمد نردالا	۳۳
۱۲۲	شیخ احمد بن محمد بہاری	۳۴
۱۲۲	مفتی احمد بن محمد سندیلوی	۳۵
۱۲۳	شیخ احمد سرہندی	۳۶
۱۲۳	شیخ احمد فیاض امیٹھوی	۳۷
۱۲۴	سید احمد ملتانی	۳۸
۱۲۵	شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری	۳۹
۱۲۷	شیخ اسماعیل بن ابدال لاہوری	۴۰
۱۲۸	شیخ اسماعیل بن عبداللہ لاہوری	۴۱
۱۲۹	شیخ اسماعیل بن محمد ملتانی	۴۲

فقہائے ہندی جلد سوم

۱۲۹	علامہ اسماعیل نقشبندی لاہوری	۴۳
۱۲۹	شیخ اللہ بخش گیلانی لاہوری	۴۴
۱۳۰	شیخ اللہ بخش گجراتی	۴۵
۱۳۰	شیخ اللہ داد بن عبداللہ جون پوری	۴۶
۱۳۳	مولانا اللہ داد بن کمال الدین لکھنوی	۴۷

ب

۱۳۵	شیخ بایزید سندھی	۴۸
۱۳۶	شیخ بدرالدین گجراتی	۴۹
۱۳۶	شیخ بدرالدین حسینی اکبر آبادی	۵۰
۱۳۶	شیخ برہان الدین کاپڑوی	۵۱
۱۳۸	قاضی برہان الدین گجراتی	۵۲
۱۳۹	مولانا برہان الدین ملتانی	۵۳
۱۳۹	شیخ بلال محدث سندھی	۵۴
۱۳۹	شیخ بہار الدین انصاری جیندی	۵۵
۱۴۰	شیخ بہار الدین عمری جون پوری	۵۶
۱۴۱	شیخ بہار الدین گجراتی	۵۷

پ

۱۴۲	شیخ پیر محمد گجراتی	۵۸
-----	---------------------	----

ت

۱۴۲	شیخ تاج الدین مندوی	۵۹
۱۴۳	مولانا تقی الدین پنڈوی	۶۰

ج

۱۴۳	شیخ جعفر بن میران سندھی	۶۱
۱۴۴	قاضی جگن گجراتی	۶۲

فہرست مضامین

۱۴۸	شیخ جلال الدین اکبر آبادی	۶۳
۱۴۹	شیخ جلال الدین جمالی دہلوی	۶۴
۱۵۰	شیخ جلال الدین تھانیسری	۶۵
۱۵۱	شیخ جلال الدین برہان پوری	۶۶
۱۵۲	قاضی جلال الدین ملتانی	۶۷
۱۵۳	شیخ جلال الدین بدایونی	۶۸
۱۵۳	شیخ جلال الدین کالپوی	۶۹
۱۵۴	شیخ جمال الدین بن محمود گجراتی	۷۰
۱۵۴	مفتی جمال الدین بن نصیر الدین دہلوی	۷۱
۱۵۵	شیخ جمال الدین برہان پوری	۷۲
۱۵۶	شیخ جمال محمد گجراتی	۷۳
۱۵۶	مفتی جنید قریشی ملتانی	۷۴
	ج	
۱۵۷	شیخ چندن اکبر آبادی	۷۵
۱۵۷	شیخ چندن جون پوری	۷۶
۱۵۷	شیخ چندن مندسوری	۷۷
	ح	
۱۵۸	مولانا حاتم سنہبلی	۷۸
۱۶۴	قاضی حبیب اللہ گھوسوی	۷۹
۱۶۴	شیخ حسام الدین متقی ملتانی	۸۰
۱۶۶	شیخ حسن بن احمد گجراتی	۸۱
۱۶۷	شیخ حسن بن حسام الدین نارانولی	۸۲
۱۶۷	شیخ حسن بن طاہر جون پوری	۸۳

فقہائے ہند جلد سوم

۱۶۸	شیخ حسن بن عبداللہ کالپوی	۸۲
۱۶۹	شیخ حسن بن موسیٰ گجراتی	۸۵
۱۶۹	شیخ حسن عرب دا بھولی گجراتی	۸۶
۱۷۰	خواجہ حسین ہروی	۸۷
۱۷۱	شیخ حسین بزری	۸۸
۱۷۲	قاضی حماد ردو لوی	۸۹
۱۷۲	مولانا حمید الدین سنھیلی	۹۰
	خ	
۱۷۳	شیخ خواجگی سدھوری	۹۱
	د	
۱۷۴	شیخ داؤد بن فتح اللہ کرمانی	۹۲
۱۷۵	قاضی داؤد فتح پوری سندھی	۹۳
۱۷۵	قاضی دتہ سیوستانی	۹۴
۱۷۶	مولانا درویش محمد دہلوی	۹۵
	س	
۱۷۶	شیخ راجح بن داؤد گجراتی	۹۶
۱۷۷	شیخ رحمت اللہ سندھی	۹۷
۱۷۹	شیخ رحمت اللہ گجراتی	۹۸
۱۷۹	شیخ رفیع الدین محدث شیرازی	۹۹
۱۸۰	شیخ رکن الدین بیانوی	۱۰۰
۱۸۰	شیخ رکن الدین سندھی	۱۰۱
	ذ	
	شیخ زین الدین بن عبدالعزیز مالاباری	۱۰۲

فہرست مضامین

ز

۱۸۱	شیخ زین الدین بن علی مالاباری	۱۰۳
	س	
۱۸۲	شیخ سالار بن ہبۃ اللہ کوری	۱۰۴
۱۸۲	شیخ سعد الدین لاری	۱۰۵
۱۸۵	مولانا سعد اللہ لاہوری	۱۰۶
۱۸۵	شیخ سعد اللہ بیانوی	۱۰۷
۱۸۶	مولانا سعد اللہ سندھی	۱۰۸
۱۸۶	شیخ سعید حبشی	۱۰۹
۱۸۷	شیخ سلیمان بن عفان ماٹوی	۱۱۰
۱۸۸	شیخ سمار الدین ملتانی	۱۱۱
	ش	
۱۸۹	شاہی بیگ قندھاری ارغون	۱۱۲
۱۹۱	شیخ شرف الدین شیرازی	۱۱۳
۱۹۱	مولانا شعیب واعظ دہلوی	۱۱۴
۱۹۲	شیخ شکر گجراتی	۱۱۵
۱۹۲	قاضی شکر اللہ سندھی	۱۱۶
۱۹۳	مولانا شمس الحق جون پوری	۱۱۷
۱۹۵	علامہ شمس الحق گیلانی	۱۱۸
۱۹۷	قاضی شمس الدین ملتانی	۱۱۹
۱۹۷	شیخ شمس الدین بیجا پوری	۱۲۰
۱۹۸	مولانا شمس الدین کشمیری	۱۲۱
۱۹۸	ملا شکر ف کنانی کشمیری	۱۲۲
۱۹۸	سید شیخ بن عبد اللہ حضرمی احمد آبادی	۱۲۳

فقہائے ہند جلد سوم

ص

۲۰۰	قاضی صدر الدین جالندھری لاہوری	۱۲۴
۲۰۲	شیخ صدر الدین سندھی	۱۲۵
۲۰۳	سید صدر الدین قنوجی	۱۲۶
۲۰۳	سید صفائی ترمذی	۱۲۷
۲۰۳	قاضی صلاح الدین جون پوری	۱۲۸

ض

۲۰۴	مولانا ضیاء الدین مدنی	۱۲۹
۲۰۵	مولانا طیب سندھی	۱۳۰

ع

۲۰۵	مولانا عباس سندھی	۱۳۱
۲۰۶	میر سید عبدالاول جون پوری	۱۳۲
۲۰۷	شیخ عبدالجلیل جون پوری	۱۳۳
۲۰۷	شیخ عبدالحکیم برہان پوری	۱۳۴
۲۰۸	شیخ عبدالحکیم سنہیلی	۱۳۵
۲۰۸	مولانا عبدالحمی دہلوی	۱۳۶
۲۰۸	مولانا عبدالرحمن لاہوری	۱۳۷
۲۰۹	مولانا عبدالرحمن ملتانوی	۱۳۸
۲۰۹	شیخ عبدالرحمن لاہور پوری	۱۳۹
۲۱۰	میرک عبدالرحمن ٹھٹھوی	۱۴۰
۲۱۰	مولانا عبدالرحمن ٹھٹھوی	۱۴۱
۲۱۰	قاضی عبدالرحیم سہارن پوری	۱۴۲

۲۱۱	شیخ عبدالرشید سندھی	۱۴۳
۲۱۱	مولانا عبدالسلام لاہوری	۱۴۴
۲۱۲	قاضی عبدالسمیع اندخانی	۱۴۵
۲۱۲	قاضی عبدالشکور سہسوانی	۱۴۶
۲۱۶	شیخ عبدالصمد ردو لوی	۱۴۷
۲۱۷	شیخ عبدالصمد سرہندی	۱۴۸
۲۱۷	شیخ عبدالعزیز دہلوی	۱۴۹
۲۱۹	شیخ عبدالعزیز گجراتی	۱۵۰
۲۲۳	مولانا عبدالعزیز ابہری کابانی	۱۵۱
۲۲۶	قاضی عبدالغفور پانی پتی	۱۵۲
۲۲۶	مفتی عبدالغفور امر وہوی	۱۵۳
۲۲۶	شیخ عبدالغفور اعظم پوری	۱۵۴
۲۲۷	شیخ عبدالغنی فتح پوری	۱۵۵
۲۲۸	علامہ عبدالقادر سرہندی	۱۵۶
۲۲۸	قاضی عبداللہ سندھی	۱۵۷
۲۳۰	مولانا عبداللہ تلنہی	۱۵۸
۲۳۳	مولانا عبداللہ بخون پوری	۱۵۹
۲۳۴	شیخ عبداللہ متقی سندھی	۱۶۰
۲۳۶	شیخ عبداللہ انصاری سلطان پوری	۱۶۱
۲۴۱	مخدوم الملک کی زندگی کا ایک اور پہلو	
۲۴۶	شیخ عبداللہ نیازی پر بے پناہ تشدد	
۲۴۸	عمل و کردار کا ایک اور نمونہ	
۲۵۰	علمائے دنیا اور فقہائے سور	

فقہائے ہند جلد سوم

۲۵۶	تصنیفات	
۲۵۶	مولانا عبداللہ الاموی	۱۶۲
۲۵۶	مولانا عبداللہ ملتانی	۱۶۳
۲۵۷	مولانا عبداللہ بدایونی	۱۶۴
۲۵۹	شیخ عبدالعظیٰ بکثیر مکی	۱۶۵
۲۶۴	مفتی عبدالملک امرہوی	۱۶۶
۲۶۴	شیخ عبدالملک احمد آبادی	۱۶۷
۲۶۵	شیخ عبدالنبی گنگوہی	۱۶۸
۲۶۶	منصب صدر الصدور	
۲۶۶	مسجد کی جگہ مندر کی تعمیر اور ایک ہندو کا قتل	
۲۶۷	شائم رسول کی سزا — علما کے دو گروہ	
۲۶۹	ملا عبدالقادر سے اکبر کا استفسار	
۲۷۱	ملا مبارک کی تجویز	
۲۷۲	شیخ کاغور و زکیر	
۲۷۴	تصنیفات	
۲۷۴	اکبر کے حکم سے حجاز کو روانگی	
۲۷۵	وفات	
۲۷۷	شیخ محمد اکرام کا تجزیہ	
۲۸۱	بدایونی کی وجہ مخالفت	
۲۸۱	فیضی کے اشعار	
۲۸۲	شائم رسول کی سزا	
۲۸۸	شیخ عبدالوہاب اکبر آبادی	۱۶۹
۲۸۹	مولانا عبدالوہاب کشمیری	۱۷۰

فہرست مضامین

ک

۲۹۰	مولانا عزیز اللہ رددولوی	۱۷۱
۲۹۰	مولانا عزیز اللہ تلمبئی	۱۷۲
۲۹۱	مولانا غلام الدین لاہوری	۱۷۳
۲۹۲	شیخ علی متقی بن حسام الدین بریلوی پوری	۱۷۴
۳۰۶	مولانا عمر جامعوی	۱۷۵

ف

۳۰۶	شیخ فخر الدین اکبر آبادی	۱۷۶
۳۰۷	شیخ فخر الدین جون پوری	۱۷۷
۳۰۷	قاضی فضل اللہ دیوبندی	۱۷۸
۳۰۸	مولانا فضل اللہ ہتکی	۱۷۹

ق

۳۰۸	شیخ قاسم بن یوسف سندھی	۱۸۰
۳۰۹	مولانا قاسم دیوان سندھی	۱۸۱
۳۱۰	قاضی قاضی بھکری سندھی	۱۸۲

ک

۳۱۱	شیخ کبیر الدین جون پوری	۱۸۳
۳۱۲	مولانا کبیر الدین سندھی	۱۸۴

م

۳۱۲	شیخ مبارک بنارس	۱۸۵
۳۱۳	قاضی مبارک گویا موی	۱۸۶
۳۱۴	قاضی مبارک جھنجھانوی	۱۸۷
۳۱۴	شیخ مبارک سندھی	۱۸۸
۳۱۵	شیخ مبارک الوری	۱۸۹

۳۱۶	شیخ محب اللہ سہوڑی	۱۹۰
۳۱۶	علامہ محمد بن احمد فاکھی	۱۹۱
۳۲۰	شیخ محمد بن احمد نروالی	۱۹۲
۳۲۵	شیخ محمد بن اسحاق سندھی	۱۹۳
۳۲۶	شیخ محمد بن طاہر پٹنی	۱۹۴
۳۳۱	شیخ محمد بن عاشق چیریا کوٹی	۱۹۵
۳۳۲	شیخ محمد بن عبدالملک قاری خالدی	۱۹۶
۳۳۲	شیخ محمد بن عمر محرق حضرمی	۱۹۷
۳۳۸	شیخ محمد بن فخر الدین جون پوری رہنمائی	۱۹۸
۳۳۹	شیخ محمد بن مبارک جون پوری	۱۹۹
۳۴۲	شیخ محمد بن محمد ایچی	۲۰۰
۳۴۳	شیخ محمد بن محمد گجراتی	۲۰۱
۳۴۴	شیخ محمد بن محمد مالکی مصری	۲۰۲
۳۴۶	شیخ محمد بن محمد ٹھٹھوی سندھی	۲۰۳
۳۴۶	سید محمد بن منتجب امر وہوی	۲۰۴
۲۴۷	شیخ محمد بن مسکن ملا لوی	۲۰۵
۳۴۸	سید محمد جون پوری	۲۰۶
۲۵۸	شیخ محمد بن یوسف برہان پوری	۲۰۷
۳۵۸	شیخ محمد اوچی	۲۰۸
۳۵۹	مولانا مفتی محمد لاہوری	۲۰۹
۳۵۹	شیخ محمد ناطقی فقیہ	۲۱۰
۳۶۰	قاضی محمد تھانیسری	۲۱۱
۳۶۰	مولانا محمد حسین یزدی	۲۱۲

۳۶۰	مولانا محمد درویش جون پوری	۲۱۳
۳۶۱	مولانا محمد سعید خراسانی المعروف بہ میر کلال	۲۱۴
۳۶۲	قاضی محمد معین لاہوری	۲۱۵
۳۶۳	میرک محمود بن ابوسعید سندھی	۲۱۶
۳۶۴	قاضی محمود بن احمد ناطلی	۲۱۷
۳۶۵	شیخ محمود بن بابو گجراتی	۲۱۸
۳۶۵	ملک محمود بن پیارو گجراتی	۲۱۹
۳۶۶	قاضی محمود بن حامد گجراتی	۲۲۰
۳۶۷	مفتی محمود بن عطار اللہ امر دہوی	۲۲۱
۳۶۷	قاضی محمود گجراتی	۲۲۲
۳۶۸	میر مرتضی شیرازی	۲۲۳
۳۶۹	مولانا مرشد الدین صفوی	۲۲۴
۳۷۰	شیخ مصطفیٰ بن عبدالستار سہارن پوری	۲۲۵
۳۷۰	شیخ مصلح الدین لاری	۲۲۶
۳۷۲	سلطان مظفر حلیم والی گجرات	۲۲۷
۳۷۳	قاضی منجملہ جون پوری	۲۲۸
۳۷۴	قاضی منجمن کمال پوری	۲۲۹
۳۷۴	شیخ منصور لاہوری	۲۳۰
۳۷۵	قاضی سن اللہ کاکوری	۲۳۱
۳۷۵	شیخ میران سندھی	۲۳۲
۳۷۶	قاضی مینا بن یوسف مندوی	۲۳۳
۳۷۶	شیخ میاں جیو گجراتی	۲۳۴

ن

۳۷۷	قاضی نجم الدین گجراتی	۲۳۵
۳۷۸	قاضی نصر اللہ بھکری سندھی	۲۳۶
۳۷۸	شیخ نصیر الدین گجراتی	۲۳۷
۳۷۹	شیخ نظام الدین کاکردی	۲۳۸
۳۸۰	شیخ نظام الدین امیٹھوی	۲۳۹
۳۸۱	شیخ نظام الدین نارولی	۲۴۰
۳۸۲	شیخ نظام الدین خیر آبادی	۲۴۱
۳۸۳	علامہ نظام الدین بدخشی	۲۴۲
۳۸۴	شیخ نور بن نعمت اللہ سندھی	۲۴۳

و

۳۸۵	مولانا وحید الدین علوی گجراتی	۲۴۴
-----	-------------------------------	-----

ز

۳۸۹	علامہ ہبۃ اللہ شیرازی	۲۴۵
-----	-----------------------	-----

ح

۳۹۰	مولانا یار محمد سندھی	۲۴۶
۳۹۱	شیخ یحییٰ بن ابوالفیض احراری	۲۴۷
۳۹۱	سید نسیم ساناوی	۲۴۸
۳۹۲	قاضی یعقوب مانک پوری	۲۴۹
۳۹۳	شیخ یوسف بن احمد گجراتی	۲۵۰
۳۹۳	مولانا یوسف سندھی	۲۵۱
۳۹۴	مولانا یونس سمرقندی	۲۵۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

سلسلہ فقہائے ہند کی تیسری جلد ہے جو توفیقِ خداوندی قارئینِ محترم کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک حمداً کثیراً وکثیراً۔

اس میں اپنے محدود علم کے مطابق برصغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے علماء و فقہاء کے حالات و سوانح ضبطِ نثر میں لائے گئے ہیں اور ان کی علمی و فقہی مساعی کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اہل علم کی اس قابلِ احترام جماعت میں بعض بورنیشن اور دینی منش بزرگ تھے جو حکومت و سطوت کے پرشکوہ ایوانوں سے کوئی راہ و رسم نہ رکھتے تھے۔ ان کا میدانِ عمل صرف درس و تدریس یا وعظ و تذکیر تھا۔ اس اہم خدمتِ دین کی انجام دہی کے لیے انھوں نے مختلف ذراویوں اور مسجدوں کو اپنا مرکز قرار دے لیا تھا۔ اور کچھ وہ بھی تھے جو باقاعدہ ارکانِ سلطنت میں شامل، دربارِ مملکت سے وابستہ اور حکومت و وقت کے اونچے مناصب پر فائز تھے۔ مقدمہ کتاب میں اختصار کے ساتھ ہم دو چیزوں کی وضاحت کریں گے۔ ایک یہ کہ سوسال کے اس طویل عہد میں جو سلاطین و ملوک اس خطہ ارض میں داؤد حکمرانی دیتے رہے، وہ ان فقہائے عظام اور علمائے کرام سے کیا تعلق خاطر اور قلبی روابط رکھتے تھے اور ان کے دل کی پہنائیوں میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ دوسرے یہ کہ ان شاہانِ ہند کی خود اپنی کتاب حیات کے علمی اور دینی پہلو کس درجہ نمایاں اور نازک تھے۔

سکندر لودھی

اس سلسلے میں کتاب کی دوسری جلد کے مقدمہ میں ہم ہندوستان کے لودھی خاندان کی حکومت کے مؤسس اعلیٰ سلطان بہلول لودھی کے علمی کوائف سے اپنے قارئین کو متعارف کراچکے

فقہائے ہند جلد سوم

ہیں۔ اب اس خاندان کے دوسرے حکمران سلطان سکندر لودھی کے علمی و عملی کارناموں سے آپ کو روشناس کرائیں گے۔ سکندر اپنے عظیم باپ سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد ۸۹۴ھ میں تخت ہند کا وارث بنا۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ بہت سے معرکوں میں شریک رہا۔ بڑا شجاع اور جنگ جو بادشاہ تھا۔ انتظامی صلاحیتوں کا مالک، سیاسی بصیرت کا حامل اور طرز حکمرانی کے جملہ پہلوؤں سے خوب آگاہ تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں مملکت کی حدیں دُور دُور تک پھیل گئی تھیں، دشمن اس کے زورِ بازو سے کانپتے اور اس کی جنگی تدبیروں کا لوہا مانتے تھے۔ اس میں بڑی خوبی یہ تھی کہ علم و علما کا درت اور مذہبی و دینی امور سے کامل دلچسپی رکھتا تھا۔

سکندر کی ماں ایک ہندو سناہ کی بیٹی تھی۔ اس کا نام ہیماں تھا۔ کہتے ہیں، ہیماں بہت خوب رو عورت تھی، بہلول لودھی کی اس پر نظر پڑی تو اس کا گرویدہ ہو گیا اور بالآخر وہ اس کے عقد میں آگئی۔ یہ بھی منقول ہے کہ سکندر کی پیدائش سے قبل ہیماں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ چاند ٹوٹ کر اس کی گود میں آگرا ہے۔ نجومیوں سے اس کی تعبیر پوچھی گئی تو انھوں نے بتایا، اس کے بطن سے ایک لائق اور مہنہار بیٹا پیدا ہوگا جو سلطنت کو چار چاند لگائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بہلول نے سکندر کی تعلیم و تربیت کا خاص طور سے اہتمام کیا، لیکن اس کی تعلیم کے حدود کہاں تک پھیلے ہوئے تھے؟ اس نے کن اساتذہ عصر کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا اور ان سے کن کن علوم کی کون کون کتابیں پڑھیں؟ اس کی وضاحت تاریخ کی کتابوں میں ہمارے نظر سے نہیں گزری۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ آغاز زندگی ہی سے سخت دینی حمیت اور شدید مذہبی عصبیت کا حامل تھا۔ اس کے فکر و عمل پر اسلام کا غلبہ اور شعائر دین کا قبضہ تھا۔

اس کے حالات میں کبھی مرقوم ہے کہ وہ ہندوؤں سے بے حد خصم رکھتا تھا اور اس ضمن میں کسی قسم کی مہانت یا رواداری کا قائل نہ تھا۔ اس قسم کا کوئی مسئلہ اگر سامنے آجائے اور اس میں دو رائے ہوتیں تو وہ عام طور پر درشت رائے کی تائید کرتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اس کے زمانہ شہزادگی میں جب کہ

وہ ایک علاقے کا دالی تھا، اسے اطلاع پہنچی کہ کرکشیتر میں ہندو کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اور وہ اپنے مذہب کے مطابق وہاں تالاب میں اشنان اور مندر میں مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں۔ نیز انھوں نے وہاں کچھ ننگا مہ بھی بپا کر رکھا ہے۔ سکندر نے فوری طور پر علما کا محضر طلب کر کے ان سے مشورہ کیا کہ بغیر کسی تاخیر کے ان ہندوؤں کو قتل اور مندر کو مسما کر دیا جائے۔ اس محضر میں ملک العلماء میاں عبداللہ بھی موجود تھے۔ علمائے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس اہم مسئلے میں فیصلہ کن رائے ان ہی کی ہو سکتی ہے۔ شہزادہ میاں عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ انھوں نے دریافت فرمایا:

کرکشیتر کیا شے ہے؟

جواب ملا۔ ایک تالاب ہے جہاں کفار بطور عبادت ملک کے ہر شہر سے جمع ہو کر آتے اور غسل کرتے ہیں۔ نیز وہاں کے مندر اور بت خانے میں اپنے مذہب کے مطابق فرائض عبادت بجالاتے ہیں۔

فرمایا۔ یہ رسم عبادت کب سے جاری ہے؟

جواب دیا۔ یہ ایک قدیم رسم ہے۔

ملک العلماء نے تفصیلات سے مطلع ہونے کے بعد فتویٰ دیا۔

بت خانہ قدیم راویران ساختن جائز نیست۔

کسی دیرینہ بت خانے کو تباہ کرنا جائز نہیں۔

یہ جواب سکندر کی مرضی کے بالکل خلاف تھا۔ ملک العلماء کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے خنجر پر ہاتھ رکھ کر کہا:

طرف کفار می کنی، اول ترمی زخم بعد آں بر کرکشیتر خواہم ناخت۔

کافروں کی طرف داری کرتا ہے۔ میں پہلے تیرا خاتمہ کروں گا۔ پھر کرکشیتر کو

تباہ کروں گا۔

ملک العلماء کے لینے یہ بہت بڑے امتحان کا وقت تھا۔ انھوں نے نہایت جرات

اور متانت سے جواب دیا:

فقہائے ہند جلد سوم

مرگِ حق است، بغیر حکمِ حق کسے نمیرد، چوں کسے پیش ظالمے می آید اول مردنِ خود را اختیار کردہ می آید، ہرچہ یاد اباد۔ چوں مرا پرسیدید مسئلہ شرع بیان نمود، اگر پروائے شرع نداشتید حاجت پرسیدن نیست۔

موت حق ہے۔ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مڑتا۔ جب کوئی شخص ظالم کے سامنے آتا ہے، پہلے اپنی موت کے لیے تیار ہو کر آتا ہے۔ جو کچھ بھی ہونا ہے ہو جائے۔ جب آپ نے مجھ سے دریافت لیا تو میں نے شریعت کا مسئلہ بیان کر دیا۔ اگر آپ کو شریعت کی پروا نہیں ہے تو پھر پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ صحیح اور جرأت مندانہ جواب سن کر سکندر کا غصہ رفع ہو گیا اور میاں عبداللہ سے کہا:

اگر اجازت می دادید چندیں ہزار با مسلمانان آسودہ می شدند۔
اگر آپ اجازت دے دیتے تو کتنے ہی ہزار مسلمان مطمئن ہو جاتے۔
جب مجلس برخاست ہو گئی تو سکندر نے ملک العلماء سے خاص طور سے خطاب ہو کر کہا:

میاں عبداللہ! شما گاہ با ملاقات فرمائید۔
میاں عبداللہ! آپ گلہ ہے گا ہے ہم سے ملتے رہیں۔

تخت نشینی

بہلول لودھی نے ۸۹۴ھ کو وفات پائی، اس کے بعد سکندر لودھی تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔ تخت نشینی سے پہلے اس نے شیخ سمار الدین کنبوہ کی خدمت میں حاضر فرمایا اور عرض کیا:

یا شیخ! می خواہم کہ در علم صرف کتاب میزان پیش شما بخوانم
یا شیخ! میں علم صرف کی کتاب، میزان آپ سے پڑھنے کا خواہاں ہوں۔

لہ واقعات مشتاقی ص ۱۶

شیخ نے فرمایا: **بداں اسعدك الله في الدارين خيراً**۔^{۱۷}
 سکندر نے یہ کلمہ تین بار شیخ کی زبان سے کہلوا یا اور پھر اسے نیک فال سمجھ کر اور ان
 کے ہاتھ چوم کر کھڑا ہو گیا۔

فرائض و نوافل کا التزام
 تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ سکندر لوہی ارض ہند کا
 نہایت متدین بادشاہ تھا اور فرائض و نوافل کا سختی سے پابند تھا۔ افسانہ شاہان کا
 مصنف لکھتا ہے:

نماز باجماعت ہر پنج وقت می گزار دے و نوافل بسیار می کر دے و نماز تہجد و اشراق
 گا ہے فوت نہ کر دے۔^{۱۸}

پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا، نوافل کثرت سے پڑھتا اور تہجد
 اور اشراق کی نماز کبھی ترک نہ کرتا تھا۔

اس کی نیکی اور شب بیداری کا یہ عالم تھا کہ نماز فجر سے تین گھنٹے قبل بیدار ہو جاتا
 اور غسل کر کے نماز تہجد ادا کرتا۔ بعد ازاں:

سہ سپارہ کلام ربانی دست بستہ خواندے ہے
 قرآن کے تین سپارے ہاتھ باندھ کر اور کھڑا ہو کر تلاوت کرتا۔

غربا و مساکین کی مدد

سکندر متعدد اوصاف کا مالک تھا۔ وہ ریاضا کے سزاوار اور اکیں کا بے حد خیال
 رکھتا تھا۔ قابل امداد لوگوں کی سال میں دو مرتبہ فہرستیں تیار کرتا اور ان کی مدد کرتا تھا۔
 جاڑوں کے موسم میں بھی غربا میں کپڑے تقسیم کرتا اور گرمیوں میں بھی۔ اس نے تقسیم

۱۷ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۶۔

۱۸ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۲۵۴ بحوالہ افسانہ شاہان ورق ۳۸۔

۱۹ تاریخ شاہی ص ۴۹۔

خیرات کے لیے یہ التزام کر رکھنا تھا کہ بعض مقامات کے لوگوں کو پکا ہوا کھانا دیا جاتا۔ کچھ لوگوں کی نقدی اور جنس کی صورت میں مدد کی جاتی اور کچھ مستحقین کو شمشا ہی دیا جاتا تھا۔ اس کے لیے ہر روز، ہر جمعہ اور سال میں دو مرتبہ حسب ضرورت لوگوں کی امداد کی جاتی۔ غریب لڑکیوں کی شادی کے لیے بھی ان کے والدین کو خاص رقم عطا کی جاتی۔ طبقاتِ اکبری کا مصنف نظام الدین بدھشی رقم طراز ہے:

یومیہ و جمعگی و دو مرتبہ انعام در سالے در کل ممالک مخصوص فقرا بود^{ہے} روزانہ اور جمعہ کے دن اور سال میں دو مرتبہ تمام علاقوں کے فقرا میں تقسیم کرنے کے لیے چیزیں مخصوص تھیں۔

سلطان نہ صرف خود مستحقین کی مدد کرتا، بلکہ امرائے سلطنت اور ارکانِ حکومت کو بھی اس کی تلقین کرتا۔ ان میں سے جو شخص جس قدر غربا کی مدد کرتا، اسی قدر سلطان اس کو معزز و محترم گردانتا تھا۔ یعنی اس کے نزدیک پیمانہ قدر و منزلت مستحقین کی امداد تھا۔

رعایا کا یہاں تک خیال رکھنا تھا کہ ایک مرتبہ ملک میں قحط کی وجہ سے غلے کی پیداوار میں کمی واقع ہو گئی تو عشر معاف کر دیا۔ بعد ازاں حالات بدل گئے اور غلے کی قلت دور ہو گئی مگر عشر وصول نہیں کیا۔^{تہ}
طرز بود و باش

دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کا یہ نامور حکمران جو تاریخ میں سکندر لودھی کے نام سے معروف ہے، نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس کا طرز بود و باش شاہانہ جاہ و جلال کا منظر نہ تھا بلکہ اس میں ایک عام آدمی کے اسلوبِ معاشرت کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کا ذکر افسانہ شاہاں کا مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے:

۵۵ طبقاتِ اکبری ج ۱ ص ۳۳۶۔ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۶۔

۵۶ ایضاً

عادت سلطان چنان بود تا آنکہ جامہ پارہ نشدے جامتہ نو پیوشیدے۔ تا آنکہ خواب غلبہ نہ کر دے تخریبی رہے، و نیز تا آنکہ اشتہا غالب نشدے طعام نخوردے۔ سلطان کی عادت تھی کہ جب تک کپڑا پھٹ نہ جاتا، نئے کپڑے نہیں پہنتا تھا، جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو جاتا، سوتا نہیں تھا اور جب تک بھوک غالب نہیں ہو جاتی تھی، کھانا نہیں کھاتا تھا۔

احمد یادگار کی روایت کے مطابق وہ اپنا "جامہ و پلنگ"، ہر روز بدلتا تھا اور یہ جامہ و پلنگ یتیم بچیوں کے جہیز میں دے دیا جاتا تھا۔ مساجد میں ائمہ و خطباء کا تقریر

سکندر لودھی سخت مذہبی جذبات کا حامل بادشاہ تھا۔ مورخین نے اس کے حالات میں اس ضمن کے بہت سے واقعات تحریر کیے ہیں۔ یہ مقام تفصیل کا متحمل نہیں، اس لیے ہم اس کا مختصر سا تذکرہ کر کے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اس کی طرف سے پورے ملک کی مساجد میں قاری، امام، خطیب اور خدام و جباروب کش مقرر تھے، اور ان کے وظائف و مشاہرات کا باقاعدہ انتظام۔ رمضان اور عیدین وغیرہ ایام متبرکہ میں زیادہ سے زیادہ فقرا و مساکین کی مدد کی جاتی تھی۔

سکندر لودھی کے مذہبی اور دینی احساسات بہت نازک تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے، جس زمانے میں سکندر اپنے بھائی باریک شاہ سے برسرِ جنگ تھا، ایک قلندر اس کے سامنے آیا اور سکندر کا ہاتھ پکڑ کر کہا، اس لڑائی میں توفیق پائے گا۔ سکندر نے سختی سے ہاتھ کھینچ لیا اور درشت لہجہ میں کہا:

۷۷ سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات و بحوالہ افسانہ شاہان و ورق ۳۹۔

۷۸ تاریخ شاہی ص ۴۹

۷۹ طبقات اکبری جلد ۱، ص ۳۳۶

ہر گاہ کہ در طائفہ اسلامیہ جنگ باشد حکم بر یک طرف نباید کرد۔ بلکہ باید گفت در آنچه خیریتِ اسلام است آن شود۔ و در فتح ہر کہ صلاحِ خلق باشد از حق باید خواست۔

جب با ہم مسلمانوں کے درمیان سلسلہ جنگ جاری ہو تو ایک فریق کے حق میں فیصلہ نہیں کر دینا چاہیے، بلکہ کہنا چاہیے کہ وہی کچھ ظہور میں آئے، جو اسلام کے لیے بہتر ہو، اور اللہ سے اسی فتح کی خواہش کرنی چاہیے، جس میں خلقِ خدا کی صلاح کا راز مضمر ہو۔

اس کے ان ہی اوصاف کی بنا پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

بالحقیقت حماد زمان سلطنت آن سلطان سعادت نشان از حدّ تقریر و تحریر خارج است۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سلطان سعادت نشان کے عہد کی خوبیاں حدّ تقریر و تحریر سے باہر ہیں۔

شیخ فخر الدین زاہدی سے ملاقات

سکندر لودھی بہار کے سفر پر گیا تو کئی روز وہاں ٹھہرا اور وہاں کے علما و مشائخ سے ملاقات کی۔ بہار کے ایک بزرگ شیخ فخر الدین زاہدی تھے جو اس علاقے کی مشہور شخصیت تھے۔ ان کے مریدوں میں بنگال کے بادشاہ بھی شامل تھے۔ ان کا معمول تھا کہ آنے والوں کو شربت پلاتے تھے۔ قیام بہار کے زمانے میں سکندر بھی ان کی خدمت میں گیا۔ اتفاق سے اس وقت مصری یا چینی موجود نہ تھی۔ ایک خادم نے اشارے سے شیخ کو یہ بات بتائی۔ انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا: ”از

تہ طبقاتِ اکبری ج ۱ ص ۳۳۵۔

لہ اخبار الاخیار، ص ۲۲۷۔

شیرینی چینی خراشیدہ ساختہ بیارید۔ (مٹھائی پر سے چینی کھرچ کر شربت بناؤ اور لے آؤ) بادشاہ اور اس کے رفقاء نے شربت پیا۔ مولانا جمالی بھی بادشاہ کے ساتھ تھے۔ شیخ سے اجازت لے کر باہر آئے تو بادشاہ نے مولانا جمالی سے کہا۔ یہ اپنے دور کے بہت بڑے شیخ ہیں، اس وقت کوئی شیخ نیکی میں ان کی ٹکڑے کا نہیں ہے، لیکن ان میں ایک نقص یہ ہے کہ جاہل ہیں۔ دورانِ گفتگو میں ”من شمارا غبتاً“ یاد می کر دم“ کہا تھا۔ جہالت کی وجہ سے ”غبتاً“ اور ”غیبتاً“ میں فرق نہ کر سکے۔ ”من شمارا غیبتاً“ یاد می کر دم، کہنا چاہیے تھا۔

نماز جمعہ کے لیے مسجد میں حاضری

قیام بہار کے زمانے میں سکندر باقاعدگی سے نماز جمعہ کے لیے مسجد میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک روز اسے آنے میں تاخیر ہو گئی تو میاں بدی حقانی نے، جو بہار کے جلیل القدر عالم تھے اور سکندر ان کی بہت قدر کرتا تھا، معمول سے زیادہ انتظار کیے بغیر جماعت کھڑی کرادی۔ نماز ختم ہو چکی تو بادشاہ پہنچا، مولانا جمالی بھی ساتھ تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ نماز ہو چکی ہے۔ لیکن یوں ہی نمازیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

لے مردماں! بس ایں مقدار تاخیر نباید کرد کہ بادشاہ بیاید۔
لوگو! بادشاہ کے انتظار میں اتنی زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔
میاں بدی حقانی نے مولانا جمالی کو جواب دیا:

من نماز خدائے را گزرا نیدم و گزاردیم۔
ہم کو اللہ کی نماز پڑھنا تھی، وہ پڑھ لی۔

بادشاہ نے مولانا جمالی سے خاموش رہنے کی درخواست کی اور میاں بدی سے مخاطب ہو کر کہا۔

آپ نے بہت اچھا کیا کہ نماز ادا کر لی، کو تا ہی تو میری ہے اللہ

عہد سکندری کے علما

سلطان سکندر لودھی اُوپنچے درجے کے علمی ذوق کا مالک تھا۔ وہ علما کے مباحثوں میں شریک ہوتا اور بحثوں میں خود حصہ لیتا۔ رات کو بھی اس کی مجلس علم گرم رہتی۔ اس کے عہد میں دُور دراز علاقوں اور ملکوں کے بہت سے علما نے جو مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے، دیار ہند میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بسابقہ استدعا و طلب و بعضے بے آں، در عہد دولت او تشریف آورده و توطن این دیار اختیار کردند۔^{۱۳}
دنیا کے مختلف گوشوں اور عرب و عجم سے بعض علما اس کی طلب و دعوت پر اور بعض بلاد دعوت کے اس کے عہد حکومت میں تشریف لائے اور پھر اس ملک میں سکونت پذیر ہو گئے۔

عہد سکندری کے علما میں شیخ سعد اللہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دادا، شیخ رزق اللہ مشتاقی (شیخ عبدالحق دہلوی کے چچا۔ یہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص کرتے تھے) شیخ عبدالوہاب بخاری، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ عبداللہ تلنبی، شیخ عزیز اللہ تلنبی، شیخ اللہ داد جون پوری، میاں خواجگی اور میاں طہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر لائق تذکرہ ہیں۔ شیخ عبداللہ تلنبی دراصل علاقہ ملتان کے ایک قصبہ تلنبہ کے رہنے والے تھے، اور سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی میں جا کر اقامت گزیر ہو گئے تھے، بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔ ان کا سلسلہ درس بڑا وسیع اور انداز تدریس نہایت عمدہ تھا۔ خود بادشاہ اس میں شریک ہوتا، لیکن اس طرح کہ:

در گوشہ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیکم گفتہ، بایک دیگر

صحبت می داشتند ۱۲

جلسہ درس کے ایک گوشہ میں آہستہ سے جا کر بیٹھ جاتا اور درس سے فراغت کے بعد حاضر خدمت ہو کر اسلام علیکم کہتا۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے جو گفتگو ہو جاتے۔

دور سکندری کے ان علمائے کرام کے حالات اپنی اپنی جگہ ہماری اس کتاب میں مرقوم ہیں۔ ان علمائے عالی مقام میں ایک بزرگ میاں ظلہ تھے، جو بہت سے اصنافِ علم پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ بہترین خطاط، بہت بڑے نقاش، علمِ فرائض میں ماہر اور علمِ موسیقی میں کامل تھے۔

مسلمانوں کے علاوہ حصولِ علم کے لیے ہندو بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے سکندران کی بہت قدر کرتا تھا اور کہا کرتا تھا۔ ”ہزار آدمی بیک ذات میاں ظلہ است“ (میاں ظلہ کی ایک ذات میں ہزار آدمیوں کی قابلیت جمع ہے)

میاں ظلہ کی رسائی عقل اور دست ہنرمند کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک ایسا موتی اپنے ہاتھ سے بنا کر سلطان کو پیش کیا کہ جو ہری بھی اس کی شناخت سے قاصر رہے تھے۔ علمِ کیمیا اور سیمیا میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لیے کاغذ سے ایک ”کلاہِ علاج“ تیار کیا تھا۔ ایک عجیب و غریب کرن پھول بنایا جو سر کی حرکت کے ساتھ کبھی پھول بن جاتا تھا، کبھی غنچہ ۱۵

اسی عہد کے ایک اور عالم دین سید رفیع الدین صفوی کا اسم گرامی بھی تذکرہ میں مذکور ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے حالات تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے معقولات کی تحصیل شیخ جلال الدین مجددوانی سے اور علوم حدیث کی شیخ شمس الدین

۱۲ منتخب التواریخ ص ۳۲۲

۱۵ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (حاشیہ ص ۴۵۵، ۴۶۰) بحوالہ تاریخ داؤدی ص ۵۶

سخاوی مصری سے کہتی ہے۔ سپہ سالارین شرفین میں مقیم تھے۔ پھر دہلی آگئے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث ان کے ہاں سے میں لکھتے ہیں :

سلطان سکندر را در حق او اعتقاد عظیم پیدا شد ۱۶

سلطان سکندر لودھی کو ان کی ذات سے بہت عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔

بعد کو انھوں نے سلطان سے اجازت لے کر آگرہ کو اپنا مسکن ٹھہرایا تھا۔

معدن الشفا یا طب سکندری

سکندر لودھی کے زمانے کے ایک بزرگ میاں بہوہ تھے، جو علم و فضل اور خطاطی

حکمت میں عظیم المثال تھے۔ امرائے سکندری میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی

اور سکندران کی بہت قدر کرتا تھا۔ انھوں نے بادشاہ کے مشورے سے معدن الشفا

کے نام سے علم طب کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جس میں ایک ہزار ایک

سکوسات، امراض اور ان کے لیے مناسب ادویہ اور علاج کا ذکر ہے۔ برصغیر پاک و

ہند میں اسلامی طب کی قدیم ترین و ارتقا میں اس کتاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

یہ کتاب "طب سکندری" کے نام سے معروف ہے اور حلقہ اہل علم میں متداول و

متعارف ہے۔

آگرہ شہر کی تعمیر

سکندر لودھی کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور

اسے اپنا دار الخلافہ بنایا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اٹاواہ، چندیری اور گوالیار

کے راجپوت ہندو راجے اس کے سخت مخالف تھے اور وہ ان سے پریشان رہتا

تھا۔ اس کا بیشتر وقت ان سے معرکہ آرائی میں گزرا۔ وسطی ہند میں آگرہ شہر

کی بنیاد رکھنے اور اسے دار الخلافہ بنانے کا بنیادی مقصد ہندو راجاؤں کا زور توڑنا

اور ان علاقوں میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا اور اس

میں وہ کامیاب رہا۔

مذہبی تعصب یا اسلامی غیرت

سلطان سکندر لودھی کے مذہبی تعصب کا مورخین نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ خود مسلمان مورخ بھی کھلے لفظوں میں اس کو متعصب گردانتے اور واضح طور سے لکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں حدِ افراط کو پہنچ گیا تھا۔ نظام الدین بدخشی کے الفاظ ہیں :

تعصبِ اسلام بمرتبہ داشتے کہ درین باب بسر حدِ افراط رسانیدہ بود۔^{۱۷}

اسلامی معاملات میں وہ یہاں تک تعصب رکھتا تھا کہ سرحدِ افراط کو پہنچ

گیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے کے ہندوستان میں اس قسم کی مختلف تحریکیں ابھر آئی تھیں جو اسلام اور ہندو مذہب کو باہم خلط ملط کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ مثلاً بھگتی تحریک، وحدت الوجود کا تصور، مسلمان صوفیا اور ہندو جوگیوں کا اتحاد صوفیا کے جذب و شکر وغیرہ کی مختلف منزلیں اور وحدت ادیان وغیرہ وغیرہ۔ یہ مختلف گروہ تھے جو ہندو مذہب اور اسلام کو باہم ملانے یا ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے سعی تھے۔ اس کا اندازہ مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی اس عبارت سے آسانی ہو سکتا ہے :

ایں چہ شور و این چہ غوغا کشادہ ————— کسے مومن، کسے کافر، کسے مطیع، کسے عاصی، کسے در راہ، کسے بے راہ، کسے مسلم، کسے پارسا، کسے ملحد، کسے تریسا، ہمہ در یک سلک است^{۱۸}

یہ کیا شور اور ہنگامہ بپا کر دیا گیا ہے، کوئی مومن ہے، کوئی کافر، کوئی اطاعت گزار ہے

۱۷ طبقاتِ اکبری ج ۱ ص ۳۳۵

۱۸ مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی ص ۲۰۵

فقہائے ہند جلد سوم

کوئی گنہ گار، کوئی صحیح راہ پر گامزن ہے اور کوئی بے راہ، کوئی مسلم ہے کوئی پارسا، کوئی لہو ہے کوئی ترسا۔ اصل بات یہ ہے کہ سب ایک ہی سلک میں منسلک ہیں۔

سکندر لودھی کے ہاتھوں بدھن برہمن کا قتل درحقیقت اسی بنا پر ہوا تھا کہ وہ اسلام اور ہندو مذہب میں امتیاز کا قائل نہ تھا اور اس نے اعلان کیا تھا: اسلام حق است و دین من نیز درست است۔^{۱۹}

اسلام حق ہے اور میرا دین بھی صحیح ہے۔

یہ وہی بدھن برہمن ہے، جس کے قتل میں سکندر لودھی کو بہت بدنام کیا

گیا ہے۔

پھر ہندوؤں میں بعض ایسی جماعتیں معرض وجود میں آگئی تھیں، جو ہندومت کی تبلیغ کے لیے سرگرم عمل تھیں اور ان کا دائرہ عمل نہ صرف دونوں مذہبوں کو متحد کرنے اور ان میں یگانگت کی راہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھا بلکہ یہ مسلمانوں کو حلقہ اسلام سے نکال کر دائرہ ہندومت میں داخل کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں اور مسلمانوں کو علی الاعلان مرتد بنانے کے درپے تھیں۔ ان تحریکوں کا رخ صرف جاہل عوام کی طرف ہی نہ تھا بلکہ بڑے بڑے امرا اور سرکردہ مسلمان بھی ان سے متاثر ہو کر الحاد و زندقہ کی دادی میں قدم زن ہو گئے تھے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر انھوں نے مسلمان خواتین تک کو قص و مسرود کی تعلیم کے لیے جو ہندوؤں کا مذہبی شعار تھا، ہندوؤں کے حوالے کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان امرا میں کالپی کے ضابط نصیر خاں اور لکھنوتی کے حاکم احمد خاں لودھی کے نام خاص طور سے کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ نصیر خاں کے بارے میں طبقات اکبری کا مصنف لکھتا ہے:

او از جادہ مستقیم شریعت تافتنہ، راہ الحاد و زندقہ پیش گرفتہ، و ترک نماز و روزہ دادہ، و زنان مسلمہ را بنا تکاں ہند و سپردہ تار قاضی تعلیم نمایندہ۔^{۲۰}

اس نے شریعت کے جادو مستقیم سے منہ موڑ لیا اور الحاد و زندقیت کی راہ اختیار کر لی۔ نماز روزہ ترک کر دیا اور مسلمان عورتوں کو رقصی سیکھنے کے لیے ہندو نائکوں کے سپرد کر دیا۔

یہی مصنف احمد خاں لودھی کے ارتداد کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :

خبر رسید کہ احمد خاں پسر مبارک خاں لودھی کہ حاکم لکھنوتی بود، بمصاحبت کفار طریقاً ارتداد پیش گرفتہ از دین اسلام برگشتہ است ۱۱۵

اطلاع ملی کہ احمد خاں پسر مبارک خاں لودھی نے جو لکھنوتی کا حاکم تھا، کفار کی صحبت کے اثر سے ارتداد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور دین اسلام سے برگشتہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے نامور محقق جناب خلیق احمد نظامی افسانہ شاہان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ علاقہ بہار کے ایک شخص کے پورے قبیلے کو ایک ہندو راجہ نے قتل کر دیا تھا۔ اس نے سکندر لودھی کو بتایا :

اولاً مسلمان بودیم، عثمانی، الحال زنا دار شدہ ام ۱۱۶

پہلے ہم مسلمان تھے اور عثمانی (نسل سے تھے) اب میں زنا دار ہو گیا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندو اس سلسلے میں بڑے جری ہو گئے تھے، ان کے قدم اس میدان میں بہت آگے بڑھ گئے تھے اور ان کی مناعی ارتداد نے جارحیت کی شکل اختیار کر لی تھی۔

شیخ رکن الدین گنگوہی لطائف قدوسی میں فرماتے ہیں :

و طرف ہندوستان غلبہ کافراں بود، در پرگنہ ردولی عمل کافراں شد، شعائر اسلام مندرس شدند، در بازار گوشت خوگ فروختہ می شد، حضرت قطبی دل گیر شدہ بیرمن آمدند ۱۱۷

۱۱۵ طبقات اکبری ص ۳۳۱۔

۱۱۶ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۲۵۰ بحوالہ افسانہ شاہان ورق ۲۹۔

۱۱۷ لطائف قدوسی ص ۳۱

اطراف ہندوستان میں کافروں کا غلبہ تھا۔ قصبہ ردولی میں کفار کا عمل دخل ہو گیا تھا۔ شعراء اسلام مط گئے تھے۔ بازار میں سوراگ کوشت فروخت ہونے لگا تھا، جس سے دل برداشتہ ہو کر حضرت قطبی (شیخ عبدالقدوس گنگوہی) باہر نکل آئے تھے۔ ان حالات میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ سکندر لودھی جیسا مسلمان اور پابند شریعت بادشاہ خاموش رہتا اور اسلامی رسوم و عوائد کے تحفظ کے لیے کوئی کوشش نہ کرتا۔ کہا جاتا ہے، چون کہ وہ ہندو ماں کا بیٹا تھا اور بعض لوگ اسے ”کم اصل“ ہونے کا طعن بھی دیتے تھے، لہذا اس نے اپنا یہ طعن دور کرنے اور خود کو یکساں ثابت کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ ان حالات کو سامنے رکھیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت اسلامی اور غیرت دینی اسلام اور مسلمانوں کی بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے ان کانٹوں کو دور کرنے کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسلام کی صراطِ مستقیم میں جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کے قلبِ ذہن میں چھپنے اور انھیں تکلیف پہنچاتے تھے۔ وہ تو مسلمان بادشاہ اور اسلام کا سپاہی تھا۔ اگر کوئی کم حیثیت آدمی بھی اسلام کی حفاظت کرے تو یہ نہ صرف قابلِ طعن و ملامت ہے بلکہ ضروری ہے اور اس کے فرائض میں داخل ہے جس شخص کی بھی اس دور کے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت پر نظر ہے، وہ سکندر کو متعصب یا حدِ اعتدال سے متجاوز نہیں ٹھہرا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے بدھوں برہمنوں کو ناحق قتل کیا۔ لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے اس سلسلے میں علمائے عصر کو باقاعدہ جمع کر کے ان سے رائے لی تھی جن میں اس دور کے تقریباً تمام بڑے بڑے مشاہیر اہل علم اور اصحابِ فکر شامل تھے۔ مثلاً لکھنوتی کے قاضی پیارہ اور شیخ بدھ، دہلی کے میاں قاون بن شیخ خوجو، میاں عبداللہ بن اللہ داؤد تلبی اور سید محمد بن سعید خاں، فنوج کے سید حسن، سیدامان اور میراں، سیکنی کے سید صدر الدین قنوجی اور میاں عبدالرحمن، سرہند کے ملا قطب الدین، ملا اصلح اور ملا اللہ اور سنہصل کے مولانا عزیز اللہ اس مجلس میں شریک تھے اور ان کو خاص طور پر صرف

اسی مسئلے پر گفتگو کے لیے بلایا گیا تھا، اور بدھن برہمن کو ان کے متفقہ فتویٰ کے مطابق قتل کیا گیا تھا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھن برہمن کا معاملہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا اور شخص اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں بہت دُور تک چلا گیا تھا۔ اسی لیے بادشاہ ملک کے مختلف گوشوں سے علما کو طلب کرنے پر مجبور ہوا اور پھر مسئلہ زیر بحث کے تمام پہلوؤں پر پورے غور و خوض کے بعد اس کے قتل کا فتویٰ جاری کیا گیا۔

خلاف شرع رسوم کا خاتمہ

سکندر لودھی کے زمانے میں بہت سی غلط اور غیر شرع رسوم و عوائد ملک میں رائج تھیں، اس نے ان سب کو سختی کے ساتھ ختم کیا۔ ان میں بعض رسمیں مذہب کے رنگ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں۔ اس نیک اطوار بادشاہ نے ان کے مرتکبوں کے خلاف تعزیری کارروائیاں کیں۔ مثلاً سپید سالار مسعود کے نیزے جو ہر سال نکلتے تھے، اس نے تمام ملک میں بند کرا دیے۔ فیروز شاہ نے عورتوں کو قبروں پر جانے سے روک دیا تھا، لیکن اس کے بعد یہ رسم پھر جاری ہو گئی تھی، سکندر نے اس پر بھی پابندی لگا دی، علاوہ ازیں بہت سی جعلی قبریں وجود میں آ گئی تھیں، انھیں سمار کرا دیا، چیچک کی دیوی سینٹلا کی پرستش کو سختی سے روکا۔ ۵۲۵ء مذہب سے اس شدید لگاؤ اور خدمت دین کے اس گہرے جذبے کے باوجود بادشاہ شراب نوشی کا عادی اور گانے کا شوقین تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شراب نوشی ایک خفیہ مرض کی وجہ سے کرتا تھا، جو درحقیقت اس کا علاج تھا۔

ذوقِ شعری

سکندر لودھی ذوقِ شعری بھی رکھتا تھا اور بہت اچھا شاعر تھا۔ گلرخی تخلص کرتا

۵۲۲ء طبقاتِ اکبری ص ۳۲۲، ۳۲۳

۵۲۵ء سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۲۶۶ بحوالہ تاریخِ داکنی۔

تھا۔ عبدالقادر بدایونی نے اس کی ایک غزل کے پیشتر نقل کیے ہیں:

سروی کہ سمن پیرہن و گل بدستش روحیست مجسم کہ دران پیرہنتش
مشک ختن چسیت کہ صد مملکت چین در حلقہ آن زلف تلمن در مسکننتش
گلخچ چہ کند جوہر دندان ترا وصف ہیمو در سیراب سخن درد ہنتش
در سوز مرزگان بکشم رشتہ جاں تا چاک بدزم کہ دران پیرہنتش

اس کے ایک مصاحب کا نام مولانا جلال تھا۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ ابتدا میں جلالی تخلص کرتے تھے۔ بعد کو جمالی کا تخلص اختیار کر لیا تھا۔ سکندر اور جمالی کے تعلقات انتہائی گہرے اور دوستانہ تھے۔ ایک مرتبہ جمالی کسی مجالس میں سکندر سے خفا ہو کر خراسان کی طرف نکل گئے تھے اور دس سال سے زائد عرصہ تک عراق، عرب، عجم، روم، مصر، شام، ہندوستان اور آراہ النہر کے شہروں میں گھومتے رہے تھے۔ پھر وہاں پہنچے۔ سکندر ان دنوں بدایوں میں تھا۔ وہاں سے جمالی کے نام ایک منظوم خط لکھ کر بھیجا۔ اس خط میں منشی مہر و ماہ بھی ان سے طلب کی گئی تھی۔ وہ خط درج ذیل ہے:

اے مخزن گنج لایزالی اے ساکب راہ دیں جمالی
درد گرد جہاں بسے زدہ سیر درد منزل خود رسیدہ بالخیر
بودی تو مسافر زمانہ الحمد کہ آمدی بسخانہ
لے شیخ مہر بس بسزودی بسیار مسافرت نبودی
بکشائے بسوئے درگم گام تا در یابی ز گلہ خنی کام !
چشم بجمال تو طیان است دل مرغ مثال در فغان است
من سکندر تو حقیر مانی آں بہ کہ بسوئے ما بیانی
باید کہ کتاب مہر و ماہم ارسال دہد چناں کہ خواہم
از مہر کشد و دیدہ را نور آں نہ نشود ز دیدہ ام دود

بعض تذکروں میں یہ دو شعر بھی اس خط میں مندرج ہیں:

درد مکہ و مدینہ گشتی گو مہر بودی خنزینہ گشتی

ور شیخ زردستان نشد سیر تشریف نمود نش کشد ویر
 بادشاہ نے شیخ سہار الدین گنبوہ کو بھی تخریر کیا کہ جمالی کو فوری طور پر اس کے پاس
 بدایون بھیجا جائے۔ چنانچہ شیخ نے جمالی کو مجبور کر کے بادشاہ کے پاس بھیجا اور ان سے
 کہا کہ فقرا کو بادشاہوں کی مجالس میں جانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے، ان کے ذریعے
 سے بہت سے مساکین اور مستحقین کے مسائل حل ہو جاتے اور ان کی تکلیفیں رفع
 ہو جاتی ہیں۔

اس موقع پر مولانا جمالی اور مولانا جامی کی ملاقات اور ان کے تعلقات کا ذکر
 بھی لکھنی کا باعث ہوگا۔ مولانا جمالی جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے،
 دربار سکندری کے نامور ادیب اور شاعر تھے۔ دہلی کے باشندے تھے۔ گنبوہ برادری
 سے تعلق رکھتے تھے، بچپن میں یتیم ہو گئے تھے مگر بڑے ذہین اور طباع تھے ذاتی
 محنت و کوشش سے تعلیم و تربیت کی اونچی منزلوں پر فائز ہو گئے تھے جس کا نتیجہ
 ہوا کہ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ”بیگانہ روزگار و مجمع اطوار“ ہوئے۔ لفظ
 ان کا ذکر ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی کیا ہے۔ کلمہ درویش نش اور فقیر وضع تھے۔
 اثنائے سفر میں ہرات پہنچے تو مولانا جامی سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات میں
 تو جامی ان سے متعارف ہونے کے بجائے سخت خفا ہوئے۔ بعد کو جب ان کے
 جوہر فکری جامی کے سامنے کھلے تو دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد
 نے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے:

بزرگوں سے سنا ہے کہ پہلی ملاقات میں مولانا جامی نے اپنا حال کچھ ظاہر
 نہ کیا اور پاس جابٹھے۔ تن برہنہ، فقط لنگ باندھے تھے۔ فقیرانہ حالت تھی۔ جامی
 نے کہا۔ ”میان تو وخر چند فرق است“ انھوں نے بالشت بیچ میں رکھ دی۔ لفظ

www.KitaboSunnat.com

۲۶ اخبار الاخیار، ص ۲۲۷ - ۲۲۸ منتخب التواریخ، ص ۳۲۶ -

۲۸ منقول ہے کہ جمالی جب اس مہینت کدائی کے ساتھ جس کا ذکر آزاد نے کیا ہے،

جامی نے تحمل کیا اور کہا ”کیستی“؟ جمالی نے جواب دیا۔ ”از خاکسارانِ ہند، ان کا کلام جامی تک پہنچ چکا تھا۔ پوچھا۔ ”از سخنانِ جمالی چیزے یاد داری؟“ جواب میں یہ شعر پڑھے :

دوسہ گز کے بویا پوٹکے درکے پُر در در دو سنکے

لنگکے زیر و ننگکے بالا نے غم دُرد و نے غم کالا

ایں قدر بس بود جمالی را عاشقِ زند و لا ابالی را

جامی بولے ”طبع شعر داری“؟ یعنی کچھ کہتے ہو؟ جمالی نے جواب میں یہ شعر پڑھا

مارا از خاکِ کویت، پیرِ تخی است بر تن

آں ہم ز آبِ دیدہ، صد چاک تا بدامن

یہ کہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بدن پر تمام گرد پڑی تھی۔ سینہ پر جو آنسو پڑے، گرد چاک چاک ہو گئی۔ جامی سمجھ گئے۔ اٹھ کر گلے ملے اور تعظیم و تواضع سے پیش آئے۔

یہ شعر بھی جمالی کی ایک غزل کے ہیں اور بڑے وجد آفرین ہیں :

طال شومنی الی منازلکم ایہا الغائبون عن نظری

روز و شب مولسم خیالِ شماست فاسئلوا عن خیالکھ خبری

شیخ جمالی دُور سکندری کے مشہور ادیب و شاعر اور نیک طبیعت بزرگ تھے۔ انھوں نے سیر العارفین کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی، جس کو بزرگانِ دین کے تذکرہ کی حیثیت حاصل ہے۔ بقول بدایونی کے۔ یہ کتاب اگرچہ منزه از انتقام

جامی کی مجلس میں بغیر کسی تعارف یا تمہید کے سیدھے اندر شاعر کے پہلو میں جا بیٹھے تو جامی نے بگڑ کر پوچھا۔ ”میان شما و خرچہ قدر تفاوت است“ اس وقت ان میں اور جامی میں ایک بالشت کا

فرق تھا۔ انھوں نے جواب دیا۔ ”یک وجہ“۔ (آب کوثر حاشیہ ص ۴۶۱)

۴۵۹ دربارِ اکبری، بحوالہ آب کوثر ص ۴۶۱۔

واعلاظ نسیب، تاہم اس موضوع سے متعلق یہ کتب حوالہ میں سے ہے۔ مطبع رضوی دہلی میں ۱۳۱۱ھ کو طبع ہوئی۔ ۱۸۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

وفات

مؤرخین نے سلطان سکندر لودھی کی بہت تعریف کی ہے اور اس کی نیکی خدا ترسی اور رعایا پروری کے مختلف واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اس کے بعض واقعات و شہادت تو اس نوعیت کے ہیں کہ لوگ ان کو اس کی "گرامت" قرار دیتے تھے شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں:

واذوے نیز در باب فراست بلکہ کرامت حکایات نقل می کنند نیز

یعنی اس کی فراست بلکہ کرامت کی بہت سی حکایات لوگ نقل کرتے ہیں۔

رزق اللہ مشاقتی کا کہنا ہے کہ دارطھی منڈٹنے کے علاوہ اس میں کوئی عیب نہ تھا:

دوام اعمال و افعال او جائے انگشت نہ، الا کہ ریش مے تلماشید۔

اس کے اعمال و افعال میں کبھی بھی انگلی رکھنے کی گنجائش نہ تھی مگر یہ کہ دارطھی منڈٹاتا تھا۔

سکندر خنقاہ کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا، اس کا علاج کرایا گیا مگر تکلیف روز بروز

بڑھتی چلی گئی۔ دوران تکلیف میں بادشاہ نے ایک دن اپنے امام شیخ لاڈن کو بلا کر

حکم دیا کہ نماز، روزہ، دارطھی منڈٹانے، شراب نوشی کرنے اور (غلام اور لونڈیوں کے)

کان و ناک کاٹنے، کے کفارہ کی رقم کا تعین کر کے مجھے بتاؤ۔ پھر کہا:

خزانہ از بیت المال علیحدہ است ازاں بعلماء و صلحاء رساند۔

کہ خزانے سے جو بیت المال سے الگ ہے، یہ رقم علماء و صلحاء کی خدمت میں پیش

کر دی جائے۔

ارض ہند کے اس خدام اسلام بادشاہ نے اٹھائیس سال پانچ ماہ تک بڑے

شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی اور ۱ ذی القعدہ ۹۲۳ھ کو دارالسلطنت

فقہائے ہند جلد سوم

اگرہ میں مرض خناق میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

مولانا جمالی جو طویل سیر و سیاحت کے بعد سکندر کے دربار میں واپس آگئے تھے اور مستقل طور پر دوبارہ اس کی مصاحبت اختیار کر لی تھی، بادشاہ کی وفات سے نہایت مغموم ہوئے اور ایک دردناک مرثیہ کہا۔ اس مرثیے کے چند شعر یہ ہیں:

خلق حیران و پریشانست شہنشاہ چہ شد	بہم برسینہ زنان دست کہ اللہ چہ شد
مہر در آتش غم سوخت، شفق خوں بارید	انجم از چرخ فرویخت کہ آں ماہ چہ شد
ظلمت آباد شد آفاق ز شام غم او	یارب آں طلعت خورشید سحر گاہ چہ شد
خون گرہ شد بگلو ز آہ دم شد مسدود	در غم آنکہ مرا ہمدم و ہمراہ چہ شد
ویک آں فرحت و آں ہجرت و آں حال چہ شد	اوخ آں دولت و آں مسد و آں گاہ چہ شد
نیک خواہان وے آں لحظہ اجل خواہ شدند	کاں خدادان خدا بین و خدا خواہ چہ شد

ہاتھم گفت پندار کہ او در خاک است
قدش بہمچو پیمبر بسر افلاک است

ابراہیم لودھی

سکندر کے بعد اس کے بیٹے ابراہیم لودھی نے باپ کی جگہ لی۔ اس کی زندگی کے وہ پہلو جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے اس کے مذہبی و دینی افکار کی کوئی جھلک قارئین کے سامنے آ سکتی ہے، پردہ مخفا میں ہیں۔ بہت سے امرا و رؤسا اور علما و زعماء کو جو سکندر کے زمانے میں بے حد اعزاز و اکرام کے مالک تھے، ابراہیم کے عہد میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا اور ان سبے ذیل کن سلوک ردا رکھا گیا۔

مولانا جمالی کے بارے میں بھی اس کے دل میں کدورت پیدا ہو گئی تھی انھوں نے سکندر لودھی کی وفات پر جو مرثیہ کہا تھا، اس کا ایک شعر یہ تھا:

اے سلیمانِ زماں آہ کجائیِ آخر
تا کتم پیش تو از رفتنہ دیواں فریاد

ابراہیم کے ایک مصاحب فرید نے سلطان سے یہ کہہ دیا کہ اس شعر میں جمالی نے تم کو اور تمام افغانوں کو ”دبو“ سے تعبیر کیا ہے۔ پس اس نے یہ بات دل میں بٹھالی۔
جمالی خود لکھتے ہیں :

وآں فرید مذکور اس بیت را در میان انداخت و سلطان ابراہیم را بافغانان
دیگرہ باز نمائید کہ شیخ جمالی شمارا دیوگفتہ است، چنانچہ سلطان را بافغان دیگرہ بلی
از من مکر ساخت لیکہ

بہر حال امرائے سلطنت سے اس تکدرا اور ذہنی بخشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ لودھی
خاندان کی حکومت میں ضعف و نقاہت کے آثار پیدا ہو گئے اور اس کا تختِ حکومت
تیزی سے ڈولنے لگا۔ خود لودھی خاندان کے بعض امرائے جن میں دولت خان
لودھی پیش پیش تھا، اس کے خلاف مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے خان
خانان کو ظہیر الدین بابر کے پاس کابل بھیجا تاکہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے ابراہیم
لودھی کی حکومت کا خاتمہ کر دے اور اس ملک پر خود قابض ہو جائے۔ مختلف امرائے
درمیان کچھ عرصہ تک بابر کی مراسلت جاری رہی، بالآخر اس نے ہندوستان پر حملہ کرنا
اور پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی اور بابر کی فوجوں کے درمیان گھمسان کارن
پڑا اور جمادی الاخریٰ ۹۳۲ھ کو ابراہیم لودھی کی فوج کو بابر کے ہاتھوں ذلت آمیز
شکست ہوئی اور خود ابراہیم قتل کر دیا گیا۔

سلطان ہند ابراہیم لودھی کی نعش خاک و خون میں لٹ پٹ پڑی پانی پت
کے میدان میں انقلابِ دُوراء کا مرقعہ پڑ رہی تھی۔ اتنے میں جمالی نے آگے بڑھ کر بابر
کو مبارک باد دی اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھے :

زافغان فغان برآمدآن دم کہ شدت
از صدرتہ سمدت ہر فیل کوہ پیسکر
اشباح را خرب ارواح را محصل
در خاک و خون فرو شد ہچون حمار در گل

فقہائے ہند حصہ سوم

در حلقہ سپاہیت کا مدعو و پیرا نخواستہ چون لفظ زیر سرخی دہشتم گشتہ داخل
لیکن اس موقع پر خود بابر کی حالت دگر گوں تھی اور وہ اس ہیبت ناک و عبرت خیز
منظر کو دیکھ کر لرز رہا تھا، اس نے خود ابراہیم لودھی کا سر زمین سے اٹھایا اور حرمِ ترا
کے ساتھ دفن کیا۔

دراں حال عبرت بخش بر خود لرزید، سر ادا ز خاک برگرفت ^{۳۲}
اس عبرت ناک منظر سے خود (بابر) لرز گیا اور اس کا سر خاک میں سے اٹھایا۔
ابراہیم لودھی نے ہندوستان پر نو سال حکومت کی۔ اس کی موت کے ساتھ
ہی ارض ہند میں لودھی خاندان کے چھتر سالہ دورِ حکومت کی بساط ہمیشہ کے لیے
اُٹ گئی۔ رہے نام اللہ کا۔!

بابر

اب ہندوستان کی تاریخ ایک اور ورق الشقی ہے اور یہ ملک نو دھی خاندان
کے قبضے سے نکل کر مغلیہ خاندان کے زیرِ نگیں آجاتا ہے۔ اس خانوادہ کا پہلا حکمران
جس نے باقاعدہ حکومت ہند کی زمام ہاتھ میں لی، بابر ہے۔ اس کا شجرہ نسب یہ
ہے۔ بابر بن عمر بن ابوسعید بن میران شاہ بن تیمور۔ بابر کا باپ شیخ عمر حنفی المذہب
اور خوش عقیدہ آدمی تھا۔ پانچوں وقت کا نمازی تھا۔ اس کا زیادہ وقت قرآن شریف
کی تلاوت میں صرف ہوتا تھا۔ خواجہ عبید اللہ احرار کا مرید تھا اور تاریخ کی کتابوں
کا دلچسپی سے مطالعہ کرتا تھا۔ ^{۳۳}

بابر کے نانا کا نام پولس خاں تھا۔ وہ مولانا شرف الدین بیزوی کے صحبت یافتہ،
علماء و فضلا کی مجالسِ علمیہ میں بیٹھنے والے اور نیک سیرت بزرگ تھے۔ قرآن مجید

۳۳ تاریخ شاہی ص ۹۸۔

۳۳ ترک مار

کی تلاوت سوز اور قرأت سے کرتے تھے۔ یعنی بابر ماں اور باپ دونوں طرف سے علمی گھرانے کا فرد تھا۔ ان دونوں گھرانوں کو بزرگان دین سے ہمیشہ قلبی اور روحانی تعلق رہا۔ اس کا نام ظہیر الدین بابر اس دور کے مشہور بزرگ خواجہ عبداللہ احرار نے رکھا تھا۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم

بابر کی تاریخ ولادت ۶ محرم ۸۸۸ھ ہے، اس نے ابتدائی تعلیم شیخ فرید بیگ، بابا علی خدائی بیروی بیگ اور خواجہ مولانا قاضی عبداللہ سے پائی۔ وہ اپنے ترک میں اپنے ان اساتذہ کی بہت تعریف کرتا ہے۔ علمائے ہند سے وہ مولانا عبدالرحمان جامی، ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد کے ایک بزرگ شیخ الاسلام سیف الدین احمد، علم کلام کے ماہر ملا حسن، میر جمال الدین محدث، عربی ادب کے استاذ میر عطار اللہ مشہدی اور نامور فقیہ قاضی اختیار کابلے حد ملاح ہے اور ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کرتا ہے۔

تخت نشینی

بابر بارہ برس کی عمر میں ۱۵ رمضان ۸۹۹ھ کو فرغانہ کا بادشاہ ہوا۔ بڑا باہمت اور انتہائی مستقل مزاج حکمران تھا۔ اس کی زندگی جنگ و قتال اور حرب ضرب کی ایک طویل داستان ہے۔ حریفوں سے کش مکش کے نتیجے میں اس کو اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا۔ پھر حالات نے کچھ ایسی کر ڈالی کہ کابل میں حکومت قائم کر لی۔ اسی اثنا میں ابراہیم لودھی کے کسی بااثر امرانے جو اس کے سلوک سے نالاں تھے، باہر سے مرسلت کی اور بعض لوگ خود کابل بھی اس کے پاس پہنچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۳۰ھ میں بابر نے ہندوستان کی طرف کوچ کیا اور مختلف واقعات و مناظر سے گزرنا اور حالات کے نشیب و فراز کا مقابلہ کرتا ہوا پانی پت کے میدان میں آڑ کا۔ اب پانی پت سے چھ کوس کے فاصلے پر پابرا اور ابراہیم لودھی کی فوجیں ایک دوسرے کے قریب پڑاؤ ڈالے بیٹھی تھیں۔ بابر کے فوجیوں نے ابراہیم کے لشکر پر شب خون

مارنا شروع کیا۔ بالآخر ماہ رجب ۹۳۲ھ میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر انہیں اور لڑائی کے لیے صف آرا ہوئیں۔ ابراہیم لودھی کی فوج ایک لاکھ سو اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ اُدھر بابر کے لشکر میں صرف پندرہ ہزار سو اور پیارے تھے۔ لڑائی کا آغاز ہوتے ہی صورت حال انتہائی ہولناک ہو گئی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ الم ناک کی انتہا اس وقت ہوئی، جب شاہ ہند ابراہیم لودھی کا سرفلم کر دیا گیا۔ جنگ کی ہولناکی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملکہ عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ لکھتے ہیں، اس جنگ کو ختم ہوتے دو قرن (۷۵ سال) گزر گئے، لیکن اب تک رات کو اس میدان سے بدستور وہ ستارے، بکش اور بزن کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

۹۹۷ھ میں خود مصنف منتخب التواریخ صبح کے وقت لاہور سے فتح پور کی طرف جا رہا تھا، اس میدان سے گزرا تو یہی ہولناکی آوازیں کان میں آئیں۔ جو لوگ ہمراہ تھے، وہ سمجھے کہ شاید دشمن آگئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو سنا تھا وہ خود دیکھا۔ خدا کی قدرت خدا کے حوالے کر کے ہم سب آگے بڑھ گئے۔ اس فتح کے بعد بابر اسی روز دہلی گیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھا یا شہزادہ ہمایوں اور دوسرے بڑے امرا کو آگرہ کی طرف جانے کا حکم ہوا۔ ابراہیم کا بہت بڑا خزانہ تھا، جو بابر کے ہاتھ آیا اور سپاہیوں میں تقسیم کیا گیا۔

تخت ہندوستان جو اب تک بے شمار بادشاہوں کی داد و پیش کا نظارہ کر چکا تھا، ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی کے قبضے میں آیا۔ لیکن یہ صرف تخت ہندوستان تھا، پورا ملک ہندوستان اس کے قبضے میں ابھی نہ آیا تھا۔ مختلف راجے اور بہت سے حکمران اس وسیع ملک میں موجود تھے، ان کے ساتھ بابر کی لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور رانا سنگا کے ساتھ اس کی لڑائی کو تو خالص جہاد کا درجہ حاصل

تھا اور اس کا مقصد محض اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ یہ لڑائی ۳۳ھ میں ہوئی، اس میں راجپوت، ہندوستان کے راجے اور بابر کے حریف لودھی امراسب شامل تھے۔ ان کی فوج پونے دو لاکھ کے قریب تھی جو بابر کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح کھڑی تھی۔ بابر نے اس موقع پر جہاد کا نعرہ بلند کیا، اللہ سے فتح کی دعا مانگی اور شراب نوشی اور ریش تراشی ترک کی اور میدان غز میں کود پڑا، اللہ نے اسے فتح سے نوازا۔

تبدیلی افکار

ہندوستان میں بابر کو جن حالات سے سابقہ پڑا اور وہ جن تکلیف دہ مراحل سے دوچار ہوا وہ اپنی جگہ نہایت عجیب و غریب ہیں۔ ان کی وجہ سے اس کے عمل و فکر کا دھارا بالکل بدل گیا اور اس کی زندگی کے شب و روز اور ہی قالب میں ڈھل گئے اس نے شراب نوشی ترک کر دی اور ریش تراشی سے نا تب ہو گیا۔ اس سے متاثر ہو کر اور بھی بہت سے امیروں اور فوجیوں نے ان عیوب سے توبہ کی اور اپنا رشتہ و تعلق اللہ سے وابستہ کر لیا۔

ذوقِ شعری اور تصنیفات

بابر بہت سے اوصاف و کمالات کا مالک تھا۔ وہ نہایت متمحل مزاج اور نرم خو بادشاہ تھا۔ خطا کار کو معافی دینے اور اس پر اعتماد کرنے میں بڑا فراخ حوصلہ تھا۔ وہ بہترین شاعر بھی تھا۔ اس کا دیوان شاہی کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

اس نے ۹۲۸ھ میں ایک منثور ”مبین“ اپنے لڑکے کامران کے لیے لکھی، جو مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کو ”فقہ مبین“ اور ”فقہ بابر“ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک شرح شیخ زین الدین نے مبین کے نام سے تحریر کی

بابر کی یہ شدید خواہش تھی کہ ایک ایسی کتاب تصنیف کی جائے، جو مسائل شرعیہ کو محیط ہو۔ اس کے لیے اس نے حکم بھی جاری کیا۔ بعد ازاں شیخ نور الدین خوانی نے اس اہم کام کی انجام دہی کی ذمہ داری قبول کی جو شیخ زین الدین خوانی کی اولاد سے تھے۔

تھنائے ہند جلد سوم

ہرات میں نشوونما پائی، شیخ الاسلام سیف الدین احمد کے شاگرد تھے جو ملا سعد الدین تھنائانی کی اولاد سے تھے۔ انھوں نے مستند روایات و کتب سے مسائل شرعیہ کو ضبط تحریر میں لانا شروع کیا اور ہدایہ، شرح وقایہ، شرح مختصر وقایہ، کافی، فتاویٰ نقوی خان اور خزانہ وغیرہ کتب فقہ کی مدد سے ایک کتاب تیار کی جس کا نام فتاویٰ بابر ہی رکھا۔

بابر نے اپنے مرشد خواجہ عبید اللہ احمدی کے ایک منظوم رسالہ ”والدیہ“ کا ترکی میں قیام ہند کے زمانے میں ۹۳۵ھ کو ترجمہ کیا۔

رسائل عروض کے نام سے ترکی شاعری کے عروض پر ۹۳۳ھ میں ایک رسالہ لکھا۔ ۹۱۵ھ کو اس نے اپنے ایک ہم جلس خواجہ کلاں کو قلعہ سجود کی نگرانی کے لیے بھیجا۔ اس کی جدائی سے پریشان ہو کر اس کو یہ قطعہ لکھا:

قرار و عہد ببار این چنین بنود مرا گرید ہجر و مرا کر دے قسرا آخر
 بہ عشوہائے زمانہ چہ چارہ سازد کس بجور کرد جدا یار را از یار آخر
 آخری مصرعہ میں قلعہ سجود کی رعایت سے لفظ جوڑ نے قطعہ میں خاص ادبی لطف پیدا کر دیا ہے۔

پانی پت کی لڑائی کے موقع پر بابر کو غیر ملکبوں سے واسطہ پڑا تو اجنبی ماحول اور اجنبی زبان سے وہ خود بھی پریشان ہوا اور اس کے ساتھی بھی بہت حیران ہوئے تو اس نے یہ شعر کہا:

شدہ جمیع و بود جمیع پریشان گرتار قومے و قومے عجائب
 بیانہ کا قلعہ فتح کیا تو اس کے حاکم نظام خاں کو وفاداری کے وعدہ و قرار پر قائم رہنے کی تاکید کی اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ اس میں بیانہ کی رعایت سے لفظ بیان قابل ملاحظہ ہے:

باترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ چالاکی و مردانگی ترک عیان است
 گرز و دنیائی و نصیحت نہ کنی گوش آسنا عیان است چہ حاجت بہ بیان است

اس نے اپنی جودتِ طبع سے ایک خاص خط ایجاد کیا، جس کا نام خطِ بابری تھا۔
اس خط میں قرآن مجید لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا۔

اس خط کے بارے میں ہدایونی لکھتا ہے :

واذ جملہ غرائب و اختراعات آن شاہ مغفرت پنا ہی خط بابریست کہ مصحفی
بداں خط نوشتہ و بیکہ فرستادہ ^{۱۰۱۰ھ}
عہد بابری کے علما و فضلا

عہد بابری کے چند معروف علمائے دین کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

شیخ زین الدین۔ صدر کے عہدہ پر فائز تھے اور معقولات و منقولات کے عالم
تھے۔ راناسانگا پر بار نے فتح پائی تو اس خوشی میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا
تھا۔ اس کے لیے شیخ زین الدین ہی نے فرمان لکھا جو تمام ملک میں بھیجا گیا۔

مولانا شہاب الدین مہمانی۔ قرآن و حدیث پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ شاعر بھی
تھے حقیقہ تخلص کرتے تھے۔ مہما گوئی میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد علمائے کرام اور اصحابِ فن دربارِ بابری میں
موجود تھے۔

کتب خانہ

بابر کا کتب خانہ متنوع کتابوں پر مشتمل تھا، وہ سفر و حضر میں اسے ساتھ رکھتا
تھا۔ ۹۳۰ھ میں وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو لاہور کے قریب غازی خاں سے
تصادم کی نوبت آئی۔ غازی خاں کو شکست ہوئی تو بابر قلعہ میں داخل ہوا، وہاں
سے بے شمار دولت اس کے ہاتھ آئی، لیکن بابر کے نزدیک سب سے قیمتی سرمایہ
غازی خاں کا کتب خانہ تھا۔ غازی خاں بڑا علم دوست تھا۔ شاعری کا بھی اعلیٰ
مذاق رکھتا تھا۔ اس نے ہر قسم کی عمدہ اور خوش خط لکھی ہوئی کتابیں جمع کر

رکھی تھیں۔ بابر نے ان کتابوں میں سے کچھ اپنے لیے مخصوص کیں، کچھ شہزادہ ہمایوں کو دیں اور کچھ کامران کے لیے کابل بھیج دیں۔

وصیت

بابر انتہائی بہادر، معاملہ فہم، منصف، نیک نسبت، تدبیر چرب کا ماہر، صاف ذہن اور عقل مند بادشاہ تھا۔ فضا سے مستقبل کے آثار تلاش کر لینے اور لوگوں کے چہروں سے ان کے دلوں کی بات پڑھ لینے میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس کا اندازہ اس کی وصیت سے ہو سکتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو کی۔ ہمایوں چونکہ آگے چل کر اس ملک کی زمام حکومت ہاتھ میں لینے والا تھا، اس لیے یہ وصیت اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ بابر اس ملک کے باشندوں کی ذہنی و فکری خصوصیات پر کس طرح حاوی ہو گیا تھا۔

فرزند من اہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بادشاہی میں تمہیں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے :

۱۔ مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دینا، بلکہ لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا کامل احترام کرنا اور کسی رورعایت کے بغیر سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔

۲۔ گاو و کشی سے بالخصوص پرہیز کرو، تاکہ اس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں تمہارے لیے عزت و احترام کی جگہ پیدا ہو جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکر کے سبب سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔

۳۔ مختص کسی قوم اور اہل مذہب کی عبادت گاہ ہمسار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا چاہیے۔ تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ بنیادوں پر استوار ہوں اور ملک میں امن و امان رہے۔

۴۔ اسلام کی اشاعت و ظلم و ستم کی تلوار کے بجائے لطف و احسان کی تلوار سے

زیادہ بہتر طریق سے ہو سکے گی۔

۵۔ شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو، اس کو اہمیت دینے سے اس ملک میں اسلام کی جڑیں کمزور ہوں گی۔

۶۔ اپنی رعایا کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت ضعف و اضمحلال کے مرض سے محفوظ رہ سکے۔

بابر کے بارے میں مؤرخین کی یہ رے بہت حد تک قرین صواب ہے کہ وہ تمام اوصاف کا حامل ہونے کے باوجود مدبر نہ تھا۔ اس نے اپنے زمانہ بادشاہت میں نہ تو افغانستان میں اصلاحات کی طرف توجہ کی، نہ ہندوستان میں۔

وفات

بابر نے ۵ جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو انتقال کیا۔ اس نے کل پچاس برس عمر پائی۔ بارہ سال کی عمر میں تلج شاہی سرپر رکھا۔ اٹھتیس برس حکومت کی، جس میں پانچ برس ہندوستان کے زمانہ حکومت کے بھی شامل ہیں۔

بابر کے حالات توذک بابرہی منتخب التواریخ، اکبر نامہ، طبقات اکبری، مآثر رحیمی منتخب اللباب، سیر المتاخرین اور تاریخ فرشتہ وغیرہ کتب تاریخ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

ہمایوں

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصیر الدین محمد ہمایوں ہندوستان کا تخت نشین ہوا۔ اس کی ولادت ۴ ذی القعدہ ۹۱۳ھ کو کابل کے قلعہ میں ہوئی۔ اس نے حکومت وسطوت کی گود میں پرورش پائی اور بادشاہوں کی اولاد کی طرح فنون جنگ

۳۶ رود کوثر ص ۲۳، بحوالہ ترجمہ از انڈین اسلام (دہلی ش) اس وصیت کی ایک نقل

سطیٹ لائبریری بھوپال میں موجود ہے۔

فقہائے ہند جلد سوم

اور اصول حرب میں ہمارت پیدا کی۔ ترکی فارسی، علم ہیئت، ہندسہ، نجوم، ہنر اور ہماگوئی میں ماہر تھا۔ رصد گاہیں تعمیر کرنے میں پوری دستگاہ رکھتا تھا۔ شیخ جلال الدین بٹھوئی سندھی، شیخ ابوالقاسم جرجانی، مولانا الیاس اردبیلی، نور الدین سفیدرئی اور علامہ قطب الدین رازی سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کی۔ ہمایوں کا زیادہ وقت مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔

ہمایوں نے اپنے باپ کی وفات کے بعد ۹ جمادی الاولیٰ ۱۵۳۷ء کو آگرہ میں ادھر ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا اور ادھر مخالفتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے بھائی بھی مخالفتوں کی فہرست میں شامل تھے لیکن مخالفین کے مقابلے میں ہمایوں کا رویہ فراخ دلانہ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مخالفتوں میں سے کچھ لوگ والی ہجرات سلطان بہادر سے جا ملے تھے۔ ہمایوں نے بار بار سلطان بہادر کو خط لکھ کر ان کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر اس نے ہمیشہ نفی میں جواب دیا اور ہمایوں کے خطوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مجبوراً ہمایوں کو تسخیر ہجرات کا ارادہ کرنا پڑا۔ اس کے لیے وہ آگرہ سے روانہ بھی ہو گیا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ سلطان بہادر خود چتوڑ کا محاصرہ کیے بیٹھا ہے تو وہ سانگ پور میں رک گیا اور اس کے اخلاق شجاعت نے اجازت نہ دی کہ ایسے وقت میں جب کہ سلطان بہادر چتوڑ کے محاصرے میں مصروف اور دشمن سے برسرِ پیکار ہے، اس پر فوج کشی کی جائے۔ اس کو دشمن سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لینا ہمایوں نے شیوہ مردانگی کے خلاف گردانا۔

یوں تو ہمایوں کے مخالفتوں اور حریفوں کی فہرست بڑی وسیع ہے لیکن تاریخ ہند اس کے جس حریف کا بہت بڑے عنوان کے ساتھ ذکر کرتی ہے اور اس کے بوقلموں نقوش حکمرانی کو اپنے صفحات میں نمایاں طور سے پیش کرتی ہے، وہ شیر خاں سوری ہے۔ شیر خاں معمولی حیثیت سے ترقی کر کے یہاں تک پہنچا کہ اس نے ہندوستان کے عظیم فاتح بابر کے بیٹے شہنشاہ ہند ہمایوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کی، اس کے بھائیوں کو بھی اس کے مقابلے میں لاکھڑا کیا اور آسانی کے ساتھ انھیں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمایوں کو تمام اطلاقاً

برابر پہنچ رہی تھیں لیکن اس کی عادت تھی کہ لڑنے پر آتا تو مسلسل لڑتا ہی رہتا اور کئی کئی مہینے میدانِ جنگ ہی میں گزر جاتے۔۔۔ آرام کرنے لگتا تو ایک مدت آرام ہی میں گزار دیتا۔ جب اس کو اطرافِ ملک سے مسلسل کئی قسم کی خطرناک خبریں ملنے اور شیرخاں کی سرگرمیوں کی پیہم اطلاعات پہنچنے لگیں تو اس نے آگرو سے حرکت کی اور مختلف مقابلے اور محاربے کرتا ہوا بنگال جا پہنچا۔ ہمایوں کی اس پیش قدمی کی خبر شیرخاں کو ملی تو اس نے جھاڑ کھنڈ کے راستے سے یلغار کی اور قلعہ رہنٹاس کے دروازے پر جہاز تک دی۔ شیرخاں نے رہنٹاس کے راجہ سے درخواست کی کہ پردہ نشین عورتیں میرے ساتھ ہیں، آپ کا قلعہ بہت مضبوط اور محفوظ ہے۔ میں ان عورتوں کو اس قلعہ میں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ رہنٹاس کا راجہ لالچ میں آگیا، اس نے اس خیال سے کہ عورتوں کا مالِ دولت ہاتھ آئے گا، اجازت دے دی اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا شیرخاں نے پردہ داروں میں دو ہزار مسلح سپاہیوں کو بٹھا کر قلعے کے اندر بھیج دیا۔ جب ڈولے رکھے گئے تو بجائے عورتوں کے خون خوار سپاہی تلواریں سونت کر باہر نکل آئے اور قلعہ کے محافظوں اور رکیمنوں کو تلوار کی دھوار پر رکھ لیا۔ اس طرح شیرخاں آسانی سے قلعہ پر قابض ہو گیا۔

ہمایوں بنگال سے واپس آیا تو راستے میں شیرخاں گھات لگائے بیٹھا تھا اور اس اثنا میں اس نے کافی فوج بھی جمع کر لی تھی۔ ہمایوں کے لشکر کی بے سرو سامانی کا علم بھی شیرخاں کو ہو چکا تھا۔ جو سہ کے مقام پر شیرخاں کی فوج نے آگے بڑھ کر شاہی لشکر کا راستہ روک لیا۔ دریائے گنگا کی شاخ رہا ہی ندی برسات کے پانی سے بھر پھیل رہی تھی۔ اس ندی کے دونوں کناروں پر ذریعین نے مورچے جمالیے تین ماہ تک برابر لڑتی ہوتی رہی، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ایک روز ہمایوں نے ملا عزیز کو شیرخاں کے پاس صلح کا پیغام دے کر بھیجا۔ ان سے شیرخاں پہلے سے متعارف تھا۔ وہ دہاں پہنچے تو دیکھا کہ سخت گرمی میں شیرخاں آستیتیں چڑھائے اور پھاوڑہ ہاتھ میں لیے خندق کھود رہا ہے اور پسینے سے شرابو دہے۔ ملا محمد عزیز کو دیکھ کر اس نے ہاتھ دھوئے۔ ان کے لیے شامیانہ نصب کرایا اور خود بلا تکلف وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ جب بادشاہ کا پیغام

سن چکا تو جواب میں کہا :

”میری طرف سے ہمایوں بادشاہ کو اتنا جا کر کہہ دیجیے کہ تم خود لڑنا چاہتے ہو لیکن تمھارا لشکر لڑنے پر رضامند نہیں، اور میں لڑنا نہیں چاہتا مگر میرا لشکر لڑنے پر مقرر ہے“

اس سے کچھ دن بعد خود شیر خاں نے شیخ خلیل کو ہمایوں کے پاس بھیجا۔ شیخ خلیل ایک مشہور بزرگ تھے جو شیخ فرید شکر گنج کی اولاد سے تھے اور شیر خاں کے پیر تھے شیر خاں نے ان سے کہا، وہ بادشاہ سے کہہ دیں کہ ”میں بنگال کے سوا اور کسی علاقے سے سروکار نہیں رکھتا۔ اگر یہ علاقہ مجھے دے دیا جائے تو وہاں بھی خطبہ اور سکۃ بادشاہ کے نام کا ہوگا“ کہتے ہیں اس نے یہ عند حلف اٹھا کر کیا۔ ہمایوں اس پر اعتماد اور یقین کر کے صلح پر رضامند ہو گیا اور پوری طرح مطمئن ہو کر ندی پر پل باندھنے کا حکم دیا تاکہ دوسرے دن صبح کوچ کیا جائے۔

لیکن شیر خاں کا بیہینام صلح محض دھوکا تھا۔ اس نے دوسرے روز علی الصبح شاہی لشکر پر اچانک حملہ کر دیا۔ ہمایوں کی فوج بالکل بے خبر تھی۔ پریشانی میں اس کو صف آرائی کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیر خاں کے ایک ہی حملے سے ہمایوں شکست کھا گیا۔ جو پل اس نے ندی عبور کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا، پٹھانوں نے توڑ دیا اور ان کے توپچیوں اور تیراندازوں نے کشتیوں میں بیٹھ کر ہمایوں پر گولوں اور توپوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس ناگمانی حملے میں ہمایوں کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ بادشاہ نے گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں گھوڑا دیا میں ڈال دیا۔ جب ڈوبنے لگا تو ایک سقے نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی اور دیا پار کر لیا۔ اس وقت شیر خاں نے یہ شعر کہا :

فرید حسن را نوشا ہی دہی

سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

اس کے استاد نے اس کو اس طرح اصلاح دی :

یکے را برآری و شاہی دہی

سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

یہ واقعہ ۹۴۶ھ میں پیش آیا۔

اس کے بعد شیر خاں نے بنگال کے علاقے پر فوج کشی کی اور متعدد لڑائیوں کے بعد سارا بنگال اس کے قبضے میں آ گیا۔ وہاں اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھا اور شیر شاہ کے خطاب سے سخت نشین ہو گیا۔ اس سے اگلے سال شیر شاہ نے بہت بڑی تیاری کے ساتھ آگرہ کا عزم کیا۔ اب ہمایوں کے بھائی اور بعض امرائے سلطنت ذہنی اور عملی طور پر ہمایوں کے مزید مخالف ہو گئے تھے اور شیر شاہ کو یہ خبریں برابر موصول ہو رہی تھیں، جس سے اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ تاہم شیر شاہ کے حملے کی اطلاع پا کر ہمایوں مقابلے کو نکلا لیکن بھائیوں کی بے وفائی کی وجہ سے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور عین میدان جنگ میں ہمایوں کے ساتھیوں نے راہ فرار اختیار کی مجبوراً بادشاہ نے گھوڑا گنگا میں ڈال دیا اور پانی کے شدید بہاؤ میں نپشت کی طرف سے دریا میں گر پڑا۔ اس وقت شمس الدین محمد غزنوی نے مدد کی اور بادشاہ کو دریا عبور کرایا۔ وہاں سے ہمایوں آگرہ گیا، مگر شیر شاہ برابرہ تعاقب میں چلا آ رہا تھا، اس لیے وہ وہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور فوراً پنجاب چلا گیا۔ یہ لڑائی ۹۴۷ھ میں ہوئی۔

ہمایوں نے لاہور پہنچ کر آئندہ اقدام کے بارے میں غور کرنا شروع کیا، مگر بھائیوں میں سخت پھوٹ پڑ چکی تھی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ کشمیر فتح کیا جائے تاکہ بادشاہ وہاں چلا جائے چنانچہ شاہی فوج اور بعض کشمیریوں کی مدد سے ۲۲ رجب ۹۴۷ھ کو کشمیر پر قبضہ کر لیا گیا۔ اسی اثنا میں پتا چلا کہ شیر شاہ نے پنجاب کا رخ کر لیا ہے اور اس کی فوجیں لاہور سے صرف بتیس کوس دور رہ گئی ہیں۔ یہ سن کر ہمایوں دریا رادی عبور کر کے لاہور سے نکل گیا۔ اس وقت محدود تعداد پر مشتمل فوج اس کے ساتھ تھی اور وہ اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ اونٹ پر سوار تھا۔ اس قافلے کا رخ علاقہ سندھ کی طرف تھا۔ امرکوٹ (یا عمرکوٹ) پہنچے تو ۵ رجب ۹۴۹ھ کو شہزادہ اکبر پیدا

فقہائے ہند جلد سوم

ہوا۔ یہ لوگ راستے میں علاقائی حکمرانوں سے لڑتے جھگڑتے اور بھوک پیاس کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوتے سندھ عبور کر کے ایران جا پہنچے۔ وہاں سے شاہ ظہما سپ صفوی سے مدد لے کر بہایوں نے قندھار اور کابل پر حملہ کیا اور ان شہروں کو فتح کرنے کے بعد وہاں ایک مضبوط فوج منظم کی اور پھر ہندوستان پر حملہ کر کے اسے دوبارہ فتح کیا۔

یہ بہایوں کے لیے سخت آزمائش اور مصیبت کا دور تھا۔ ہندوستان کی وسیع سرزمین اس کے لیے ننگ ہو گئی تھی۔ شیر شاہ سہلسل اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا اور اس کو کہیں ٹھہرنے اور قدم جمانے کا موقع نہ ملتا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور ہندوستان پر حملے اور قبضے کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ آئندہ سطور میں شیر شاہ سوری اور اس خاندان کے ان افراد کا ذکر کیا جائے گا جو بہایوں کے بعد تخت ہند پر متمکن ہوئے۔ اس کے بعد پھر بہایوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔ بہایوں کا بڑے پیمانے پر یہ پہلا دور حکومت ہے جو دس سال (۱۵۳۷ء تا ۱۵۶۲ء) پر مشتمل ہے۔

شیر شاہ سوری

ہندوستان کی تاریخ اب ایک اور شخص کو ابھارتی اور اس ملک کے بادشاہ کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے۔ وہ ہے، شیر شاہ سوری۔ شیر شاہ کا اصل نام فرید خاں تھا۔ اس کے باپ کا نام حسن اور دادا کا ابراہیم تھا۔ ابراہیم درحقیقت افغانستان کے علاقہ رن کارہنے والا تھا اور وہاں کے سورخاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ سلطان بسلو لودھی کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا اور اس کے لشکر میں ملازم ہو گیا اور عرصہ تک حصار فیروزہ اور نرنول میں کار پر داند رہا۔ ابراہیم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے حسن نے سلطان سکندر لودھی کے ایک امیر جمال خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسے جمال خاں کی طرف سے سہرام اور خواص پور قلعہ رہتاس کے ماتحت پرگنے جاگیر میں ملے۔ پانچ سو سوار اس کی نگرانی اور ماتحتی میں خدمات انجام دیتے تھے جس کے

آٹھ بیٹے تھے جن میں ایک فرید خاں تھا۔ جاگیر کی تقسیم اور انتظام کے سلسلے میں فرید خاں کی باپ اور بھائیوں سے چپقلش ہو گئی اور اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جون پور کی راہ لی۔ جون پور اس زمانے میں مرکزِ علم و فضل تھا۔ وہاں اس نے طالب علمی کی زندگی اختیار کر لی۔ مشہور اساتذہ سے کافیہ اور اس کی شرح (مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی) سکندر نامہ، گلستان، بوستان اور دوسری درسی کتابیں باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھیں اس کے اوقات جون پور کے مدرسوں اور خانقاہوں میں گزرتے تھے، جہاں وہ علما و صلحا سے استفادہ کرتا، اپنی قابلیت بڑھاتا اور فکر و ذہن کی تربیت و اصلاح کے سامان بہم پہنچاتا تھا۔

اس کے بعد باپ سے صلح ہو گئی اور اسے جاگیروں کے انتظام و انصرام پر مامور کر دیا گیا۔ اپنی اس عمل داری کے زمانے میں فرید خاں نے بڑے عدل و انصاف اور حسن انتظام کا ثبوت دیا اور عقل مندی و زیرکی سے اپنے خطرناک حریفوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا یہ انتظامی دور بہت مختصر رہا اور بعض معاملات میں باپ سے پتھر اختلاف پیدا ہو گیا۔

اب سلطان ابراہیم لودھی کا دورِ حکومت تھا۔ فرید خاں آگرہ چلا گیا اور وہاں سلطان کے ایک سردار دولت خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ ایک روز اس نے ابراہیم لودھی سے اپنے باپ (حسن) کی شکایت کی۔ سلطان نے خفگی کا اظہار کیا اور کہا، ”یہ تو بہت غلط آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا باپ اس سے ناراض ہے اور یہ الٹا اس کی شکایت کرتا ہے۔“

کچھ عرصہ بعد حسن وفات پا گیا تو دولت خاں نے اس کی جاگیر کے پرگنوں فرید خاں کو واپس دلادے اور وہ خاصی مدت تک جاگیروں ہی میں رہا۔ لیکن بھائیوں سے مخالفت کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ بعد ازاں بہار چلا گیا اور سلطان محمد خاں کا ملازم ہو گیا، جس نے سلطان ابراہیم لودھی کے قتل کے بعد بہار میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور اپنے نام کا خطبہ اور سکہ بھی جاری کر لیا تھا۔ ایک دن فرید خاں نے سلطان محمد خاں

نعتاً تے ہند جلد سوم

کی رکاب میں شیر کا شکار کیا۔ اس کی بہادری سے متاثر ہو کر سلطان نے اس کو شیر خاں کا خطاب عطا کیا اور یہ فرید خاں کے بچائے شیر خاں کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اب شیر خاں انقلابِ احوال سے دوچار اور حالات کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا باہر کے دربار میں جا پہنچا اور سلطان جنید برلاس کی سفارش سے جو باہر کی طرف سے مانگ لیا اور کڑھ کا حاکم تھا، شاہی ملازمین کی سیلک میں منسلک ہو گیا۔ ایک مرتبہ باہر چندیری کے سفر پر روانہ ہوا تو شیر خاں اس کے ہم رکاب تھا۔ شیر خاں ذہین اور تیز فہم آدمی تھا۔ اس سفر میں اس کو اندازہ ہوا کہ مغل حکمران امورِ مملکت اور ملک میں بنیادی اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت سے بے پیمانہ ہے، اور ریشوتیں لے کر عمال حکومت لوگوں کے معاملات کو بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر شیر خاں کو یقین ہو گیا کہ مغلوں سے بادشاہت چھین لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، بس کمرِ مت باندھ لینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس وقت سے وہ حصولِ اقتدار کی تدبیروں میں لگ گیا۔

ایک روز باہر نے کھانا کھاتے وقت دسترخوان پر شیر خاں کی کوئی گستاخانہ اور خلافِ ادب حرکت دیکھی تو ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے شیر خاں کی مخالفت کا اظہار ہوتا تھا۔ اہل مجلس نے بھی موقع پا کر شیر خاں کی خود سری اور باغیانہ خیالات باہر کے گوش گزار کیے۔ شیر خاں خوف زدہ ہو کر شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور وہیں اپنی جاگیر میں چلا گیا۔ تاہم اس آٹنایں وہ آرام سے نہیں بیٹھا۔ مختلف امرا و حکام سے ملنے اور تعلقات برٹھانے میں مصروف رہا۔

پھر ہمایوں تخت نشین ہوا تو شیر خاں اس سے بھی ملا۔ بعد کو بعض معاملات میں اس سے شدید اختلاف پیدا ہو گیا اور نوبت لڑائی تک پہنچی۔ لڑائی میں ہمایوں اور ساتھیوں کی بے وفائی اور شیر خاں کے حسن تدبیر سے ہمایوں کو شکست کھا کر ۹۴۷ھ میں راہ فرار اختیار کرنا پڑی اور شیر خاں نے شیر شاہ کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کا تلج شاہی سر پر رکھا۔ یہ ہے اس کے زمامِ اقتدار بڑھتے چلنے اور ہندوستان کے تختِ حکومت پر قابض ہونے کا مختصر پس منظر! اس میں واقعات کی اور بھی متعدد کڑیاں

ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں، مگر ہم ان سے تعرض کیے بغیر جلد جلد آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ اب برصغیر کی تاریخ بادشاہت نے سوری خاندان کے لیے اپنا دروازہ کھول دیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

شیرشاہ سوری کا دورِ حکمرانی

شیرشاہ بڑا مدبر، عالم و فاضل، علما کا دوست و ہمدرد اور عادل و منصف بادشاہ تھا۔ اس نے ملک میں باقاعدہ اصلاحات جاری کیں اور اپنی قلمرو کو نظم و نسق کی مضبوط لٹی میں پرو دیا۔ رعایا کا بدرجہ فائیت خیر خواہ تھا اور اس کو ہر اعتبار سے آرام و آسائش بہم پہنچانے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ اس نے بنگال سے لے کر انگ تک جو پورے چار ماہ کا راستہ تھا، ایک عظیم شہراہ بنائی، جو پندرہ سو کو س لمبی تھی، اس میں آگرہ سے لے کر ماندو تک ہر کو س پر ایک سرائے مسجد اور سچنے کنواں تعمیر کرایا اور ہر مسجد میں ایک امام اور مؤذن مقرر کیا۔ پانی کی بہم رسانی کے لیے مختلف مقامات پر سقے مقرر کیے۔ ہندوؤں کے لیے ہندو سقے کا علیحدہ انتظام کیا۔ اس طویل شہراہ پر دو رو بہ درخت لگائے گئے تاکہ مسافر دھوپ سے محفوظ رہیں۔ راستوں کی مسافت کا اندازہ کرنے کے لیے میل نصب کرائے۔

اس نے اپنی مملکت میں دیانت دار قاضی اور منصف مقرر کیے۔ اس کے عدل و انصاف کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔ بدایونی کے الفاظ ہیں کہ بڑھیا بھی اگر جنگل میں سونے کا تھال اچھالتی ہوئی چلی جاتی، تو کسی کو مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ بدایونی منتخب التواریخ میں اس کی معدلت گستری کی تعریف میں لکھتا ہے: ”میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میری پیدائش ماہ ربیع الثانی ۹۴۷ھ میں اس عادل بادشاہ کے زمانے میں ہوئی۔“

شیرشاہ جنگی تدبیروں کا ماہر تھا اور حزم و احتیاط کے ساتھ میدان جنگ میں اترتا تھا۔ وہ عموماً مقابلے کے بجائے حکمت عملی سے لڑائی جیتنے کا خواہاں ہوتا۔

فقہائے ہند جلد سوم

اس کے دورِ حکمرانی کو برصغیر میں زریں دور سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے اس کو اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ پوری زندگی ہنگاموں میں گزری، حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں آئی تو عمر ڈھل چکی تھی۔ وہ آئینہ دیکھ کر کہا کرتا تھا، "افسوس ہے مجھے اس وقت حکومت ملی جب میری زندگی کی شام ہو چکی تھی۔"

شیرشاہ کے زمانے میں حریم شریفین کا سفر انتہائی دشوار گزار اور خطرناک تھا۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں نے راستے روک رکھے تھے، اور حجاج کے قافلے خطرات میں گھرے رہتے تھے۔ شیرشاہ حجاج کے راستوں کو لٹیروں سے محفوظ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا اور اس ضمن میں شاہِ روم سے گفتگو کر کے کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کا خواہاں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر ملک کے مسلمان بادشاہ اس میں تعاون کریں اور مشترکہ طور سے ایک شہزادِ امن بنائیں۔ وہ مشہور عالم دین سید رفیع الدین محدث کو اپنا وکیل و نمائندہ بنا کر حریم شریفین بھیجنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا، لیکن افسوس ہے دستِ اجل نے اس کی ہمت نہ دی۔

اس نے بند و بستِ اراضی کا اہتمام کیا اور زمینداروں اور مزارعوں سے غرضور مالیک کی وصولی کا سلسلہ ختم کیا۔ تاجروں کو بھی محصولات کی کثرت سے نجات دلائی۔ علاؤ الدین خلجی کے بعد یہ برصغیر کا پہلا بادشاہ تھا جس نے ملک میں بنیادی اصلاحات جاری کیں اور فوج اور دیگر محکموں کو اس دور کے جدید تقاضوں کے مطابق منظم کیا۔ وہ علما کی بے حد قدر کرتا اور دینی معاملات میں ان سے مشورے لیتا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت کے علمائے کرام کے حالات کتاب کے آئندہ اوراق میں مرقوم ہیں۔

اس نے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے اپنے اوقاتِ شب و روز کو چند حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کچھ حصے عبادت کے لیے، کچھ عدل و قضا کے لیے اور کچھ اصلاحِ عساکر کے لیے مخصوص تھے۔ اس کا معمول تھا کہ رات کے تیسرے حصے میں بیدار ہو جاتا، غسل کر کے نمازِ تہجد پڑھتا اور وظائف و اوراد میں مصروف

ہو جاتا۔ پھر مختلف محکموں کے حسابات دیکھنا اور متعلقہ حکام و اہل کام سے گفتگو کر کے اس دن کے ضروری اور اہم امور کے سلسلے میں ان کو ہدایات دینا۔ بعد ازاں نماز فجر جماعت کے ساتھ ادا کرتا اور وظائف میں مشغول ہو جاتا۔ نماز و وظائف سے فارغ ہونے کے بعد اہل کام سے گفتگو کرتا، پھر نماز اشراق پڑھتا۔ بعد ازاں اہل حوائج سے ان کی ضروریات سے متعلق گفتگو کرتا اور انھیں ان کی ضرورت کی چیزیں مثلاً گھوڑے، سامان اور ضروری اموال وغیرہ عطا کرتا۔ پھر مظلومین و مستحقین کی طرف عنانِ توجہ مبذول ہو جاتی، ان کی داد رسی و حق رسی کے لیے مناسب احکام جاری کیے جاتے۔ اہل عساکر کو وہ بالخصوص مرکزِ توجہ بٹھھراتا تھا۔ عساکری نظام کو مضبوط بنانے کے لیے وہ اس کے عہدہ داروں سے بہت ہی تفصیل سے گفتگو کرتا۔ پھر امر اور سفر اور وکلاء سلطنت کو شرف باریابی بخشتا اور ضروری احکام جاری کرتا، ڈاک خود پڑھتا اور اس کے جواب لکھواتا، مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کی درخواستیں وصول کرتا اور ان پر مناسب فرامین تحریر کرتا۔ پھر عامہ و مشائخ کی صحبت میں مسائل و احکام کی مجلس منعقد کرتا اور پیش آئندہ امور کے بارے میں ان سے شرعی نقطہ نظر سے مشورے لیتا اور ان کو عملی جامہ پہناتا۔ اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت ہو جاتا اور باجماعت نماز ادا کرتا۔ نماز کے بعد تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو جاتا۔ اس نے اپنے عمال و حکام کے نام یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ عدل و انصاف میں قطعی طور سے کوتاہی نہ کی جائے اور اس باب میں کافر و مسلم، امیر و غریب اور چھوٹے بڑے کے درمیان کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ اس نے قضا کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ نماز باجماعت کی ہر حال میں پابندی کی جائے۔ رشوت اور طمع و حرص کو اس نے اپنی مملکت سے ختم کر دیا تھا۔ باغیوں، چوروں، لٹیروں اور ریشمیوں کا سخت دشمن تھا اور ان کو شدید سزا دیتا تھا۔ غرض اس کا عہدِ حکومت ہر اعتبار سے مثالی تھا۔

وفات

شیر شاہ کی زندگی کا بیشتر حصہ میدانِ جنگ میں گزارا اور اس کی موت بھی اسی

حالت میں واقع ہوئی۔ ۹۵۲ھ میں اس نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا، جو ہندوستان کا ایک نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ تھا۔ قلعہ کی فصیل کے گرد سرنگیں کھودی گئیں، ان سرنگوں کے ذریعے مسلمان بہادر قلعے میں داخل ہوئے۔ قلعے کے اندر شیر شاہ کی نگرانی میں بارودی گولے دشمن پر پھینکے جا رہے تھے۔ اتفاق سے ایک گولا قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر شاہی لشکر میں لوٹ آیا اور پھٹ گیا۔ اس کے اثر سے وہاں پر پڑے ہوئے تمام گولے پھٹ گئے اور ہر طرف آگ پھیل گئی۔ شیر شاہ بھی شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا، اور سارے جسم جل کر سیاہ ہو گیا۔ بارودی مورچے کے قریب ہی بادشاہ کے لیے ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ شیر شاہ اسی نازک حالت میں روڑتا ہوا اس خیمے میں پہنچا۔ فوج دشمن پر یورش کر رہی تھی اور بادشاہ خیمے میں بے ہوش پڑا تھا۔ جب ہوش آتا تو چلا چلا کر لوگوں کو قلعہ فتح کرنے پر آگساتا۔ کوئی اسے دیکھنے جاتا تو اسے محاذ پر جانے کا اشارہ کرتا۔ جہاں بلب بادشاہ کے اس عزم کو دیکھ کر فوج کے حوصلے اور بڑھ جاتے۔ شیر شاہ حالت اضطراب و بے قراری میں بار بار قلعہ کی فتح کے بارے میں دریافت کرتا۔ اس دن سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ شیر شاہ کے جسم پر صندل اور گلاب کا لپٹ کیا گیا۔ تکلیف برابر بڑھتی گئی۔ جوں ہی بادشاہ نے فتح کی خوش خبری سنی، جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہ حادثہ ۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ کو پیش آیا۔ اس کا آبائی قبرستان سہرام میں تھا، میت وہیں لے جا کر دفن کی گئی۔

شیر شاہ سوری نے پندرہ برس تک سرداری اور حکومت کی اور تقریباً پانچ سال ہندوستان کا خود مختار بادشاہ رہا۔ اس کا سال ولادت رجب ۸۷۷ھ اور سال جلوس ۹۲۷ھ ہے۔ مقام جلوس آگرہ اور دارالخلافہ دہلی تھا۔ مدت بادشاہت چار سال چار ماہ پندرہ یوم بنتی ہے۔ تاریخ وفات ۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ ہے۔

سلیم شاہ سوری

سلطان شیر شاہ سوری کے بعد ۱۵ ربیع الاول ۹۵۲ھ کو اس کا بیٹا سلیم شاہ سوری

سرپر آریئے تخت ہند ہوا۔ یہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا مگر باپ کی طرح بڑا عادل اور منصف مزاج تھا۔ اس نے بھی ملکی اصلاحات اور حکومت کے نظم و نسق کو مستحکم کرنے کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی۔ شہر تعمیر کیے، زراعت کو ترقی دی، رعایا کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھا اور اس سے عدل و احسان کا برتاؤ کیا۔ یہ عبادت گزار اور نیک نفس بادشاہ تھا۔ مسجد میں لوگوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتا، علما سے عزت و تکریم سے پیش آتا اور علمی مسائل میں ان سے مذاکرہ کرتا۔ مسکرات سے اس کو شدید نفرت تھی اور غیر شرعی امور کے ارتکاب سننے دامن کشاں رہتا تھا۔ فوج کے لیے اس کے والد شیر شاہ نے بھی اصلاحات نافذ کیں لیکن اس نے ان اصلاحات میں مزید اضافہ کیا۔

سلیم شاہ نے عسکری نظام کو جدید قالب میں ڈھالا اور اس کو دو حصوں میں مرتب کیا۔ ایک چھوٹا حصہ اور ایک بڑا حصہ چھوٹا حصہ کم نفری پر مشتمل تھا اور بڑا حصہ زیادہ نفری پر۔ اچھوٹے حصے میں چار درجے رکھے۔ ایک درجہ سپاس افراد کی نفری پر، دوسرا دوسو کی، تیسرا ڈھائی سو کی، اور چوتھا پانچ سو کی نفری پر مشتمل تھا۔ بڑا حصہ پانچ ہزار اور دس ہزار اور بیس ہزار کی نفری کو محتوی تھا۔ اسی ترتیب سے ان پر امراکا تقرر عمل میں لایا گیا۔ فوج میں فارسی اور ہندی زبانوں پر عبور رکھنے والے محرر مقرر کیے۔

محکمہ قضا میں پٹھان اور ہندی قاضی متعین کیے۔ سناہ گاؤں سے لے کر کابل کی سرحدوں تک اس نے فوجی چھاؤنیاں تعمیر کیں۔ گزرگاہوں اور راستوں میں شہر شاہ نے مسافروں کے آرام کے لیے جو سرائیں تعمیر کی تھیں، سلیم شاہ نے ان میں اور اضافہ کیا، اور بہت سی نئی سرائیں بنوائیں، راستوں میں پانی کا انتظام کیا، اس نے لنگر خانے کھولے جاری کیے، جن میں مسلمانوں کو پکا ہوا کھانا اور ہندوؤں کو اناج دیا جاتا تھا۔

اس کی زندگی کے شب و روز کا بیشتر حصہ اگرچہ حرب و سرب میں گزرا، مگر اس نے کبھی رعایا کی خبر گیری اور اصلاحی امور سے صرف نظر نہیں کیا اور اس کی گونا گوں مصروفیات اصلاح احوال اور علمائے دین سے تعلقات کی راہ میں حائل نہیں ہو سکیں۔ سلیم شاہ میں ایک خوبی یہ تھی کہ یہ بلند کردار اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ اس ضمن

میں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک قصبے میں قیام پذیر ہوا، جس کا نام ”بن“ تھا، حسب معمول عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان تنہا قلعہ مان گڑھ کی سیر کے لیے جا رہا تھا، جو قصبہ بن سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ راستے میں ایک شخص فریاد کرتا ہوا سامنے آیا اور بادشاہ کا راستہ روک کر بغل سے تلوار نکالی اور حملہ کر دیا۔ سلیم شاہ نے تیزی سے اس کے دار کوروکا۔ جان سے توج گیا مگر معمولی زخم آئے۔ وہ شخص دوسرا دار کرنا چاہتا تھا کہ سلیم شاہ پہلو بچا کر اس سے لپٹ گیا اور تلوار چھین لی۔ اتنے میں کچھ اور لوگ بھی وہاں آگئے اور حملہ آور کو پکڑ لیا گیا۔ لوگوں نے حملہ آور سے پوچھنا شروع کیا کہ تم نے یہ حرکت کس کے اشارے سے کی ہے۔ بادشاہ نے یہ کہہ کر لوگوں کو تفیث و تحقیق سے روک دیا کہ معلوم نہیں یہ شخص غلط بیانی کر کے کتنے گھروں کو ہر باد کر دے۔ اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے اسے فوری طور پر قتل کر دیا گیا۔ اس کی تلوار دیکھی تو پتا چلا کہ یہ وہی تلوار ہے جو سلیم شاہ نے اقبال خاں کو دی تھی۔ اقبال خاں عرصہ تک شہ شاہ کی خدمت میں رہا تھا مگر چھوٹا پن اس کی فطرت میں داخل تھا۔ لوگوں نے سلیم شاہ کو اسے قتل کرنے کو کہا لیکن اس نے جواب دیا، اپنے پروردہ کو قتل کرنے سے مجھے شرم آتی ہے۔

سلیم شاہ عبادت گزار، طباع و ذہین اور علما و صلحا کا عقیدت مند تھا، مگر ساتھ ہی لطیفہ گو بھی تھا اور لطیفہ سن کر خوش ہوتا تھا۔ کتنے ہیں پنجاب جاتے ہوئے جب وہ الور ٹھہرا تو ایک دن دُور سے مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پورا کو آتے ہوئے دیکھا۔ مصاحبوں سے کہا: ”تمہیں معلوم ہے یہ کون آرہا ہے؟“ بولے ”حضور ہی فرمائیں“ سلیم شاہ نے کہا: ”بابر بادشاہ کے پانچ بیٹے تھے، جن میں چار تو ہندوستان سے نکل گئے، مگر یہ پانچواں یہاں رہ گیا“ ایک مصاحب ہرست ناں نے کہا: ”یہ فتنے کی جڑ آپ نے کیوں رہنے دی؟“ سلیم شاہ نے جواب دیا: ”کیا کروں، اس سے بہتر آدمی مجھے نظر نہیں آتا“ جب مخدوم الملک مجلس میں آئے تو بادشاہ نے نہایت اعزاز کے ساتھ انھیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور موارید کی تسبیح عنایت کی جو تیس ہزار

روپے کی تھی اور اسی وقت کسی نے پیش کی تھی۔

سلیم شاہ کا زمانہ علم و علما کے اعتبار سے بڑا زرخیز تھا اور یہ بادشاہ اہل علم کا بہت قدر دان تھا۔ اس کے دربار میں شعر و شاعری اور مختلف مسائل پر علما کے دریاں مذاکروں اور مباحثوں کا ہنگامہ بہت چل رہا تھا۔

سلیم شاہ نے نو سال بادشاہت کی، ۹۶۱ھ کو وفات پائی۔ اس کی میت کو سہسرام لے جا کر شیر شاہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال گجرات کے خداتر میں اور عادل بادشاہ سلطان محمود کو برہان نامی ایک خادم نے شہید کر دیا۔ وکن کے بادشاہ نظام الملک نے بھی اسی سال انتقال کیا۔ یہ سال گویا بادشاہوں کی موت کا سال تھا۔

سلیم شاہ کے بعد

سلطان سلیم شاہ سوری کے بعد اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت نشین ہوا، جو دس سال کا کم سن بچہ تھا۔ لیکن تخت نشینی کے تیسرے ہی دن سلیم شاہ کے سارے مبارز خاں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مبارز خاں کی بہن بھائی کے قدموں میں گر پڑی اور منت و لجاجت سے عرض گزار ہوئی کہ اس بچے کو قتل نہ کرو، بادشاہ ہی تم لے لیا ہیں اس کو کسی نامعلوم مقام میں لے کر چلی جاؤ گی۔ لیکن ظالم بھائی پر بہن کی لجاجت کا کوئی اثر نہ ہوا اور محل ہرا میں گھس کر ماں کے سامنے اس کم سن بچے کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اس بچے کے قتل سے سلیم شاہ سوری کی نسل ختم ہو گئی۔

فیروز شاہ کے بعد اس کا قاتل ماموں مبارز خاں سلطان محمد عادل کا لقب اختیار کر کے تخت ہند پر متمکن ہوا۔ یہ شخص عدلی کے عرف سے معروف تھا۔ اس کا دور ہنگاموں اور بغاوتوں کا دور تھا۔ ادھر مغل حکمران ہمایوں کی فوج بھی دوبارہ تخت ہند پر قبضہ کرنے کے لیے ملک میں داخل ہو گئی تھی اور آگرہ اور اٹاوا تک پیش قدمی کر چکی تھی۔ عدلی نے اس کے مقابلے کے لیے بہت سی فوج، ہاتھی اور خزانہ لے کر ہیموں بقال کو بھیجا، جس کو ہیموں بنیا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شخص شیر شاہ کے زمانے

فقہائے ہند جلد سوم

میں معمولی حیثیت کا مالک تھا اور ترقی کرتے کرتے اونچے منصب پر فائز ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں ایک لڑائی میں ایک شخص سلطان محمد بہادر نے جو عدلی سے بغاوت کر کے ایک علاقے کا حاکم بن بیٹھا تھا، ۹۶۲ھ میں عدلی کو قتل کر دیا۔ سورخاندان نے اس ملک پر صرف پندرہ سال حکومت کی۔

ہمایوں کی ہندوستان میں واپسی

ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھانے اور اس ملک سے بھاگ جانے کے بعد خاموش نہیں بیٹھا۔ اس نے شاہ طہماسپ صفوی کی مدد سے پہلے کابل و قندھار کو فتح کیا، اور پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بے وقابھانیتوں اور حریفوں کا زور ختم کر کے اس ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ تاریخ ہند کا نیا باب اس کے سامنے کھل گیا اور وہ آگے بڑھا تو تاج شاہی اس کے سر کی زینت بننے کے لیے بے تاب تھا۔

علماء کا احترام

ہمایوں بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ علماء کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس ضمن کا یہ واقعہ قابل بیان ہے کہ ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے بیرم خاں کی معرفت مولانا زین الدین محمود سے ملاقات کی۔ مولانا مدوح خراسان کے موضع بہرا کے رہنے والے تھے۔ کئی بزرگوں اور عالموں کے صحبت یافتہ تھے مولانا عبدالرحمن جامی اور مولانا عبدالغفور سے بھی ملاقات کر چکے تھے۔ بیرم خاں ان کا ہٹا کر دھتا اور ان کے درس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ہمایوں نے کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا، مولانا زین الدین محمود کو بھی

دعوت دی۔ ہمایوں کے ہاتھ دھلانے کا وقت آیا تو ہمایوں نے خود اپنے ہاتھ میں آفتاب اٹھایا اور طشت بیرم خاں نے پکڑا۔ اس دعوت میں مولانا سید جمال الدین محدث کے پوتے میر حبیب اللہ بھی موجود تھے۔ مولانا نے میر حبیب اللہ کی طرف اشارہ کر کے ہمایوں سے کہا۔ ”ان کو جانتے ہو یہ کون ہیں۔“ ہمایوں ان کے سامنے

بھی آفتاب لے گیا۔ میر صاحب گھبرا گئے، تھوڑا سا پانی لیا اور جلد جلد ہاتھوں پر ڈالا۔ لیکن مولانا نے نہایت اطمینان کے ساتھ اچھی طرح ہاتھ دھوئے۔ اس موقع پر ہمایوں کی رگ ظرافت پھر کی تو مولانا سے پوچھا۔ ”کتنے پانی سے ہاتھ دھونا مسنون ہے؟“ فرمایا۔ ”جتنے پانی سے ہاتھ اچھی طرح دھل جائیں“۔ مولانا زین الدین کی مخلصانہ محبت اور شفقت سے ہمایوں بہت خوش ہوا اور ان سے باقاعدہ استفادہ کرتا رہا۔ بعد کو اس نے بیرم خاں کے ذریعے کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں پیش کی۔ لیکن وہ تحفہ لینے کے عادی نہ تھے، لہذا انکار کر دیا۔ بیرم خاں کا اصرار زیادہ بڑھا تو وہ رقم بادلِ سخاوت قبول کر لی اور اس کے بدلے میں اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی بہت سی کمائیں جو اس رقم سے زیادہ قیمت کی تھیں اور اس وقت ضروری تھیں، بادشاہ کے پاس بھجوا دیں کہ اصولاً و شرعاً ہر یہ یک طرفہ نہیں، دونوں طرف سے ہوتا ہے۔

اسی طرح علما کی عزت و تعظیم کے بارے میں ہمایوں سے متعلق یہ واقعہ بھی مشہور ہے اور تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ جب تسخیر ہند کے لیے اس نے دوسری مرتبہ چڑھائی کی تو مفسر قرآن شیخ حمید سنہبلی اس کے استقبال کے لیے گئے۔ ہمایوں ان کا بڑا متفقہ تھا۔ ایک دن شیخ نے ہمایوں سے کہا: ”تمہارا پورا لشکر ارضی معلوم ہوتا ہے“۔ ہمایوں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“ فرمایا۔ ”اب کی بار تمہارے سپاہیوں کے نام یا رعلی کفش علی اور حیدر علی وغیرہ ہیں۔ دوسرے کسی خلیفہ کے نام پر کسی فوجی کا نام نہیں“۔ شیخ کی بات سن کر ہمایوں کو طیش آ گیا، اس وقت ہاتھ میں قلم کھینچا ہوا تھا جس کو غصے سے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا: ”نام پدر من کبیر عمر شیخ بود“ (میرے دادا کا نام عمر شیخ تھا) یہ کہہ کر ہمایوں تیزی سے محل سرا میں چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد باہر آ گیا اور نرمی اور تحمل سے شیخ کو اپنے صحیح عقائد سے آگاہ کیا۔

شیخ حمید سنہبلی کی اس بات کا دراصل پس منظر یہ تھا کہ ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے شاہ ظہماسپ صفوی سے مدد لیتے وقت شیعہ عقائد قبول کرنے سے

فقہائے ہند جلد سوم

صاف لفظوں میں انکار نہیں کیا تھا اور صفویوں کا لشکر لے کر ہی بدخشاں پر چڑھائی کی تھی، اس سے شیخ کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ شاید اس نے شیعیت قبول کر لی ہے بہایوں نے اپنے دادا عمر شیخ کے نام کا حوالہ دے کر اس سے اپنی برأت ظاہر کی۔

عہدِ بہایوں کے علمائے کرام اور فقہائے عظام کے واقعات و حالات اس کتاب میں متعدد مقامات پر مذکور ہیں۔

بہایوں کے اوصاف

بہایوں بہت سی خوبیوں کا مالک اور متعدد اوصاف کا حامل تھا۔ اسو سلطنت پر گہری نظر رکھتا تھا، مروجہ علوم میں ماہر تھا، علاوہ ازیں علوم نجوم و ہیئت پر بھی اسے کمال حاصل تھا، علما و فضلاء کی دل سے قدر کرتا تھا۔ بزرگانِ دین اور شعرا سے اسے محبت تھی اور خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس میں بیخوبی تھی کہ ہمیشہ با وضو رہتا اور اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام کبھی بے وضو زبان پر نہ لاتا۔ اگر کوئی ایسا نام لینے کی ضرورت پڑتی تو جو ”عبد“، اور لفظ ”اللہ“ سے مرکب ہو، مثلاً عبد اللہ، عبد الرحمن عبدالحی وغیرہ تو فقط ”عبد“ کہہ کر پکارتا کہ مبادا بے وضو نام اللہ زبان پر آجائے۔ اس کی زبان پر کبھی گالی نہ آئی، جب بہت غصے میں آجاتا تو منہ سے ”بے نادان“ کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ مجلس میں آتا تو کبھی بایاں پیر پہلے نہ رکھتا۔ کسی اور شخص کی کبھی مجال نہ تھی کہ مجلس میں آئے وقت بایاں پاؤں پہلے رکھے۔ اگر کسی سے کبھی جوک ہو بھی جاتی تو اسے پیچھے ٹوٹا دیتا اور کہتا، دوبارہ مجلس میں آئے۔ اس کی حیا اور متانت کا یہ عالم تھا کہ کبھی فقہ مار کر نہیں ہنسا اور کسی کی طرف گھور کر نہیں دیکھا۔

بہایوں کی علمی و شعری اور ملکی معاملات پر غور و خوض کی محفلیں رات بھر چمکتی رہتی تھیں کبھی اس کی طرف سے نکان یا تکاسل کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ بے حد سخی اور فیاض تھا۔ کہتے ہیں اس کی فیاضی کے مقابلے میں تمام ہندوستان کا خراج بھی کافی نہ تھا۔ اسی لیے محکمہ مالیات کے عمال اس کے سامنے نقد روپیہ نہیں لاتے تھے۔

کتاب خانہ بہایوں صاحبِ علم حکمران تھا اور اس کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔

اس کا کتب خانہ بڑا وسیع اور مختلف عنوانات کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس کے وقت کا ایک حصہ مطالعہ کتب کے لیے مخصوص تھا۔ وہلی کے شیرشاہی قلعہ کی سہ منزلہ عمارت کی آخری منزل میں اس نے اپنا کتب خانہ قائم کر رکھا تھا۔ وہ چوں کہ علم نجوم اور کواکب کا بھی ماہر تھا، اس لیے اس منزل میں اس کی رصد گاہ بھی تھی۔ ہمایوں کے اس شاہی کتب خانہ کے مہتمم کا نام نظام تھا جو باز بہادر کے عرف سے معروف تھا۔ ہمایوں کے فوق مطالعہ اور شوق کتب بینی کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں بھی ایک چھوٹا سا سفر کتب خانہ اس کے ساتھ رہتا۔ چنانچہ اس نے جب کھمبایت کا محاصرہ کیا تو دیگر کتابوں کے ساتھ تاریخ تیمور کا وہ نسخہ بھی موجود تھا، جو ہزاد نے مصور کیا تھا۔ ایک جنگلی قبیلے نے ہمایوں کے فوجی کیمپ پر چھا پہ مارا تو یہ نسخہ گم ہو گیا تھا لیکن جلد ہی مل گیا تھا۔

دو شاعروں کا دلچسپ واقعہ

عہد ہمایوں میں علمائے دین کے علاوہ متعدد شعرائے کرام بھی تھے جو اپنے نچے و نچے کے شاعر ہونے کے ساتھ مروجہ علوم میں بھی ماہر کا مل تھے۔ ان میں سے دو شاعروں کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ یہ شاعر تھے، شیخ زین الدین خاں وقائی اور شیخ ابوالواحد فارسی۔ دونوں بابر کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے اور علم و فضل کی مختلف اصناف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ زین الدین وقائی کے بارے میں ملا عبدالقادر بلوچی لکھتے ہیں کہ بابر نے ان کو پورے ہندوستان کا صدر الصدور بنا دیا تھا۔ تمام اصنافِ نظم و نثر میں انھیں مہارت حاصل تھی، خاص طور سے فنِ معما گوئی، تاریخ اور بدیہ گوئی میں عدیم المثال تھے۔ اگرچہ میں جہنا کے کنارے ایک مسجد اور مدرسہ ان کی یادگار تھا۔ جب یہ پہلی مرتبہ بابر کے پاس آئے تو بادشاہ نے پوچھا، ”تمہاری عمر کیا ہے؟“ فی البدیہہ جواب دیا۔ ”بس پانچ برس پہلے ”چمل سالہ“ تھا اور اب ”چمل سالہ“ ہوں اور دو برس بعد ”چمل سال“ پورے ہوں گے۔

اسی زمانے کے دوسرے شاعر ابوالواحد فارسی تھے۔ یہ درویش مزاج اور شیریں کلام

شاعر تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی، دونوں اکٹھے ہندوستان آئے اور باہر سے وابستہ ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں نے ایک ہی سال۔ ۹۴۰ھ میں۔ یکے بعد دیگرے وفات پائی اور ایک ہی جگہ مقبرہ شیخ زین الدین و قافی میں ان کی تدفین ہوئی۔ بدلتی نے لکھا ہے جب یہ دونوں ہندوستان آنے کے ارادے سے سفر کر رہے تھے تو اتنے فلاش تھے کہ ان کے پاس سولے ایک پرانی پوسٹین کے کچھ بھی نہ تھا۔ ہرات سے کابل پہنچے تو قافی نے فارسی سے کہا، میں پوسٹین فروخت کرنے بازار جاتا ہوں لیکن بشرط یہ ہے کہ تم وہاں آکر مسخرہ پن نہ کرنا۔ انھوں نے بشرط قبول تو کر لی مگر اس پر عمل نہ کر سکے۔ وہ بازار میں قافی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ایک شخص سے پوسٹین کا سودا ہونے لگا تو خریدار اتنی قیمت دینے پر آمادہ نہ ہوا، جتنی وہ مانگتے تھے۔ وہ صرف پانچ اشرفیاں دیتا تھا۔ قافی زیادہ مانگتے تھے۔ مالک اور خریدار کے درمیان جھگڑا دیکھ کر قافی سے نہ رہا گیا۔ وہ اجنبی کی طرح وہاں پہنچے اور دونوں کے درمیان دلالی کے فرائض انجام دینے لگے۔ گاہک زیادہ قیمت لگانے پر آمادہ نہ ہوا اور بات لمبی ہو گئی، تو فارسی پوسٹین ہاتھ میں پکڑ کر گاہک سے مخاطب ہوتے ہوئے بے انصاف، پوسٹین کے اس ایک ایک ٹکڑے میں پانچ پانچ اشرفی کے نو فقط لپیٹو اور جو بیس ہیں۔ بیس نہ کر گاہک چلتا بنا اور پوسٹین قافی کے ہاتھ میں پکڑی رہ گئی۔ قافی کو سخت غصہ آیا اور بگڑ کر فارسی سے کہا۔ ہم تو ایک ایک روٹی تک کے محتاج ہیں اور تم اس حالت میں بھی مسخرہ پن سے باز نہیں آتے۔

اس طرح کے اور بھی کئی دلچسپ واقعات تاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں۔

وفات

۷ ربیع الاول ۹۶۳ ہجری کو ہم ایوں اس کتب خانہ کی چھت پر گیا، جو دہلی کے قلعہ دین پناہ میں قائم کیا گیا تھا۔ مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد چھت سے نیچے اتر رہا تھا کہ کان میں اذان کی آواز پڑی۔ اذان کے احترام میں وہیں سیرٹھیوں میں بیٹھ گیا۔ اٹھنے لگا تو عصا اچٹ گیا۔ اچانک بادشاہ کا پاؤں پھسلا اور وہ سیرٹھیوں پر سے

پھسلتا ہوا زمین پر آگیا۔ اس ضرب سے خاصی چوٹیں آئیں، کچھ افاقہ ہوا تو شیخ جولی کو پنجاب میں شہزادہ اکبر کے پاس روانہ کیا اور اس کو اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی۔ چوٹیں شدید تھیں، بادشاہ ان سے جاں بزنہ ہو سکا اور حادثہ سے سات روز بعد، ۱۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو اس دنیا سے فانی سے آنکھیں پھیر لیں اور عالم جاودانی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہمایوں نے اکبر کو ۱۷ برس عمر پائی اور چھپٹیس سال سے زائد عرصہ فراتض حکمرانی انجام دے دیے۔

ہمایوں کی وفات کے بعد جلال الدین اکبر نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ اگر اللہ کو منظور ہوا اور حالات نے موافقت کی تو اکبر کے حالات اس کتاب کی چوتھی جلد کے مقدمہ میں تحریر کیے جاتے گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کیوں کہ اکبر کا عہد اقتدار گیارہویں صدی ہجری ہے۔

سلاطینِ گجرات

اس وقت ہم اس عہد کے ہندوستان کے حالات پر طہہ رہے ہیں، جبکہ وہ حکمرانی کے اعتبار سے کئی حصوں میں بٹا ہوا ہے اور اس میں متعدد مضبوط علاقائی حکومتیں قائم ہیں۔ ان میں ایک حکومت علاقہ گجرات کی ہے۔ اس کا پایہ تخت احمد آباد تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جن سلاطین نے ان میں داؤد حکمرانی دی، ان میں سلطان محمود بیگہ کا نام خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔

سلطان محمود بیگہ
سلطان محمود بیگہ کا ماہ شعبان ۸۶۳ھ میں تختِ گجرات پر متمکن ہوا۔ اس وقت

۳۵۵ بابر، شیر شاہ سوری، سلیم شاہ اور ہمایوں سے متعلق تفصیلی واقعات کے لیے دیکھیے توذکِ بابر، ہمایوں نامہ، منتخب التواریخ، طبقاتِ اکبری، تاریخ فرشتہ، آثارِ جمعی اور زیارۃ التواریخ وغیرہ کے متعلقہ ابواب۔

اس کی عمر صرف تیرہ سال دو ماہ تین روز تھی۔ اس کو ”بیگرہ“ کے تسمیہ سے موسوم کرنے کی دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہندی زبان میں بیگرہ اس بیل کو کہتے ہیں، جس کے سر پر باتیں اور دانتیں جانب دو بڑے بڑے سینگ ہوں۔ چونکہ بیل کے سینگوں کی طرح اس کی بڑی بڑی موٹھیں تھیں، اس لیے وہ بیگرہ مشہور ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندی میں ”بے“ کے معنی ”دو“ اور ”گرہ“ کے معنی ”قلعہ“ کے ہیں۔ اس نے جو ناگڑھ اور چانپانیر کے دو قلعے فتح کیے تھے جو آج تک مضبوطی کے لحاظ سے اس دور کے ہندوستان کے مشہور قلعے تھے۔ لہذا اسے ”بیگرہ“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اپنے اوصاف و اطوار کی وجہ سے سلطان محمود بیگرہ سرزمین گجرات کا ایک عالی مرتبت حکمران تھا۔ ارض گجرات متعدد سلاطین کا پایہ تخت رہی مگر اس سے قبل یا بعد اس قسم کا کوئی حکمران اس کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ داد و عدل، نیکی و دین داری، رعایا پروری و غریب نوازی، شان و شکوہ، فتح و کامرانی اور شجاعت و بہادرت میں گجرات کا کوئی سلطان اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ اس عہد میں ہندوستان کے دیگر علاقوں اور خراسان میں بھی جو سلاطین داد و حکمرانی دیتے تھے، وہ ان ہی اوصاف و کمالات سے متصف تھے، جن سے محمود بیگرہ متصف تھا۔ تخت خراسان پر حسین مرزا متمکن تھا اور اس کی مسند وزارت پر میر علی شیر فائز تھا اور سند ملانی و شاعری مولانا جامی کے قبضے میں تھی۔ حکومتِ دہلی کی زمام اقتدار سلطان سکندر لودھی کے ہاتھ میں تھی اور کاروبار و ولایت روشن فکر عالم دین میاں بہوہ انجام دیتے تھے۔ اورنگ مانڈو پر سلطان غیاث الدین بن محمود خلجی سرفراز تھا۔ دکن کی بساط سلطنت سلطان محمود بھمنی کے دستِ بلند ہمت میں تھی۔

سلطان بیگرہ کے بارے میں مرآتِ سکندری کا مصنف رقم طراز ہے :

می تو ال گفت کہ روح سلطان محمود غازی بعد از چندین سال بر روح سلطان

محمود بیگہر تاجلی کردہ بود کہ ہمہ افعال و اعمال سلطنت مشابہت و مضارعت بال شہریار
غزوت آثار داشت۔^{۱۳۶}

کہا جا سکتا ہے کہ کچھ مدت بعد غازی سلطان محمود غزنوی کی روح سلطان محمود
بیگہر کی روح میں منتقل ہو گئی تھی، کیوں کہ اس کی سلطنت کے افعال و اطوار اسی جنگجو
اور بہادر سلطان کے مشابہ تھے۔

یہ محمود غزنوی کی طرح بت شکن اور شرک دشمن بادشاہ تھا۔ شرک کی حمایت اور
اسلام کی مخالفت ہرگز برداشت نہ کرتا تھا۔

سلطان محمود بیگہر نے اپنی سلطنت میں بہترین اصلاحات نافذ کیں اور ہر موقع
پر رعایا کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ اس کا حکم تھا کہ امرائے حکومت اور سپاہ میں سے جو
شخص درجہ شہادت سے بہرہ ور ہو جائے یا طبعی موت مرحلے اس کی جاگیر اس کے بیٹے
لے کے حوالے کر دی جائے۔ اگر بیٹا نہ ہو تو آدھی جاگیر بیٹی کو دی جائے۔ اگر بیٹی نہ ہو تو اس کے
دیگر متعلقین کے سپرد کر دی جائے تاکہ ان کے لیے یہ وجہ کفالت اور ذریعہ معاش ثابت
ہو، اور ان لوگوں کو روزگار کی کوئی شکایت باقی نہ رہے۔

رعایا میں مال و دولت کی تقسیم میں محمود بیگہر بڑا وسیع القلب تھا۔ کسی شخص نے
ایک امیر کے بیٹے کے متعلق کہا کہ وہ اپنی عادات کے لحاظ سے اس قابل نہیں کہ اسے مال و
دولت سے نوازا جائے۔ سلطان نے فوراً جواب دیا۔ دولت اس میں خودیہ عادت
پیدا کر دے گی کہ وہ اس کے قابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دور حکومت میں
کوئی شخص غربت یا ناداری کا شکار نہ تھا۔ ہر امیر کئی کئی پرگنوں کا مالک تھا، عام
لوگ بھی آسائش و راحت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ رعیت میں دولت و ثروت کو
عام کرنے کی اس نے جو پالیسی اختیار کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر زمین گجرات اس دن
امان کا گنوارہ بن گئی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کا وجود ختم ہو گیا اور جرائم پیشہ لوگ ترکاڑے

۱۳۶

سے توبہ کر کے سلطان کے مطیع و فرماں بردار ہو گئے۔ معذوروں اور ایسا بھجوں کی گزرا وقتاً کے لیے وظائف مقرر تھے۔ لوگوں کی سکونت کے لیے سرکاری خرچ سے مکان اور رابط تعمیر کیے گئے، مسافروں کے لیے سرائیں بنائی گئیں، تعلیم کے لیے ہر ہر گاؤں میں مدرس قائم کیے گئے، اور عبادت و نماز کے لیے عالی شان مسجدیں معرض تعمیر میں لائی گئیں۔ بے روزگاروں اور بے کاروں کو ان کی قابلیت کے مطابق کام پتعیں کیا جاتا تھا۔ ظلم و تعدی کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا اور پورے ملک میں عدل و انصاف کا بول بالا تھا، غلام ملتا تھا اور ہر چیز ارزاں نرخ پر مہیا ہوتی تھی۔ بعض چیزیں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔

محمود بیگرہ کی فوجی طاقت بے حد مضبوط تھی اور ہر معرکے میں فتح یاب ہوتی تھی سپاہیوں کو زیادہ سے زیادہ رعایت دی جاتی تھی۔ اس نئے اپنے عمال کے نام فرمان جاری کر رکھا تھا کہ کسی سپاہی کو پریشان نہ کیا جائے اور ان کی ضروریات کے حصول میں کسی قسم کی روکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ فوجیوں کو حکم تھا کہ ان کو قرض کی ضرورت ہو تو سود پر قرض نہ لیں۔

حکم کردہ بود کہ بیچ کس از لشکر یاں من قرض بر باگیرد، خزانیچہ علاحدہ مقرر کردہ بود کہ از سپاہی ہر کس کہ بقرض حاجت داشتہ باشد باو بدہد و بوعده بگیرد انان حبت رہا خورن حال سبگ داشتند بلکہ ایشان را از سبگ کمتر می انگاشتند، می فرمود، اگر مسلمانان قرض بر باخورند از دست ایشان غزا چگونہ آید۔ از برکت حسن نیت و خلوص عمل او حق تعالی ہمیشہ ظفر در رکاب و نصرت ہم عنان می داشت بخند

اس نے حکم جاری کر دیا تھا کہ میرے فوجیوں میں سے کوئی شخص سود پر قرض نہ لے۔ اس کے لیے علیحدہ خزانیچہ مقرر تھا کہ فوج میں سے جس شخص کو بھی قرض کی ضرورت ہو، اسے دے دیا جائے۔ اور وعدہ لیتا تھا کہ اس طرح کے سود خواروں کو وہ کتے کی حیثیت

دیں گے، بلکہ کتنے سے بھی ذلیل گردانیں گے۔ کہا کرتا تھا اگر سُود پر قرض لے کر رکھا جائے تو جہاد کے فرائض کس طرح انجام دیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے حسن نیت کی برکت اور خلوص عمل سے اللہ نے اسے ہمیشہ فتح و ظفر سے نوازا اور نصرتِ الہی ہر موقع پر اس کے ہم عنان رہی۔

محمود بیگہ رعیت کا اس درجہ خیر خواہ تھا کہ اس نے گجرات کے شہروں میں لوگوں کے لیے راستوں میں سایہ دار اور پھل دار درخت لگائے۔ بکثرت کنوئیں کھدوا کر پانی کا وافر انتظام کیا، تصبات و دیہات میں تعمیر مکانات کے لیے لوگوں میں سرکاری زمین تقسیم کی اور زراعت کے لیے بھی حسبِ ضرورت اراضی عطا کی۔ شاہ راہیں اس قدر کشادہ اور صاف ستھری تھیں کہ گرد و غبار کا نشان تک نہ تھا اور مسافروں پر کسی قسم کے آہٹا سفر ظاہر نہ ہونے لگے۔

یوں تو سرزمینِ گجرات کا یہ فرماں روا حیاتِ مستعار کے ہر دور میں یادِ الہی میں مصروف رہا اور اس کی زندگی کے اکثر لمحات ذکرِ خداوندی میں بسر ہوئے، مگر آخری دنوں میں تو اس نے اللہ کی طاعت و عبادت کے لیے اپنے آپ کو بالکل وقف کر دیا تھا اور اس درجہ رقیق القلب ہو گیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر اللہ کے ڈر سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جانے لگے۔ ایک مرتبہ سلطان کی اس کیفیت کو دیکھ کر ملک سارنگ عرف قوم الملک نے عرض کیا ”مرتبہ بادشاہت پر فائز ہونے کے باوجود اور درجہ شہنشاہیت پر فرائز ہونے کے باوصف، یہ گریہ کیوں ہے اور یہ خوف و زاری کس وجہ سے آپ پر طاری ہے؟“ فرمایا ”اے بے عقل۔! میں تجھے اس کا کیا جواب دوں۔ میری تمنا ہے کہ کہیں کانوں میں یہ آواز پڑ جائے کہ ”عاقبتِ محمود، محمود خواہد بود“ سفرِ عمر جاری ہے اور گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا ہے۔ اسی لیے آنکھوں سے آنسو بہتا اور دل پر حسرت رکھتا ہوں۔ افسوس ہے، میں نے اللہ کی قدر اس طرح نہیں جانی جس طرح جاننا چاہیے اور جس طرح جانی اس پر عمل نہیں کیا۔“

فقہائے ہند جلد سوم

سلطان، علمائے دین اور فقہائے کرام سے بہت تعلق و مودت رکھتا تھا، وہ اگرچہ علوم مروجہ کا زیادہ عالم نہ تھا مگر علما کی صحبت اور فضلا کی مصاحبت سے بے شمار مسائل دینی، اشعار، تاریخی واقعات اسے حفظ ہو گئے تھے اور جب وہ مجلس میں دینی مسائل پر بات کرتا تو اس پر عالم و فقیہ کا گمان ہوتا تھا۔ می دانستند کہ سلطان عالم و فقیہ است۔ اس لیے کہ وہ اپنی قوتِ طبع اور ذکاوت پر فہم کی بنا پر ذقین اور گمراہ علمی نکات بیان کرتا تھا۔^{۱۰۹}

بہر حال سلطان محمود بیگہ بہت سے اوصاف کا حامل تھا۔ علاقہ گجرات کا یہ نہایت بہادر، فاتح اور مجاہد بادشاہ تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سلطنتِ گجرات میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ اس نے ہند کے غیر مسلم حکمرانوں کو کئی بار شکست دی اور ان کے بہت سے علاقوں پر اپنا پرچم اُتار لیا لیکن اس موقع پر ہم اس کی زندگی کے اس پہلو کو بیان نہیں کرنا چاہتے۔ اس وقت ہمارا مقصد صرف اس کے دینی و علمی اور اسلامی و اخلاقی گوشوں کی اختصار کے ساتھ نشان دہی کرنا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ علمائے دین سے یہ سلطان کس درجہ تو دور و محبت رکھتا تھا۔

علمی لحاظ سے اس کا زمانہ بڑا زرخیز تھا اور عرب و عجم کے متعدد چوٹی کے اہل علم اور مشہور اصحابِ حدیث گجرات میں آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے، جن میں علامہ جلال الدین محمد بن محمد مالکی مصری خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں سلطان نے ان کی بڑی تکریم کی اور ان کو اپنی قلمرو میں وصولی جزیرہ کے محاکمہ پر متعین کیا۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے انھیں ملک المحدثین کے لقب سے سرفراز کیا۔ بلاوہ ہند کے یہ پہلے محدث ہیں جنھیں یہ لقب عطا کیا گیا۔ ان کے علاوہ علامہ محمد بن محمد بن محمد الباجی اور علامہ ابوالقاسم بن احمد محمد شافعی المعروف بہ ابن فہر بھی دیار ہند میں تشریف لائے۔ علامہ ابن فہر شیخ الباری کا ایک نسخہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے

۱۰۹ مرآت سکندری ص ۱۰۹

جو ان کے والد اور عمِ محترم کے ہاتھ کا مکتوبہ تھا۔ پھر علامہ ہبنتہ اللہ بن عطار اللہ شیرازی اور علما کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس دور میں قصدِ ہند کیا۔ سلطان محمود بیگہ کے لیے کئی اہل علم نے کتابیں تصنیف کیں مثلاً عبد الکریم بن عطار اللہ شیرازی نے طبقات محمود شاہی اور شمس الدین محمد شیرازی نے آثار محمود شاہی لکھی۔ شیخ یوسف بن احمد بن عثمان حسینی نے منظر الانسان کے نام سے تاریخ ابن خلکان کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

اس زمانے میں گجرات کے محکمہ قضا پر قاضی نجم الدین فائز تھے جن کے عدلیہ انصاف کی شہرت دورِ دوزخ پھیل گئی تھی اور جو قضا کے سلسلے میں قطعاً کسی کی رعایت نہ کرتے تھے۔

سلطان بیگہ کی زندگی کے بہت سے واقعات کتب تاریخ میں مرقوم ہیں لیکن تنگ دامانی صفحات ان کے تذکرہ سے مانع ہے۔ گجرات کے اس نامور سلطان نے ۲ رمضان المبارک ۹۱۷ھ کو وفات پائی۔ پچیس برس حکومت کی اور ۶۹ سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔

سلطان مظفر حلیم

سلطان مظفر حلیم، سلطان محمود بیگہ کا بیٹا تھا، ۲۰ شوال ۸۷۵ھ کو پیدا ہوا۔ اس نے سلطنت و حکومت کی گود اور علم و فضل کے ماحول میں تربیت حاصل کی۔ اپنے دور کے مشاہیر اساتذہ فن سے تعلیم حاصل کی، جن میں علامہ مجد الدین محمد بن محمد الایچی اور مشہور محدث شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک حمیری حضرمی المعروف ببحرق کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ شیخ بحرق کے سامنے حصولِ علمِ حدیث کے لیے زانوئے تلمذ نہ کیا۔ مظفر حلیم دسویں صدی ہجری کے گجرات کا والی تخت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا محدث و فقیہ، اپنے مرتبے کا عالم اور حافظِ قرآن حکیم تھا۔ علاوہ ازیں نیک، رحم دل اور سپکیر جو دستِ سخا تھا۔ اپنے والد سلطان محمود بیگہ کی وفات کے بعد ۳ رمضان ۹۱۷ھ کو تختِ گجرات کا وارث بنا۔ اس نے اکرام

فقہائے ہند جلد سوم

علماء تعظیم فقہاء تحفظ حدود و مملکت، جہاد فی سبیل اللہ، عدل و انصاف اور جودت و سخاوت کو اپنے لیے فرض ٹھہرا لیا تھا۔ فنونِ حرب، طریقِ جنگ و جہاد اور تیر اندازی و شمشیر زنی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ انتہائی تقویٰ شعار، عزیمت و عفو کا کامل نمونہ، لوگوں سے درگزر کرنے میں بے مثال، خطا کاروں کی خطا معاف کرنے میں فراخ حوصلہ بلند کردار سلیم الطبع، عبادت گزار اور بہترین شاہ سوار تھا۔ اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ منجھا ہوا خطاطا و خوش خط تھا۔ اقسام کتابت میں سے نسخ، ثلث اور رقاع پر عبور رکھتا تھا۔ قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ بھیجتا تھا۔ قول و فعل میں انتہائی سنت کا متبع اور عامل احادیث نبویؐ تھا۔ علمائے دین کی بے حد تعظیم کرتا تھا۔ ابتدا میں اسے مشائخ و صوفیاء سے محسن ظن نہ تھا لیکن بعد کو طبیعت کا رخ بدل گیا تھا اور ان کو لائق تعظیم گرداننے لگا تھا۔ موت کو یاد کر کے اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

ہمیشہ با وضو رہتا، نماز با جماعت ادا کرتا اور رمضان کے روزے پابندی سے رکھتا تھا، مے نوشی سے سخت نفرت تھی، اسراف و تبذیر اور فضول خرچی سے ہر حال میں دامن بچانا اور کسی معاملے میں جائز حدود سے قدم آگے نہ بڑھاتا تھا۔ رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا۔ عام طور پر پچیس بدل کر کبھی دن اور کبھی رات کو بازاروں اور گلیوں کے چکر لگاتا تھا۔ تاریخ کے مطالعہ کا شائق تھا اور گزشتہ دور کے ملوک و سلاطین کے کوائف و واقعات دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ مختصر یہ کہ اوصاف گونا گوں کی بنا پر سلطان مظفر حلیم اپنے اسلاف و اقران سے سبقت لے گیا تھا۔ اس کی زندگی کے بہت سے واقعات، تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ جانپانیر کے قاضی کی عدالت میں گھوڑوں کے ایک تاجر نے بادشاہ کے خلاف یہ استغاثہ دائر کیا کہ بادشاہ نے اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہے، اس سے گھوڑے خریدے پہلے مگر ان کی قیمت ادائیگی، بذریعہ عدالت بادشاہ سے ان کی قیمت دلائی جائے۔ قاضی نے اپنا فرستادہ بھیج کر

بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ وہ ملزم کی حیثیت سے عدالت میں آیا اور آدابِ بجا لاکر قاضی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اب مدعی اور مدعا علیہ دونوں قاضی کی عدالت میں کھڑے ہیں۔ قاضی نے مدعا علیہ بادشاہ کو حکم دیا کہ عدالت کے آداب کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے، عدالت میں نہ اسے بیٹھنے کی اجازت ہے اور نہ زیادہ اونچی آواز سے بات کرنے کی۔ قاضی نے مدعی تاجر اور مدعا علیہ بادشاہ کا بیان لیا، تو تاجر کا دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔ تاجر نے اسی وقت قاضی کی عدالت میں رقم لینے کا مطالبہ کیا اور قاضی سے عرض کی، جب تک پوری رقم ادا نہیں کر دی جاتی بادشاہ کو عدالت سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ بادشاہ کو مجبوراً اسی وقت رقم تاجر کو ادا کرنا پڑی۔ حسابِ صاف ہو گیا تو قاضی نے تاجر سے سوال کیا ”رقم پوری مل گئی یا کچھ باقی رہ گئی ہے۔“ تاجر نے جواب دیا۔ ”مل گئی ہے۔“ اب قاضی اپنی جگہ سے اٹھا اور بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے قاضی کا ہاتھ پکڑ کر کسی پر بٹھایا۔ خود دوسری کرسی پر اس کے برابر بیٹھا، صحیح فیصلہ کرنے پر اس کی تعریف کی اور کہا، یہ آپ کے لیے امتحان کا وقت تھا، اگر آپ میرے لحاظ میں آکر مدعا مننت کر جاتے تو میں اس منصب سے آپ کو علیحدہ کر کے کسی بہتر شخص کو اس پر متعین کر دیتا۔ میری دعا ہے، اللہ آپ کو اس حق گوئی کا بہتر صلہ عطا فرمائے۔ عمدہ قضا پر آپ ہی جیسے شخص کو متمکن ہونا چاہیے۔ قاضی نے کہا، بادشاہ بہت بھی آپ ہی جیسے اونچے کردار کے آدمی کو زیب دیتی ہے۔

سلطان مظفر حلیم نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حجاج کے لیے رباط بنایا، اور اس میں مدرسہ قائم کیا، جس کے اخراجات وہ خود ادا کرتا تھا۔

سرسزمینِ گجرات کا یہ سلطان عابد و زاہد اور مستجاب الدعوات تھا۔ ایک مرتبہ اس کے عہد۔ ۹۳۱ھ۔ میں گجرات میں شدید قحط پڑا اور لوگ سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ بادشاہ نے صدقہ و خیرات کیا اور لوگوں کو ساتھ لے کر نماز استسفا کے لیے باہر نکلا۔ نہایت عجز و انکساری اور خشوع و خضوع کے ساتھ دعا

کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اس کی دعا کے آخری الفاظ یہ تھے:

اللہم انی عبدک ولا امدک لنفسی شنیئاً فان تک ذنوبی حسبت
القطر عن خلقک فہا ناصیتی بیدک فاغثنا یا ارحم الراحمین۔

اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، میں اپنے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر میرے
گناہوں کی وجہ سے تو نے بارش کو اپنی مخلوق سے روک لیا ہے، تو میرے یہ پیشانی کے
بال تیرے ہاتھ میں ہیں۔ اے ارحم الراحمین! ہم پر بارش برسا۔

یہ الفاظ کئے اور پیشانی زمین پر رکھ دی، سجدہ میں گر پڑے اور بار بار یا ارحم الراحمین
کے الفاظ زبان سے ادا کرنے لگا۔ پھر زمین سے سر نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ ہوا چلنا
شروع ہوتی، آسمان پر بادل نمودار ہوئے اور گرج چمک کے ساتھ مینہ برسنے
لگا۔ اب اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر بارش
میں بھیکتا اور صدقہ و خیرات کرتا ہوا، عام لوگوں کے ساتھ گھر آیا۔

سلطان مظفر حلیم کے اس قسم کے متعدد واقعات کتب تاریخ میں منقول
ہیں۔ اس پر زرمی اور حلیمییت اس درجہ غالب تھی کہ لفظ ”حلم“، اس کے نام کا
مستقل جز بن گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اپنے دیگر فرائض سلطانی سے
محروم تھا اور محض ایک نیک اور متحمل مزاج حکمران تھا۔ یہ گجرات کا نہایت
باہمت، فاتح، صاحب تدبیر اور شجاع بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں مملکت
گجرات کی حدود میں بڑی وسعت ہوئی اور متعدد علاقے اور مضبوط قلعے مفتوح
ہوئے۔ لیکن اس موقع پر اس کی زندگی کے اس پہلو کی تفصیل میں جانا مقصود
نہیں، صرف اس کے علمی گوشوں کی وضاحت اور علم و علما سے تعلقات اور روابط
کی نشان دہی پیش نگاہ ہے۔

سلطان باقاعدہ عالم دین تھا، حصول علم کا اس درجہ شائق تھا کہ ایام سلطانی
میں اساتذہ حدیث سے صحاح ستہ کا درس لیا اور یہ کہتا میں سبقاً سبقاً پڑھیں کتب
تفاسیر میں سے تفسیر معالم التنزیل زبیر طالعہ رہتی حصول علم کے بارے میں اس کی

تگ و تاز کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

روزے تفسیر معالم التنزیل مطالعہ می فرمود۔ گفت کہ من در ایام بادشاہی نسبت
بایام شاہ زادگی تحصیل بیشتر کردم۔ صحاح سنہ را در ایام سلطانی خواندم۔ الحال نصف تفسیر
معالم التنزیل مطالعہ کردم و امید دارم کہ نصف دیگر در بہشت خوانم بیکہ
ایک دن وہ تفسیر معالم التنزیل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کہا میں نے زمانہ بادشاہی میں نسبت
زمانہ شاہ زادگی کے زیادہ علم حاصل کیا ہے۔ صحاح سنہ کی تکمیل زمانہ بادشاہی میں کی ہے۔ اب
تک نصف معالم التنزیل پڑھ چکا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ نصف باقی جنت میں پڑھوں گا۔

وفات

مظفر حلیم کی وفات جمعہ کے روز ہوتی۔ سورج طلوع چکا تو وضو کر کے دو رکعت نماز
پڑھی۔ نماز کے بعد محل سرا میں جانے لگا تو قدم لڑکھڑا گئے۔ طبیعت پلے سے خراب
تھی۔ اب اور نقاہت طاری ہو گئی۔ مسنورات رونے لگیں تو انھیں صبر کی تلقین کی۔
اتنے میں ایک مصاحب خاص اسد الملک راجہ محمد حسین آیا۔ اس کے لیے علم و عمل کی
دعا کی اور کہا، تم نے میری بڑی خدمت کی ہے، اس کا بدلہ تو تمہیں اللہ ہی دے گا، اب
آخری خدمت بیکر و کہ وفات کے وقت میرے پاس حاضر رہو، اور سورۃ یٰسین پڑھو۔
مجھے غسل اپنے ہاتھ سے دینا۔ اس کے بعد راجہ مدوح کے لیے دعائے خیر کی۔ اتنے
میں اذان کی آواز کان میں پڑھی تو پوچھا، اذان وقت پر ہو رہی ہے؟ اسد الملک نے
جواب دیا، یہ جمعہ کی اذان ہے اور ان لوگوں کے لیے ہے جو نماز میں حاضر ہونے کی طاقت
رکھتے ہیں۔ سلطان نے کہا، ظہر کی نماز تو میں تمہارے پاس پڑھوں گا، لیکن عصر کی نماز
ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے اللہ کے پاس جنت میں ادا کروں گا۔ یہ کہہ کر لوگوں کو نماز جمعہ کے
لیے مسجد میں بھیج دیا اور خود گھر میں نماز ظہر پڑھی اور بصورت دعا یہ آیت تلاوت کی :

رَبِّ قَدْ اَسْئَلْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَ اَسْئَلْتَنِي مِنَ تَاْوِيلِ الْاَحَادِيثِ فَاطِرَ

۲۰۶، ۲۰۵ صرّاتِ سکندری ص ۲۰۶

فقہائے ہند جلد سوم

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قَدْ أَنْتَ وَلِيٌّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝ (سورۃ یوسف : ۱۰۱)

اے میرے پروردگار! تو نے مجھے سلطنت کا بڑا حصہ عطا فرمایا، اور مجھے خواہوں کی تعبیر کا علم سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھ کو پوری فرماں برداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا تو اور مجھ کو نیک بندوں میں شامل کجیو۔

اس کے بعد صلیب سے اٹھا اور چار پائی پر لپیٹ گیا۔ قبلہ رخ ہو کر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس عادل و عالم بادشاہ نے پندرہ سال آٹھ مہینے حکومت کرنے کے بعد ۲ جمادی الاولیٰ ۹۳۲ھ کو وفات پائی۔

بہادر شاہ

دسویں صدی ہجری کے سلاطین گجرات میں سلطان بہادر شاہ کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ یہ سلطان مظفر کالڑ کا تھا۔ عید الفطر کے دن ۹۳۲ھ کو تختِ گجرات پر متمکن ہوا۔ تنہو و شجاعنت، تدبیر و سیاست، فہم و فراست اور سخاوت و معدلت گستری میں اپنے اسلاف کا صحیح نمونہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنتِ گجرات کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، اس میں کئی نئے علاقے اور نئے شہر داخل ہوئے، جن میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکہ جاری کیا گیا۔ پھر یہ تماشا بھی چشمِ فلک نے اسی کے عہد میں دیکھا کہ ۹۴۲ھ میں ہمایوں نے گجرات کا قصد کیا اور اس پر حملہ کر کے بعض علاقوں میں سلطان کو شکست دی۔

سلطان بہادر شاہ کو تپنگا پوں نے بندر دیو میں ۳ رمضان ۹۴۳ھ کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا۔ اس وقت سلطان تنہا تھا، کوئی دوسرا اس کے ساتھ نہ تھا، ایک

۱۴۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مرآتِ سکندری ص ۳۷ تا ۵۳۳۔ تاریخ فرشتہ

ج ۲ ص ۳۱۳ تا ۳۲۲۔

پرتگالی مریض کی عیادت کے بہانے سے اس کو وہاں بلا لیا گیا، ندیموں اور مصاحبوں نے ہر چند جانے سے روکا اور پرتگالیوں کی نیت پر شبہے کا اظہار کیا مگر سلطان نے کوئی پروا نہ کی اور ساتھیوں کے روکنے کے باوجود کشتی میں سوار ہو کر بندر دیو کا عزم کیا اور مرتبہ شہادت سے سرفراز ہوا۔ بہادر شاہ بیس سال کی عمر میں تختِ گجرات پر بیٹھا۔ گیارہ سال حکومت کی، اکتیس برس کی عمر میں درجہ شہادت حاصل کیا۔ سلطنتِ گجرات کا آخری بادشاہ محمود بن لطیف تھا، اس نے اوائل ربیع الاول ۹۴۲ھ کو گجرات کا چتر شاہی اس وقت سر پر رکھا، جب حکومت کی بنیادیں ٹل چکی تھیں اور مغلوں نے ارضِ گجرات کو اپنے شدید حملوں کا نشانہ بنا لیا تھا۔ سلطان محمود کو اوائل ربیع الاول ۹۶۱ھ میں قتل کیا گیا اور اس کی موت کے ساتھ ہی گجرات کا ڈیڑھ سو سالہ دورِ حکومت ختم ہو گیا۔ اب گجرات دوبارہ تختِ دہلی کے ماتحت آ گیا اور اس پر مغلوں کا پرچم اُفتار لہرانے لگا۔

نویں صدی ہجری کے سلاطینِ گجرات نے علم و علما کی جو خدمات انجام دیں اس کا ذکر فقہائے ہند کی دوسری جلد کے مقدمہ میں کیا جا چکا ہے اور جو واقعاتِ علمیہ دسویں صدی ہجری کے عہد میں رونما ہوئے، ان کا تذکرہ اختصار کے ساتھ ان سطور میں پیش کر دیا گیا ہے۔

سلاطینِ سندھ

برصغیر میں علاقہ سندھ کو باب الاسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نواح میں یہ وہ خطہ ارض ہے، جہاں پہلے پہل اسلام کے قدم چھے اور اس ملک میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے پھیلاؤ کے لیے فضا ہموار ہوئی۔ قدیم دور کے برصغیر میں سندھ اور ہند دو الگ الگ ملک تھے اور سندھ کو اسلامی علوم کے مرکز کی حیثیت حاصل

۲۲ تفصیلات کے لیے دیکھیے مرآتِ سکندریہ ص ۲۵۸ تا ۳۲۸۔

تھی۔ ہم اس موقع پر اپنے موضوع کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہتے مختصر الفاظ میں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دسویں صدی ہجری کے سندھ کی علمی حیثیت کیا تھی اور اس کے کون کون حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و مودت رکھتے تھے۔

شاہی بیگ

دسویں صدی ہجری کے سندھی ملوک و سلاطین میں تاریخ ہمیں ایک بہت بڑے فاضل، عالم دین اور منصف حکمران سے متعارف کراتی ہے، جس کا نام شاہی بیگ بن ذی النون ارغون قندھاری ہے۔ شاہی بیگ دراصل قندھار کا بادشاہ تھا جو اپنے باپ ذی النون کی وفات کے بعد تختِ قندھار کا وارث بنا تھا۔ اس کا اسلوبِ زندگی دیگر حکمرانوں سے بہت حد تک مختلف تھا، یہ علم و فضل کا پیکر اور تدبیر و صالحیت کا مرقع تھا۔

شاہی بیگ کا شامیانہ اقتدار عرصہ تک سرزمینِ قندھار پر تزار ہا پھر ۹۱۳ھ میں مغل حکمران بابر نے قندھار پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ شاہی بیگ نے بابر سے شکست کھا کر سندھ کا رخ کیا اور اس علاقے کو فتح کر کے اپنے تسلط میں لے لیا۔ شاہی بیگ عالم دین اور معقولات و منقولات کا ماہر بادشاہ تھا، اور کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ اس نے متعدد فنی و علمی کتابوں پر حواشی و تعلیقات بھی لکھیں، جن میں شرح کا فیہ، تعلیقات علی شرح المطالع، سید شریف کی شرح سراجیہ پر تعلیقات جو علم میراث کے موضوع سے متعلق ہے، خاص طور سے مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر کتب و رسائل پر بھی بہت سے حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیے۔

سندھ کے اس ذی علم اور صاحبِ تصنیفات حکمران نے ۲۸ شعبان ۹۲۸ ہجری کو بھکر میں وفات پائی اور عارضی طور پر اسے وہیں دفن کیا گیا۔ بعد ازاں اس کی میت مکہ مکرمہ منتقل کی گئی اور قبرستانِ معلیٰ میں اس کی تدفین

عمل میں آئی۔

اس کے عہد کے علمائے کرام اور فقہائے عظام کے حالات کتاب کے آئندہ اوراق میں مذکور ہیں۔

مرزا شاہ حسین

مرزا شاہ حسین ۸۷۶ھ میں پیدا ہوا اور اپنے باپ شاہی بیگ کی وفات کے بعد ۹۲۸ھ کو حکومت سندھ کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ اس نے محمدِ علم و فضل میں پرورش پائی اور سلطنت و حکمرانی کے ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ابتدائے عمر ہی میں اسے اس عہد کے جلیل علمائے کرام کے سلسلہ تلمذ میں داخل کر دیا گیا تھا، جن میں مولانا الدین لاری اور شیخ یونس سمرقندی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ ایک مدت تک یہ ان مشاہیر اساتذہ کرام کی ملازمت و صحبت میں رہا، اور مختلف علوم و فنون میں ممتاز پیدا کی۔ یہ اس دور کے سندھ کا وہ بادشاہ تھا جس کے علم و فضل اور تحقیق و تفحص کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

زمانہ طالب علمی میں یہ اپنے درس کے مضامین کو باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لانے کا عادی تھا اور یہ مضامین کسی اجزا میں پھیل گئے تھے۔ تاریخ معصومی کے مصنف سید معصوم کا بیان ہے کہ انھوں نے بلوچستان میں وہاں کے قاضی کے پاس ان مسودات کو دیکھا تھا وہ دس اجزا پر مشتمل تھے۔

مرزا شاہ حسین بڑا عادل و کریم اور محبتِ اہل علم و ادب باپِ اشراف تھا۔ ان سے اس کی طویل صحبتیں رہیں، انتہائی عزت و احترام سے پیش آتا، ان کی علمی مجلسوں سے مستفید ہوتا، امورِ عمر میں ان سے مشورے لیتا، شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں آگے قدم بڑھاتا اور

۴۳ تفصیلات کے لیے دیکھیے معاصرِ زمینی ج ۱ ص ۲۸۴ تا ۲۹۶۔ تاریخ فرشتہ

ج ۲ ص ۵۱۳، ۵۱۴۔

انھیں صلوات و جوائز سے نوازنا تھا۔

اس کے بعد حکومت کا یہ واقعہ کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ ۹۲۷ھ میں ایک عالم دین قاضی شکر اللہ قندھار سے سندھ کے ایک شہر ٹھٹھہ تشریف لے گئے۔ سندھ میں ان دنوں سلطان شاہی بیگ داد حکمرانی دیتا تھا۔ اس نے ان کی قابلیت اور گونا گوں صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو ٹھٹھہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ اس منصب کی نازک اور اہم ذمہ داریوں کو انھوں نے وقار و احترام اور دبدر و وطنطنہ کے ساتھ انجام دیا۔ شاہی بیگ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مرزا شاہ حسین وارث تخت ہوا۔ ایک مرتبہ اس نے بعض تاجروں سے چند گھوڑے خرید کیے اور ان کی قیمت ادا کرنے سے عمدتاً تساہل و تاخیر سے کام لیا۔ تاجروں نے ناامید ہو کر قاضی شکر اللہ سے رجوع کیا اور ان کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہوئے۔ قاضی موصوف نے مدعا علیہ کی حیثیت سے بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ وہ عدالت میں حاضر ہوا تو اسے مدعی تاجروں کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ دعویٰ پیش ہوا۔ قاضی کے سوال پر مدعا علیہ بادشاہ نے تاجروں کے موقف کی تصدیق کی اور قیمت نہ ادا کرنے کا اقرار کیا۔ قاضی نے تاجروں کے حق میں فیصلہ دیا اور سلطان نے تاجروں کو قیمت ادا کر دی۔ فیصلے کے بعد قاضی شکر اللہ اپنی مسند سے اٹھے، قاعدہ کے آداب سلطانی بجالائے اور سلطان کو اپنے پاس بٹھایا۔ اب بادشاہ نے تلوار نکالی جو اس نے قبا میں چھپا رکھی تھی اور اسے قاضی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ”یہ تلوار میں نے آپ کے لیے رکھی تھی۔ اگر آپ صحیح فیصلہ نہ کرتے اور میرے لحاظ میں اپنے مقام و منصب کی ذمہ داریوں کا خیال نہ رکھتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اڑا دیتا۔“ قاضی شکر اللہ نے بھی بادشاہ کی یہ بات سن کر مسند کے نیچے سے برہنہ تلوار نکال کر بادشاہ کو دکھائی اور کہا: ”میں نے بھی یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ مبادا بادشاہ خلاف شریعت قدم اٹھائے اور کوئی شخص اسے ٹوکنے کی جرأت نہ کرے تو میں خود اس تلوار سے سب سے پہلے شہر عی بجالاؤں گا۔“

اس کے بعد سلطان اس فیصلے پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے عدالت سے باہر نکل گیا۔ اس نے صرف اس بنا پر ناجروں کو قیمت ادا کرنے میں تساہل سے کام لیا تھا کہ وہ قاضی موصوف کو اپنے بارے میں آزمانا چاہتا تھا اور اسے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ قاضی صحیح فیصلہ کرنا ہے یا نہیں۔ یہ اس واقعے سے کچھ عرصہ بعد قاضی شکر اللہ منصبِ قضا سے الگ ہو گئے تھے اور سب امور سے منقطع ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔^{۴۲}

مرزا شاہ حسین نے اربع الاول ۹۶۲ھ کو وفات پائی۔ اس کی میت مکہ مکرمہ منتقل کی گئی اور اپنے باپ کے پہلو میں اسے دفن کیا گیا۔ اس نے چھبیس سال عمر پائی اور چونتیس برس حکومت کی۔
اس کے عہدِ حکومت کے فقہائے کرام کا تذکرہ کتاب کے آئندہ صفحات میں ملے گا۔

جام نظام الدین

نظام الدین نندہ بن پامینہ بن اتر بن صلاح الدین بن تاجی۔ یہ سنہ ۷۰۰ھ کے قبیلہ سمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی نے اپنے رسالہ ریاض الرضوان میں آثار عبد العزیز آصف خاں کے ضمن میں اس کا سلسلہ نسب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچایا ہے۔ آصف خاں کی روایت سے یہ بھی لکھا ہے کہ جام نظام الدین نندہ مخزومی تھا اور قبیلہ بنی مخزوم کا فرد تھا۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ اسی برصغیر کا نوجار تھا اور قبیلہ سمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بہر حال وہ نسباً کوئی بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ دسویں صدی ہجری کے سندھ کا نہایت عادل و منصف عالم و فاضل، رحمدل، خدا ترس، رعایا پرور، نرم خو اور نیک فطرت بادشاہ تھا۔ اس نے ۵ ربيع الاول

^{۴۲} تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ معصومی ص ۹۵ تا ۲۷۱۔ تاریخ فرشتہ ج ۲، ص

۵۱۲، ۵۱۵۔ آثار جمعی ج ۲، ص ۲۹۷ تا ۳۲۲

فہمائے ہند جلد سوم

۸۷۶ھ کو سندھ کی تمام حکومت ہاتھ میں لی اور اڑتالیس سال تک برسرِ اقتدار رہا۔ خود عالم تھا اور اہل علم سے شفقتاً نہ مرا سم رکھتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے دو اصحابِ علم مہا جیوں — شمس الدین اور میر معین الدین — کو علامہ جلال الدین دقانی کی خدمت میں مختلف تحائف دے کر شہزادہ بھیجا اور انہیں سندھ تشریف لانے کے لیے عرض کیا یہیں ان کے پہنچنے سے قبل دقانی وفات پا چکے تھے۔ جام نظام الدین کی نیکی اور مسلمانوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمان حکمرانوں سے لڑائی کو سخت ناپسند کرتا تھا اور اپنے گھوڑے کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتا تھا، اللہ ہمیں لڑائی کے لیے تبریٰ پٹیچہ پر سوار ہونے سے بچائے، کیوں کہ ہمارے ملک کی سرحدیں مسلمانوں سے ملی ہوئی ہیں۔ آخر ہم کس سے برسرِ پیکار ہوں گے۔ بہر کیف جام نظام اللہ نندہ سندھ کا ایک بہت ہی متمقی، متورخ اور نیک کردار بادشاہ تھا۔ اس کے عصر کو تاریخ میں احسن الاعصار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے عہد کو بہترین عہد کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے زمانے کے علما و فقہا کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ سندھ کے اس بلند اطوار بادشاہ نے ۹۱۴ھ کو وفات پائی۔

کشمیر

سرزمین برصغیر کا یہ سرسبز و شاداب خطہ جسے وادی کشمیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اسلام کی نشر و اشاعت کے اعتبار سے اٹھویں صدی ہجری سے قبل تقریباً بنجر تھا۔ اس میں شاہ مرزا بن طاہر خراسانی نے اسلام کی شمع روشن کی، جو ۱۵۷ھ کو کشمیر آئے اور ایک ہندو راجہ کے حلقہ ملازمت میں داخل ہو گئے۔ بہت تھوڑے عرصے میں یہ حکومت کشمیر کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو گئے اور پھر اپنے اثر و رسوخ اور مقبولیت کی وجہ سے تختِ شاہی پر قبضہ کر لیا۔ ان کا پوتا سلطان سکندر سلاطین کشمیر میں سب سے

زیادہ طاقت و راہب اثر حکمران تھا۔ اس کے لڑکے سلطان زین العابدین (۸۲۷ھ تا ۸۷۷ھ) نے پچاس سال تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ دور اس خاندان کی حکومت کا انتہائی عروج کا دور تھا۔ اس بلند بہت بادشاہ نے کسی شہر آباد کیے۔ آدورفت کے لیے پل تعمیر کیے اور نئے قلعے بنائے۔ اس کا دارالسلطنت سری نگر تھا، اس کی توسیع و ترقی کی طرف اس نے خاص طور پر توجہ مبذول کی۔ اس خاندان کی حکومت کا سلسلہ ۹۹۵ھ تک چلا، جبکہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اس کو فتح کر کے اپنی حدود مملکت میں شامل کر لیا۔

کشمیر کے پہلے قابل ذکر عالم دین اور نامور مصنف و مبلغ امیر کبیر سید علی ہمدانی (۷۸۶ھ) تھے۔ یہ اصلاً ہمدان کے باشندے تھے، وہاں سے ہجرت کر کے کشمیر آئے اور پھر مستقل طور پر یہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ان کے فرزند سید محمد بھی اچھے عالم اور مصنف تھے۔ ان کے بعد دسویں صدی ہجری کے علمائے کرام میں مولانا رنی الدین کشمیری (متوفی ۹۵۶ھ) اور مفتی فیروز کشمیری (متوفی ۹۷۷ھ) کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس عہد کے کشمیری علما و فقہا کا تذکرہ فارین محترم کتاب کے آئندہ اوراق میں پڑھیں گے۔

سلطنت مالوہ

ارض ہند میں علم و فضل کے نشرو ذیوع کے سلسلے میں مالوہ کی سلطنت کا ذکر بھی کتب تاریخ میں نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ یہ سلطنت ۸۰۴ھ میں عالم وجود میں آئی۔ اور ۹۷۹ھ تک قائم رہی۔ اس اثنا میں یکے بعد دیگرے متعدد حکمران اس کے تخت پر جاوہ افرور ہوئے، جن میں سے بعض نے علم و ادب کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بالخصوص سلطان محمود نے اپنے عہد حکومت میں علما کی بڑی پذیرائی کی اور علم کی خدمت کو اپنی زندگی کا ضروری جز قرار دیا۔ دسویں صدی ہجری میں ارض مالوہ میں جن علمائے کرام کے نقوش علمی اُجاگر ہوئے، ان میں چندیری کے مولانا شاہ احمد

فہمائے ہند جلد سوم

شرعی کا اسم گرامی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ ثبت رہے گا، جو عالم دین انقیسہ،
کثیر العبادت اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ان کے حالات میں یہ واقعہ مرقوم
ہے کہ ایک مرتبہ تفسیر کشاف کے نامور مصنف زرخشری نے جو مسلکاً معتزلی تھے،
اہل سنت پر طعن کرتے ہوئے یہ دو شعر کہے:

وجماعة سموا هواه سنة وجماعة حمر لحمى مؤلفه

قد شبهوا بخلقة فتخوفوا شنع الورى فتستورا بالبلکفة

مولانا شاہ احمد شرعی نے اسی وزن اور قافیہ میں اس کا جواب ان دو شعروں

میں دیا:

عجبا القوم ظالمین تلقبوا بالعدل ما فیہم لعمری معرفة

قد جاءهم من حيث لا یدرؤہ تعطیل ذات اللہ مع نفی الصفة

شاہ احمد شرعی نے ۹۲۸ھ کو وفات پائی ۱۰۲۸ھ

دکن کی سلطنتیں

سلطان محمد بن تغلق کی وفات کے بعد ہندوستان کی مرکزی حکومت میں کمزوری
و ضحکمال کے آثار پیدا ہو گئے تھے، بلکہ دکن کی بہمنی سلطنت تو اس کی زندگی ہی
میں عالم وجود میں آگئی تھی اور بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ سلطان مذکور نے اس کو
باقاعدہ تسلیم بھی کر لیا تھا۔ بہمنی سلطنت رو بزوال ہوئی تو علاقہ دکن میں چھوٹی بڑی
پانچ سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں، جن میں تین سلطنتیں اپنے اوصاف و خصوصیات کی
بنا پر بڑی اہم تھیں، اور وہ تھیں، بیجاپور کی عادل شاہی، گولکنڈہ کی قطب شاہی
اور احمد نگر کی نظام شاہی سلطنتیں۔ ان سلطنتوں میں علم و تحقیق کے میدان میں

۱۵۶۶ء تا ۱۵۶۷ء اور ۱۵۶۸ء تا ۱۵۶۹ء — تذکرہ علمائے ہند ص ۸۲ — نزهة الخواطر ج ۲

ص ۱۳۳، ۱۳۴

بڑی وسعت پیدا ہوئی اور متعدد علمائے کرام نے مختلف علوم و فنون پر کتا میں تصنیف کیں۔ مدارس جاری کیے اور تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ تفصیل کا یہ محل نہیں، اختصار کے ساتھ ہم ان حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کی خدمت علمی کا ذکر کریں گے۔

عادل شاہی سلطنت

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت، اگرچہ ہندوستان کی علاقائی سلطنت تھی لیکن بڑی مضبوط اور مستحکم سلطنت تھی۔

یوسف شاہ

عادل شاہی خاندان کا پہلا حکمران یوسف شاہ تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً ترکی کے عثمانی خاندان کا فرد تھا اور سلطان مراد بن بایزید یلدرم (متوفی ۱۴۵۴ء) کا بیٹا تھا۔ سلطان مراد کے بعد ترکی کی عثمان حکومت اس کے بیٹے سلطان محمد فاتح نے اپنے ہاتھ میں لی تو یوسف کو اپنے اس بڑے بھائی سے جان کا خطرہ پیدا ہو گیا اور وہ اس کے ڈر سے ترک وطن پر مجبور ہو گیا۔ ترکی سے بھاگ کر پہلے وہ ساوہ کے مقام پر گیا۔ بعد ازاں داخل ہند ہوا۔ یہاں آ کر اس نے احمد آباد میں سکونت اختیار کی۔ پھر حالات نے اس کی موافقت کی اور اسے بیجاپور کا والی مقرر کر دیا گیا۔ پانچ سال وہ اس منصب پر تعین رہا منقول ہے کہ ۸۹۶ھ کو محمود شاہ بہمنی کے ایام حکومت میں اس نے سلطنت بہمنیہ کے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا اور بالآخر بیجاپور میں عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے وہاں کا مستقل بادشاہ بن گیا۔ یہ شیعی المسلمک تھا۔ ۹۰۸ھ کو اس نے بیجاپور میں بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھا۔ ملوک بہمنیہ میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے اپنے ملک میں ائمہ اثنا عشرہ کے نام کا خطبہ پڑھا اور اس مذہب کی ترویج کی۔ یہ عادل، کریم النفس، حلیم الطبع اور عالم و ذی فضل حکمران تھا۔ علما کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اچھا شاعر بھی تھا۔ یہ شعر اسی کے ہیں:

فہرست ہند جلد سوم

آن کس کہ علم را بہ نیک نامی گزاشت
در مزاج دہر تخم بنکونی کا شست
نیکو ان زندۂ جاوید اند
مرد آنکہ بگرد و نام نگو نگزاشت
بیجا پور کے عادل شاہی خاندان کا یہ پہلا حکمران تھا۔ اس نے ۹۱۷ھ کو
وفات پائی۔

علی عادل شاہ

عادل شاہی حکمرانوں میں ایک حکمران علی عادل شاہ تھا، جو خود بھی صاحب
علم تھا اور علمائے کرام کا بھی بدرجہٴ غایت قدر دان تھا۔ علم نحو، منطق، فلسفہ
حکمت اور علم کلام کا ماہر تھا۔ ان علوم کی تحصیل اس نے اپنے دور کے مشہور فضلا،
خواجہ عنایت اللہ شیرازی اور امیر فتح اللہ شیرازی سے کی تھی۔ خطِ نسخ، خطِ ثلث
اور خطِ رقع میں ہمارت تامہ رکھتا تھا۔ شعر و انشا، فنِ حرب اور علومِ سیاسیہ میں
درجہٴ کمال پر فائز تھا۔ یہ ۹۶۵ھ میں بیجا پور کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے خمد
حکومت میں بیجا پور کو مدینۃ العلم کی حیثیت حاصل تھی۔

علی عادل بھی مسلکِ شیعہ تھا لیکن علم و علما کی تعظیم و تکریم میں بڑا سہ لقلب
تھا۔ اس کے زمانے میں حدودِ مملکت میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور اس نے متعدد
مستحق تلعے اور کئی شہر فتح کیے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھی بارہ ائمہ کے نام کا خطبہ
پڑھا جاتا تھا۔ شیعہ علما کو اس کے نزدیک بالخصوص تقرب حاصل تھا اور اس کی
سلطنت میں شیعہ مذہب کی بڑی ترویج ہوئی۔ اس عالم و فاضل بادشاہ نے ۹۳۳ھ
سال حکومت کر کے ۲۳ صفر ۹۸۰ھ کو وفات پائی۔

سلطنتِ قطب شاہیہ

علاقہ دکن میں سلطنتِ قطب شاہیہ کا آغاز اس طرح ہوا کہ عراق کے شاہی
خاندان کا ایک شخص قلی نامی سلطان محمود شاہ بہمنی کے زمانے میں الرضِ دکن میں
وارد ہوا۔ یہ شخص دراصل شاہِ عراق میرزا جہان شاہ مقتول کا نواسہ تھا اور اس

کی جائے ولادت ہمدان بقی سلطان محمود شاہ بہمنی کے غلاموں میں ترک غلاموں کو بڑی عزت اور اہمیت حاصل تھی۔ اس نے قلی کو ان ہی غلاموں کی سلک میں منسلک کر لیا۔ یہ شخص غلہ حساب کا ماہر تھا اور خطِ سیاق کی کتابت میں عبور رکھتا تھا، لہذا سلطانی حرم کے محلات کا مشترک مقرر ہوا۔ شاہی خاندان کی مشورہ اس کے حسنِ اخلاق اور امانت و دیانت سے بہت خوش تھیں۔ اتفاق سے حرم شاہی کی جاگیروں کے بعض منتظمین کی طرف سے جو علاقہ تنگ میں واقع تھیں پڑھکا پھینکا شروع ہوئیں کہ وہاں چوروں اور رہزنیوں کی بہت بڑی تعداد نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے اور منتظمین جاگیر اور عام رعایا ان سے سخت پریشان ہے۔ سلطان نے ان کی سرکوبی کے لیے کچھ لوگوں کو بھیجنا چاہا تو قلی نے اپنی خدمات پیش کیں اور رہزنیوں کی سرکوبی کا وعدہ کیا۔ چنانچہ سلطان نے اس کی درخواست منظور کر کے ایک لشکر کا سپہ سالار بنا کر اس کو وہاں بھیجا۔ اس نے چند ہی روز میں قطاعِ طریق اور رہزنیوں سے پورے علاقے کو صاف کر دیا اور سرکشوں کا نام و نشان باقی نہ چھوڑا۔ سلطان نے خوش ہو کر اس کو کئی دیہات اور بلدہ گولکٹ طہ بطور جاگیر عطا کیے اور قطب الملکی کے خطاب سے نوازا۔ یہ مدت تک اس نواح میں سپہ سالار کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ اس دور میں اس کو مختلف فرمانوں اور تحریروں میں صاحب القلم والسیف لکھا جاتا تھا۔

بعد کو جب سلطان محمود شاہ بہمنی کی سلطنت میں کمزوری کے آثار نمودار ہوئے تو اس علاقے میں ۹۱۸ھ کو اس نے خود اپنی حکومت قائم کر لی اور قطب شاہ کے نام سے سربر آرائے سلطنت ہوا۔ اس مملکت کے اہم مناصب پر اس نے اپنے عزیزوں اور بھائیوں کو فائز کیا اور سلطان محمود شاہ بہمنی سے بھی تعلقات قائم رکھے۔ اس کی خدمت میں شاہی رسم و رواج کے مطابق تحائف و ہدایا پیش کیے اور اپنی وفاداری کا یقین دلا یا۔ اس نے بھی بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کیا اور اثنا عشری مذہب اختیار کیا۔

فقہائے ہندوستان

قطب شاہ نے بہمنی سلاطین سے تو گھرے اور مخلصانہ تعلقات قائم کیے مگر مختلف حکومتموں اور فرماں رواؤں کی طرف سے اس کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، جن کو معرضِ تحریر میں لانا ہمارے مضمون سے خارج ہے۔ تاہم مجموعی طور پر اس کا دورِ حکومت علما و فقہاء کے لیے اطمینان بخش تھا۔ اس کے عہد میں جہاں مملکت کی حدیں وسیع ہوئیں وہاں علوم و فنون نے بھی ارتقا کی منزلیں طے کیں۔

قطب شاہ نے خاصی لمبی عمر پائی۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ جمشید، حیدر اور ابراہیم۔ جمشید بھی کافی عمر کو پہنچ گیا تھا اور تمنا تے بادشاہی میں داخل ہو گیا۔ اس نے ایک ترک غلام کو باپ کے قتل پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ دریا کے کنارے بیٹھا تھا کہ جمشید کے ترک غلام نے تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ جمشید نے جو یاں ہی کھڑا تھا، شمشیر آب دار سے اس غلام کا بھی خاتمہ کر دیا تاکہ کسی وقت باپ کے قتل کا راز فاش نہ ہو سکے۔ قطب شاہ کا اس طرح قتل ۹۵۰ھ کو پیش آیا اور اس نے تینتیس سال حکومت کی۔

جمشید قطب

سلطان قلی قطب کے بعد اس کا بیٹا جمشید قطب شاہ دکن کی گولکنڈہ سلطنت کے تحت حکومت پر متمکن ہوا۔ یہ بھی مذہباً شیعہ تھا۔ اس کے عہد کا یہ واقعہ قابلِ بیان ہے کہ اس زمانے میں ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ کے درمیان بعض معاملات میں جھگڑا چل رہا تھا۔ جمشید قطب شاہ اس سلسلے میں برہان نظام شاہ کا حامی تھا۔ وہ اس کی مدد کے لیے فوج لے کر روانہ بھی ہوا مگر اس اثنا میں برہان نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کے درمیان مصالحت ہو گئی تھی۔

اس صلح سے قطب شاہ خوش نہ تھا، اس نے برہان نظام شاہ سے اس کا اظہار کیا اور اس کی طرف جانے کے لیے غارم سفر ہوا، مگر اس کی سلطنت کے ایک عالم دین

علاء محمود نے اس کو اس سفر سے روکا اور ان خطرات سے آگاہ کیا، جن کے پیش آنے کا انھیں یقین تھا، قطب شاہ کو اس پر غصہ آگیا اور اس نے جویش غضب میں علاء محمود کی ناک کاٹ ڈالی۔ اب قطب شاہ وہاں پہنچا تو اس کی مخالفت میں ہنگامہ بپا ہو گیا اور تلوار سے قطب شاہ کا چہرہ، ناک اور گلا زخمی ہو گئے، جس کی وجہ سے اس کو اکل و شرب میں سخت دشواری پیش آتی تھی اور وہ کسی کے سامنے کوئی چیز تناول نہ کرتا تھا۔

اس حادثہ کے بعد وہ علاء محمود سے طالبِ عفو ہوا اور انھیں اپنے دربار میں تشریف لانے کی دعوت دی مگر انھوں نے آنے سے معذرت کر دی۔ شدتِ مرض سے جمشید نہایت بد مزاج اور بد اخلاق ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو بیل میں ڈال دیتا اور موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ اس نے سات سال حکومت کر کے ۹۵۷ھ میں بعارضہ تپِ دق وفات پائی۔

سلطان ابراہیم قطب شاہ

جمشید کے بعد اس کا بھائی ابراہیم قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بھی مذہباً شیعہ تھا۔ بڑا عقل مند و فہیم، مدبر اور سخی تھا، لیکن قہر و غضب کا عنصر اس کے مزاج پر غالب تھا۔ ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ تازیانہ کی ضرب سے مخالف کے پاؤں کے ناخن انگلیوں سے علیحدہ کر کے برتن میں رکھ کر اس کے سامنے لائے جائیں تو اسے اطمینان ہوگا۔

اس کے عہد میں راستوں اور جنگلوں میں ڈاکوؤں اور چوروں کی بڑی کثرت ہو گئی تھی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کا طریق احتساب و حفاظت اس انماز کا تھا کہ سوداگر اور تاجر ان سے بالکل محفوظ تھے اور بلا کسی خوف اور خطرے کے دن رات محو سفر رہتے تھے۔

ابراہیم قطب شاہ نے بتیس سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد ۹۸۹ھ کو وفات پائی۔

سلطنتِ نظامِ شاہیہ

نظامِ شاہیہ سلطنت کی ابتداء نظام الملک بھری سے ہوئی۔ اس کے تحت حکومت پر بھی دسویں صدی ہجری میں کئی نیک دل اور علم پرورد بادشاہ متمکن ہوئے، جن کے عہد میں علما کی بڑی قدر دانی ہوئی اور علوم و فنون کے نشرو اشاعت میں اضافہ ہوا۔

سلطنتِ ملتان

بہ صغیر کی دسویں صدی ہجری کی علاقائی سلطنتوں میں ایک سلطنت ملتان کی تھی۔ ملتان، اقلیمِ بصریہ کا وہ خطہ ارض ہے جو اسلام کے ابتدائی عہد ہی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی ضو افشانیوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ ہمیشہ اسلام کی نامور اور اہم شخصیتوں کا مسکن رہا اور اس کی گود میں جلیل القدر علما و فقہا اور مشائخ کرام نے نشوونما پائی اور پھر آگے چل کر ان کی خدمات گونا گوں کا دائرہ انتہائی وسعت پذیر ہوا۔ ملتان شہر کے علاوہ اس کے گرد و نواح اور مناسقات میں بھی بہت سے جلیل القدر علمائے کرام پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں تصنیف کیں اور اپنی مساعی علم کی بنا پر شاہانِ عصر کے دربار میں بھی بے پناہ عزت و توقیر کے مستحق قرار پائے اور عوام میں بھی بدرجہ غایت لائق تعظیم گردانے گئے۔ ان کے اسمائے گرامی تاریخ کی کتابوں اور تذکرہوں میں نمایاں الفاظ کے ساتھ مرقوم ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

ملتان کی سرزمین حکومت و فرماں روائی کے اعتبار سے بھی خاص اہمیت کی حامل ہے اور علم و فضل کے لحاظ سے بھی انتہائی زرخیز ہے۔ یہ علاقہ کسی قسم کے انقلاباً دیکھ کر چکا ہے اور بہت سی علمی و فقہی کاوشوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے حکمرانوں میں شیخ یوسف قریشی کا نام بھی تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے، یہ وہ بزرگ ہیں کہ جب

لنگاہ خاندان کے تسلط کے بعد ملتان سے نکل کر دہلی پہنچے تو سلطان بہلول لودھی نے نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور اپنی بیٹی ان کے بیٹے شیخ عبداللہ کے عقد میں دے دی تاکہ برصغیر کے اس بلند مرتبت خاندان سے اس کا رشتہ و تعلق پیدا ہو۔

حسین لنگاہ

ملتان پر لنگاہ خاندان کے حکمرانوں میں قطب الدین لنگاہ کا بیٹا شاہ حسین لنگاہ ایک صاحبِ عزم و ہمت بادشاہ تھا۔ قابلیت، مستعدی، نیکی اور خداترسی میں ممتاز تھا، علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ تھا۔ اس کے ایام حکومت میں علوم و فنون کی ترقی کی نئی راہیں کھلیں اور اس کے دربار میں علما و فضلا کی بے حد قدر دانی ہوئی۔ اس کے وقت کا بڑا حصہ اصحابِ علم کی مجلسوں میں بسر ہوتا تھا۔ یہ صلح کل بادشاہ تھا۔ سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان سکندر لودھی دہلی کے تخت پر متمکن ہوا تو حسین لنگاہ نے اس کو باپ کی تعزیت کا پیغام بھیجا اور ساتھ ہی تختِ حکومت پر فائز ہونے کی مبارک باد پیش کی۔ شاہی رسوم کے مطابق شائف و ہدایا بھی ارسال کیے۔ سلطان سکندر لودھی نے بھی اس کے فرستادوں کی بے حد تکریم کی اور ان کو شاہانہ خلعت عطا کر کے اکرام و تعظیم کے ساتھ رخصت کیا۔

حسین لنگاہ نے بادشاہِ گجرات سلطان مظفر حلیم کے ساتھ بھی سلسلہٴ مراسلت جاری کیا اور اس کی خدمت میں اپنے ایک عالمِ دین قاضی محمد احمد کو مختلف تحائف دے کر بھیجا۔ سلطان مظفر حلیم بھی دلی ملتان کے ایلیچی سے انتہائی احترام کے ساتھ پیش آیا۔ بہر حال ملتان کا یہ حکمران بہت سی خصوصیات کا مالک تھا، اس نے چونتیس سال، ایک روایت کے مطابق تیس سال حکومت کر کے ۹۰۴ھ یا ۹۰۸ھ کو وفات پائی۔

ان سلطنتوں کے علاوہ خاندان اور برہان پور کی علاقائی سلطنتیں بھی خدمتِ علم

فقہائے ہند جلد سوم

میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں، ان کے بھی بعض حکمران علما و فقہاء سے قلبی تعلق رکھتے تھے اور ان کی تعظیم و تکریم میں پیش پیش رہتے تھے، لیکن ان کے واقعات کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ یہ سب کوائف کتبِ تاریخ میں وضاحت کے ساتھ مرقوم ہیں۔

سلطنتِ بنگال

سرزمینِ برصغیر کی علاقائی سلطنتوں میں بنگال کی سلطنت بھی ایک مضبوط اور طاقت ور بااختیار سلطنت تھی۔ اس کے بعض حکمرانوں کے عہد میں بہت سے علما و فقہائے علوم و فنون کی خدمت کی اور مختلف مقامات پر درس و تدریس کا غلغلہ بلند کیا۔ اس نواح میں دسویں صدی ہجری کے جن حکمرانوں نے علوم کی ترویج کی اور علمائے کرام کو خدماتِ دینیہ انجام دینے کے مواقع فراہم کیے ان میں سید شریف مکی جو سلطان علاء الدین کے نام سے تختِ بنگال پر متمکن ہوا، خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اس بادشاہ نے سنائیکس سال تک ارضِ بنگال پر حکومت کی اور ۱۲۷۷ء کو وفات پائی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان نصیب شاہ نے باپ کی جگہ لی۔ یہ بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلا، لیکن زندگی کے آخری دور میں فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا سال وفات ۱۲۷۳ء ہے۔

ایک وضاحت

ان علاقائی سلطنتوں کے بارے میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ سیاسی اعتبار سے ان کے حکمران ایک دوسرے سے شدید اختلافات رکھتے تھے اور بسا اوقات نوبت جنگ و جدال تک بھی پہنچ جاتی تھی، لیکن علمائے دین،

۱۷۷۷ء سلطنتِ کشمیر، سلطنتِ مالوہ، دکن کی علاقائی سلطنتوں، سلطنتِ ملتان اور سلطنتِ بنگال کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ فرشتہ جلد ۲ کے متعلقہ ابواب۔

فقہائے کرام اور مشائخ عظام کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ آزادانہ طور پر خدماتِ علمی انجام دیتے اور متحارب و متخالف ملکوں میں پوری آزادی سے سفر کرتے اور آمد و رفت رکھتے تھے۔ ہر ملک کے تشنگانِ علوم اور اصحابِ علم حضرات بلا کسی روک ٹوک کے ایک دوسرے سے ملتے اور استفادہ و استفانہ کرتے تھے۔ یعنی حکمران آپس میں متضاد محاذوں پر کھڑے نظر آتے تھے، اور علمائے کرام کو ہر سلطنت کے حدود میں آنے جانے، قیام پذیر ہونے اور استفادہ و افادہ کے مواقع میسر تھے۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

یہ فقہائے ہند کی تیسری جلد ہے جو خواندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں بنگلہ دیش سمیت برصغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے دو سو باؤن علما و فقہاء کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات کے حالات بہت کم ملے ہیں اور بعض کے کچھ زیادہ۔ اجموواد میسر آیا وہ سفحیتِ قرطاس پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی میں عاجز راقم السطور کو جو محنت کرنا پڑی اور حوالوں کی تلاش و جستجو میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اصحابِ علم اس ضمن کے تمام پہلوؤں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

مقدمہ کتاب میں برصغیر کے ان ملوک و سلاطین کا ذکر آپ کے مطالعہ میں آچکا، جو دسویں صدی ہجری میں اس خطہٴ ارض میں دادِ حکمرانی دیتے رہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے دور کے علما و فقہاء سے ان کے مراسم و تعلقات کس نوعیت کے تھے اور ان کے دل میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ اس سلسلے میں اگرچہ بے حد اختصار سے کام لینے اور ہر قدم پر تمام کے لحاظ کو کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم کہیں کہیں واقعات کے تفاسیر سے متعلقہ اہلِ قدرے تفصیل کی حدود تک بھی پہنچ

فقہائے ہند جلد سوم

گیا ہے، جس پر ہم قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں۔
 اس کتاب میں قابل احترام قارئین کو اگر کوئی اچھی بات نظر آئے تو اسے محض
 اللہ کا فضل قرار دیں اور اگر کسی مقام پر لغزش کا احساس ہو تو مرہانی فرما کر اس
 سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی اصلاح کر دی جائے۔
 اس کے بعد اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی تو آئندہ سال ان شاء اللہ اس سلسلے
 کی چوتھی جلد پیش کی جائے گی جو گیارہویں صدی ہجری کے علما و فقہاء کے حالات پر
 مشتمل ہوگی۔

یہ عاجز چودھویں صدی ہجری تک کے فقہائے برصغیر کے حالات معرض تحریر میں
 لانے کا خواہاں ہے اور اس کی تکمیل کے لیے اللہ کے فضل اور قارئین محترم کی مخلصانہ
 دعاؤں کا متمنی ہے۔

رب ايسر ولا تعسر دتمم بالخير۔۔۔ اللہم دروہ قنا لہ التحی و ترمہ۔

بندۂ عاجز
 محمد اسحاق بھٹی

۲۲ جون ۱۹۷۶ء

۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دسویں صدی ہجری الف

۱۔ سید ابراہیم بن احمد بغدادی

سید ابراہیم بن احمد بن حسن شریف حسنی جیلانی بغدادی، عالم کبیر اور شیخ وقت تھے۔ اپنے دادا حسن شریف سے اخذ علم کیا، جن کا سلسلہ سند و اجازہ شیخ عبدالقادر جیلانی تک منتہی ہوتا ہے۔ والد بزرگ وار شیخ احمد بغدادی کی زندگی میں وارد ہند ہوئے اور عرصہ تک برصغیر کے مختلف بلاد و امصار کی سیاحت کرتے رہے۔ پھر کاپی میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں ان کی علمی شہرت پھیلی تو طلبا کی بہت بڑی تعداد ان کے گرد جمع ہوئی اور درس و تدریس اور افادہ عوام میں مصروف ہو گئے۔ طلبا ان کے طریق تدریس اور اسلوب تعلیم سے بدرجہ غایت مطمئن اور متاثر تھے۔ زیادہ تر وقت اسی خدمت علم میں صرف ہوتا تھا۔ تفسیر، حدیث اور تصوف کی تدریس میں تو بہت دلچسپی لیتے تفسیر قرآن حکیم کے سلسلے میں عام طور پر معالم التنزیل اور جامع الاصول کا درس دیتے۔ کتب احادیث میں سے صحیح بخاری اور سنن أبوداؤد بڑے شوق اور توجہ سے پڑھاتے تصوف کی کتابوں میں سے عوالم الجنیدی اور ملہمات القادریہ کی طرف خصوصیت سے طلبا کو توجہ دلاتے، اور بے حد انہماک سے ان کے مختلف مقامات کی وضاحت کرتے اور مسائل تصوف میں ڈوب کر اس کی زلف گرہ گیر کو سلجھاتے۔ علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے کسب علم اور اخذ فیض کیا۔ شیخ نظام الدین بن سیف الدین علوی کا کوروی کا اہم گرامی بھی ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں شامل ہے۔

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲، بحوالہ کشف التواری۔

سید ابراہیم بن احمد بغدادی، دسویں صدی ہجری کے بڑے صغیر پاک و ہند کے وہ عالم دین اور فقیہ ہیں، جو تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف وغیرہ علوم مرّوجہ پر عبور رکھتے اور باقاعدہ طلبائے علم کو ان کا درس دیتے تھے۔ مگر ان کی کسی تصنیف کا ہمیں علم نہیں ہو سکا۔

۲۔ شیخ ابراہیم بن جمال الدین سندھی

شیخ مفتی ابراہیم بن جمال الدین سندھی، علم و فضل میں اپنے دور کے ممتاز و منفرد بزرگ تھے۔ ان کا شمار علمائے باعمل اور اصحابِ تقویٰ حضرات میں ہوتا تھا۔ علم فقہ میں عبور و مہارت کا یہ عالم تھا کہ ان کے عصر اور علاقے کا کوئی شخص ان کا حریف نہ تھا۔ مختلف مسائل میں لوگ ان ہی سے استفسار کرتے، اور قصبات سندھ ان ہی کے بیان کردہ مسائل کو معمول بہا ٹھہراتے تھے۔ اس عالم دین نے تمام دنیوی آسائشوں اور راحتوں سے اپنے آپ کو بے نیاز کر لیا تھا۔ لوگوں سے منقطع ہو کر گھر کے گوشہ تنہائی میں بیٹھ جاتے اور علم و عمل سے قلب و دماغ کی غذا مہیا کرتے۔ نہ کبھی مال و دولت جمع کرنے کی کوشش کی اور نہ فقر و فاقہ اور تنگ دستی کے مسلسل اور متواتر حملوں سے بے بس ہو کر کبھی اضطراب و پریشانی کا اظہار کیا۔ ہمیشہ علم و مطالعہ کو اصل ہر ماہی قرار دیا اور اسی پر خوش رہے۔ ایثار و پیشہ اور قانع بزرگ تھے۔ اٹھانوے سال عمر پاکر اس دار الفنا سے دار البقا کو روانہ ہوئے۔ افسوس ہے، ہم ان کی کسی تصنیف کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۳۔ مولانا ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی

مولانا ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی، ابراہیم جامع کے نام سے شہور تھے۔ فضلاء عصر اور علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ملتان میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والد بزرگ و ارشد شیخ فتح اللہ ملتانی سے علم حاصل کیا اور طویل عرصہ تک ان سے فلسفہ

۱۔ تآثر جیمی ج ۲ ص ۳۳۸۔ تاریخ معصومی ص ۳۳۲۔ نرہتہ الخواطر ج ۲ ص ۲۔

ملازم رہے۔ پھر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں ان کے بیٹے سعد اللہ بھی شامل ہیں۔

مولانا ابراہیم جامع کے علم و فضل اور مرتبہ فقہی کو سمجھنے کے لیے فتح ملتان اور اس پر والی سندھ مرزا شاہ حسین ارغون کے حملے کا ذکر ضروری ہے۔ مختصر الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملتان پر جب خاندان لنکاہ داد حکمرانی دیتا تھا تو اس کے ایک حکمران کا نام محمود شاہ لنکاہ تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس خاندان کے اکثر افراد اور لشکر خان نے، جو ان میں خاصے اثر و رسوخ کا مالک تھا، محمود شاہ لنکاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور وہ والی سندھ مرزا شاہ حسین ارغون سے جا ملے، جو ان کا حریف تھا۔ ان لوگوں نے حسین شاہ ارغون کی مدد سے ملتان کے قصبات و دیہات پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سے علاقہ ملتان کے معززین اور سرکردہ لوگوں کو سخت تشویش لاحق ہوئی، وہ گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں شہر ملتان کی طرف روانہ ہوئے اور محمود شاہ کے بیٹے کو، جو طفل صغیر تھا، حسین شاہ لنکاہ کا خطاب دے کر ملتان کے تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ حسین شاہ لنکاہ ہرے نام بادشاہ تھا، حقیقت کاروبار حکومت محمود شاہ لنکاہ کے داماد شیخ شجاع الملک بخاری کے ہاتھ میں تھا۔ وہی امور سلطنت پر قابض تھا اور ملتان کے حالات کو بگاڑنے کا باعث حقیقت وہی تھا۔ مرزا شاہ حسین ارغون نے موقع کو غنیمت جانا، وہ فوج کی ایک خاص تعداد کے ساتھ ملتان کی طرف بڑھا اور بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہو کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ انتہائی سخت تھا اور اس پر ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ باشندگان شہر گھبراٹھے اور شیخ شجاع الملک بخاری کے پاس آئے، اس سے کہا ہمارے پاس جنگی سامان بھی ہے، گھوڑے بھی ہیں اور فوج بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہے، آپ ہمیں منظم کریں اور فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے دشمن کا مقابلہ کرنے کی اجازت دیں، ممکن ہے، اللہ تعالیٰ مدد کرے اور ہمیں فتح حاصل ہو۔ انھوں

نے بھی کہا کہ قلعہ کی حفاظت بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے، جہاں تک ہو سکے ہمیں مقابلہ کرنا چاہیے۔ لیکن شجاع الملک نے دربار میں تو ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا، البتہ علیحدگی میں چند سرداروں اور سرکردہ امیروں کو بلا کر کہا، ابھی شاہ حسین لنگاہ کی حکومت مضبوط نہیں ہوئی اور اس میں قرار و استحکام پیدا نہیں ہوا۔ اگر ہم ان حالات میں جنگ کی عرض سے شہر سے نکلیں گے اور حملہ آور فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان کارزار میں اتریں گے تو خطرہ ہے کہ ہمارے آدمی کثیر تعداد میں مارے جائیں گے اور لوگوں کی اکثریت مرزا شاہ حسین ارغون سے جا ملے گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم چپ چاپ شہر میں بیٹھے رہیں اور حالات کا انتظار کریں۔ مولانا ابوالکلام جامع کے لڑکے جو مولانا سعد اللہ لاہوری کے نام سے موسوم تھے اور افاضل روزگار میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ اہل ملتان کے لیے وہ انتہائی تکلیف اور اضطراب کا وقت تھا اور خود میں بھی ان دنوں ملتان کے قلعے میں محصور تھا۔

مولانا سعد اللہ لاہوری سے منقول ہے کہ مرزا شاہ حسین ارغون کی فوجیں ملتان میں داخل ہو چکی تھیں اور انھوں نے چاروں طرف سے قلعے کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ اس کے تمام دروازے بند تھے، نہ کوئی شخص اندر سے باہر جاسکتا تھا، نہ باہر سے اندر آسکتا تھا اور نہ کسی کو کھانے پینے اور استعمال کی کوئی چیز پہنچ سکتی تھی۔ محاصرہ نے طول پکڑا اور کئی مہینے جاری رہا، جس کی وجہ سے معاملہ فاقہ کشی تک پہنچ گیا اور لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ بلی اور گنا بھی ہاتھ لگتا تو کھا جاتے۔ پھر ایک تکلیف دہ صورت حال یہ پیدا ہو گئی کہ شجاع الملک نے جن تین ہزار افراد کو قلعہ کی حراست و حفاظت پر متعین کیا تھا، انھوں نے شہر میں ٹوٹا کھسوت شروع کر دی، جو شخص قلعے سے باہر نکلتا، اس کو بھی تہ تیغ کر دیا جاتا۔ اس اضطراب اور پریشانی کے عالم میں محصورین قلعے کے اوپر سے کود کود کر خندق میں گرنے لگے۔ اس طرح ایک سال کئی مہینے تک محاصرہ جاری رہا اور ۹۳۲ھ کی ایک شب کو مرزا شاہ حسین ارغون کی فوج قلعے میں داخل ہو گئی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ فتح کے بعد انھوں نے بے شمار لوگوں کو

قتل اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا۔

مولانا سعد اللہ لاہوری بیان کرتے ہیں کہ جب شاہ حسین ارغون کی فوج نے لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کے مال و اسباب لوٹنا شروع کیے تو چند فوجی میرے مکان میں گھس آئے۔

اس وقت میرے والد مولانا ابراہیم جامع گھر میں بیٹھے تھے، وہ پورے پینسٹھ سال اہل بلدان اور اس کے گرد و نواح کو فیض یاب کرتے اور علما و طلباء کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیتے رہے تھے، بدرجہ غایت نیک اور پرہیزگار عالم دین تھے۔ ارغونی فوج نے ان کی بہت اہانت کی، ان کا مال و متاع لوٹ لیا اور گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ بعد ازاں ان کے لڑکے مولانا سعد اللہ کو بھی گرفتار کر کے وزیر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

مولانا سعد اللہ کہتے ہیں، اس وقت وزیر اپنے مکان کے صحن میں لکڑی کے تخت

پر بیٹھا تھا۔ اس کے حکم سے میرے پاؤں میں لوہے کے زنجیر ڈالی گئی، جس کا ایک سرا مضبوطی کے ساتھ، اس کے تخت کے پائے سے باندھ دیا گیا تھا۔ مجھے اپنے والد مولانا ابراہیم جامع کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ البتہ اتنا معلوم تھا کہ وہ گرفتار ہیں اور ارغونی فوج کے قبضے میں ہیں۔ میں انھیں یاد کر کے زار و قطار رو رہا تھا اور فوراً میرے مسلسل میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کچھ دیر بعد وزیر نے قلم دان طلب کیا اور قلم درست کر کے کچھ لکھنا چاہا۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ وضو کر کے لکھے تو بہتر ہے۔ قدرت خداوندی ملاحظہ ہو کہ وہ اٹھا اور وضو کے لیے غسل خانے میں گیا۔ اس وقت وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا، اپنی جگہ سے اٹھا اور لکھنے کے لیے جو کاغذ اس نے تیار کیا تھا، اس پر قصیدہ بردہ کا بیسٹھ لکھ دیا:

فما لعینیک ان قلت الکفاہمتا وما یقلک ان قلت استفق لہم

یہ لکھ کر میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا، لیکن آنسو بدستور میری آنکھوں سے جاری تھے۔

اب وزیر وضو کر کے آیا، تخت پر بیٹھا، کاغذ پر نگاہ ڈالی تو اس پر بیسٹھ مرقوم

تھا۔ اس نے مکان کے چاروں طرف دیکھا، میرے سوا کوئی اور اس کو نظر نہ آیا تو مجھ

سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”یہ شعر تم نے لکھا ہے۔“؟ میں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں میں نے ہی لکھا ہے۔“ پھر پوچھا ”تم کون ہو۔“؟ میں نے اپنی اور اپنے باپ کی سرگزشت بیان کی۔ اس نے میرے باپ مولانا ابراہیم جامع کا نام سنا تو فوراً تخت سے اٹھا، اپنے ہاتھ سے میرے پاؤں کی زنجیر کھولی، اپنا پیلاہن مجھے پہنایا اور اسی آن سواری پر بٹھا کر مجھے مرزا شاہ حسین کے دیوان خانے میں لے گیا اور اس کے سامنے پیش کر کے میرے باپ کی علمی حیثیت بیان کی۔ شاہ حسین ارغون نے فوراً میرے باپ کو بلایا۔ اس وقت اتفاق سے حسین کے دربار میں مختلف علما موجود تھے اور ہدایہ کے ایک فقہی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ میرے باپ سے بھی اس بحث میں حصہ لینے کو کہا گیا۔ وہ فقہ کے بہت بڑے عالم تھے، انھوں نے زیر بحث مسئلہ سے متعلق اس انداز سے گفتگو کی، اور باوجود ذہنی پریشانی اور جسمانی تکلیف کے اس کو اس اسلوب سے بیان کیا کہ حضارِ مجلس بہت محظوظ ہوئے اور بادشاہ بھی انتہائی متاثر ہوا۔ اس نے اسی وقت مجھے اور میرے والد کو ایک ایک خلعتِ خاص مرحمت فرمایا اور خازن کو حکم دیا کہ مولانا ابراہیم کا ٹوٹا ہوا اثاث البیت واپس کیا جائے اور ان کے مکان پر پہنچایا جائے۔ اگر وہ مال موجود نہ ہو تو اسی وقت سرکاری خزانے سے اس کی قیمت ادا کی جائے۔ پھر بادشاہ نے ان سے اپنے ساتھ ٹھٹھہ نشریف لے جانے کی درخواست کی۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ سفید عمر کنارے آگاہ ہے سفرِ آخرت درپیش ہے اور چند روز کی زندگی باقی ہے۔ اب میں اپنے اس قدیم شہر ملتان کی سکونت ترک کر کے آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد مولانا ابراہیم جامع، اللہ کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

یہ ۹۳۲ھ کا واقعہ ہے۔

دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے یہ عالم دین اگرچہ علمِ فقہ اور دیگر علوم

پہ گہری نظر رکھتے تھے اور جیسا کہ گزشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے، ان کا حلقہ تلمذ بھی خاصا وسیع تھا اور ان کی علمی شہرت بھی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، مگر ہم ان کی کسی فقہی تصنیف کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے، یہ مسائل فقہ اور کتب فقہ کے ماہر تو تھے لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق کسی کتاب کے مصنف نہ تھے۔

۴۔ قاضی ابراہیم بن محمد کاپوی

قاضی ابراہیم بن محمد پتواری کاپوی، عرصہ تک نواح کاپلی کے ایک قصبہ، پتواری میں اقامت گزین رہے۔ بہت سے اوصاف کے حامل اور متعدد خوبیوں کے مالک تھے۔ ہدایہ شیخ عبدالملک کاپوی سے پڑھا، جن کی کاپلی میں سند تدریس آئی تھی۔ قاضی ابراہیم کاپوی عالم و فقیہ بھی تھے اور صاحبِ دسع و تقویٰ بھی یعنی تقا، اور تقویٰ دونوں کے جامع تھے۔ عمر بھر درس دینے اور طلبائے علم کو پڑھانے میں مشغول رہے۔ عالم دین، خوش نولیس، فصیح البیان اور محبوب القلوب تھے۔ فقہی مسائل کو موضوع بحث ٹھہراتے تو سب سے سبقت لے جاتے۔ بے شمار علما و طلبانے ان سے استفادہ کیا۔

دسویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کے یہ وہ فقیہ اور عالم ہیں جو فقہی مسائل پر عبور تو رکھتے تھے اور اس کی عقدہ کشائیوں میں ماہر بھی تھے مگر جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے، کسی فقہی کتاب کے مصنف نہ تھے۔ ان کے علم و فقاہت کا رازہ تدریس و افتا اور زبانی مباحث تک محدود تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی خدمت فتنہ ہے۔ فقاہت میں عبور کا مطلب تصنیف ہی نہیں، تدریس بھی ہے اور یہ زیادہ مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ مسائل و معلومات میں جو درک، گہرائی اور وسعت، تدریس

سے پیدا ہوتی اور قلب و ذہن کے عمیق خانوں میں جاگزیں ہوتی ہے، وہ تصنیف سے نہیں ہٹکتی۔ لہذا کہنا چاہیے بسا اوقات تدریس کا پلٹا تصنیف پر بھاری ہونا ہے۔

۵۔ شیخ ابراہیم بن معین الدین ایرجی

شیخ ابراہیم بن معین الدین بن عبد القادر حسنی ایرجی دہلوی، علم و فضل کے مرتبہ بلند پر فائز تھے اور اپنے زمانے کے شہرہ آفاق علما میں سے تھے۔ بہت بڑے فقیہ اور مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ تصوف و سلوک سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ علم الدین محدث سے اخذ علم اور شیخ بہاء الدین بن عطاء اللہ جنیدی قادری شطاری سے کسب طریقت کیا۔ شیخ بہاء الدین نے اذکار و اشغال سے متعلق ان کے لیے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت کے آخری دنوں یعنی ۹۲۰ھ میں دہلی تشریف لائے اور ان کے کمالات علمی سے متاثر ہو کر شیخ عبد اللہ دہلوی، میاں لاون، مولانا عبد القادر صابونگر اور دیگر اصحاب علم و طریقت ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوئے۔ سب مشاغل دنیوی سے منقطع ہو کر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کے انتہائی شائق تھے۔ تمام علوم و فنون کی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں۔ اس دور میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں فراوانی علم اور وسعت مطالعہ میں کوئی شخص لنگ کی ٹکڑا نہ تھا۔ مگر اس وسیع النظر اور کثیر المطالعہ عالم کی لوگوں نے قدر نہ کی اور ان کے صحیح مرتبہ کو نہ پہچانا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں محصور کر لیا تھا اور تصحیح کتب کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ وہ اس سنج سے کتابوں کی تصحیح کرتے اور ان کے نکات و غوامض کو حل فرماتے کہ قاری سرسری نظر ہی سے، دقیق سے دقیق مسائل کو سمجھنے اور مشکل سے مشکل مقامات کو احاطہ نہم میں لانے میں کامیاب ہو جاتا۔ شیخ ابراہیم، سماع کے مخالف تھے۔ وہ اس قسم کی مجلسوں میں شامل نہ ہوتے جن میں سماع کا اہتمام ہوتا تھا۔

اس جید عالم دین کا حلقہ تلامذہ بڑا وسیع تھا، جو حضرات ان سے علم حاصل

کرنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے، ان میں شیخ رکن الدین بن عبدالقدوس گنگوہی شیخ عبدالعزیز بن حسن دہلوی اور شیخ نظام الدین بن سیف الدین کاکوروی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

شیخ ابراہیم نے ۹۵۲ ہجری کو سلیم شاہ سوری کے ایام حکومت میں دہلی میں وفات پائی اور امیر خسرو کی قبر کے قریب، شیخ نظام الدین اولیا کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ان کو ایرجی اس لیے کہتے ہیں کہ اصلاً ایرج کے باشندے تھے جو علاقہ مالوہ میں قصبہ تھا۔

۶۔ حاجی ابراہیم سرہندی

حاجی ابراہیم سرہندی، ہندوستان کے مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد کے فضلا اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ اس زمانے میں عالم دین کو ملا یا شیخ یا مولانا کہا جاتا تھا۔ مگر ابراہیم سرہندی کو اس قسم کے الفاظ سے مخاطب نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حاجی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ انھوں نے مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری اور دیگر علمائے کرام سے تحصیل کی۔ پھر حرمین شریفین گئے۔ حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے اور شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر ہمشمی مکی سے حدیث پڑھی۔ بعد ازاں واپس ہندوستان آئے، ملوک و امرا سے تقرب حاصل کیا اور جلال الدین اکبر کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ سنسکرت کے بھی عالم تھے اور اکبر کے حکم سے ”انھرن وید“ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بلاشبہ بہت بڑے عالم، ذہین اور زود فہم تھے۔ مگر سخت جھگڑالو، زبان دراز، مجادلہ و مباحثہ کے شائق، مناظرہ کے دلدار اور لوگوں کو مغالطہ میں مبتلا کرنے میں ماہر تھے۔ علما پر سخت تنقید کرتے اور کسی کو خاطر میں

۵۵ اخبار الاخبار، ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۸، ۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۵۴۔

نہ لاتے۔ ابوالفتح گیلانی، فتح اللہ شیرازی اور ابو الفضل بن ملا مبارک کے سخت مخالف تھے اور ان پر زبانِ طعن دراز کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ نقد و بحث کے دوران میں آدابِ شاہی کو بھی خاطر میں نہ لاتے اور بادشاہ کے دربار میں علماء و فضلا کی ہانت کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کرتے۔ ایسے مواقع پر اپنے علمی وقار اور شخصی مرتبہ کو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے۔

ملا عبد القادر بدایونی، اکبر کے مقررین اور درباری علما میں سے تھے، اور حاجی ابراہیم سرہندی کی عادات و اطوار سے خوب آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنی معروف تصنیف منتخب التواریخ میں متعدد مقامات پر ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ اکبری دربار کے علما کا تذکرہ کرتے ہوئے بطور لطیفے کے لکھتے ہیں۔

”ان ہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ اکبری مجلس میں حاجی ابراہیم سرہندی بھی موجود تھا، جو ہمیشہ علما سے الجھتا رہتا اور اپنی بڑائی جتانے کے لیے مباحثے کرتا رہتا تھا اور بحث میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کر کے مخالف کو پریشان کر دیتا تھا۔ جس وقت تاشقندی نے اپنی تفسیر پیش کی، تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھا ”موسلی کیا صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے“ مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کا جواب جیسا دینا چاہیے تھا نہ دے سکے اور عوام نے یقین کر لیا کہ حاجی ابراہیم بلحاظ علم کے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑی نا انصافی کی بات تھی۔ کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے، جسے بادشاہ نے مقرر کا قاضی مقرر کیا تھا، کہا تم بحث میں کیوں حصہ نہیں لیتے ہو؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ ”اگر حاجی ابراہیم مجھ سے ”عیسیٰ“ کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو اس وقت بھلا میں کیا جواب

۵۷ یہ حافظ تاشقندی تھے جو عربی کے مشہور عالم تھے۔ انھوں نے سورہ محمد کی ایک تفسیر لکھی تھی، جس سے ان کے علمی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ۹۷۷ھ میں تاشقندی فوت ہوئے

دسے سکوں گا۔“ بلاشبہ اس نے یہ بڑی عمدہ بات کہی تھی۔
 علامہ عبدالقادر بدایونی اس دور کو بہت یاد کرتے ہیں اور انھیں یاد رفتگاں ستاتی
 ہے تو افسوس کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں :
 و مدتِ دہ سال ازل تا تاریخ الیوم گزشتہ و آن جماعتِ مباحثین و مناظرین چہ
 محقق و چہ مقلد کہ از صد نفر متجاوز بودند، یک کس نمی بیند و ہمہ روی در نقابِ کُلِّ نفسِ
 ذائقۃ الموت ماندند۔

جہت الریاح علی مکان دیار ہم فکانہم کأنواع علی میعاد
 حالاً کہ بمقتضائے النعمۃ اذا فقدت عرفت، آن صحبتاں را یاد میکند خونابہ حسرت از
 دیدہ غم دیدہ فرومی باردومی زارومی نالدومی گوید کہ دریں حسرت آباد کاشکے روزی چند
 یگر ہم اقامت می نمودند کہ بہر حال مغتنم بودند، و خطاب منحصر بایشاں بود؛
 پائی در زنجیر پیش دوستاں بہ کہ بایگان گاں در بوستاں
 ایں پیشہ مضرور را و ایں نقشہ مصدر را غیر از داغ حرماں و نالہ نہاں چہ در مان غفر اللہ
 الماضین و رحمہ الباقین۔

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند در یاتی اجل یگان یگان پست شدند
 بودند تنگ شراب در مجلس عمر یک لحظہ زما پیشہ ک مست شدند
 یعنی اس تاریخ سے اب تک کہ دس سال کی مدت گزر چکی ہے، ان مباحثہ کرنے والوں کی
 جماعت میں سے جو نسو سے زیادہ افراد پیشہ تھی، محقق و مقلد کوئی بھی نظر نہیں آتا ہے۔
 سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب ڈال چکی ہے۔ بے شک کُلِّ نفسِ ذائقۃ الموت۔
 زخیل در دکشاں غیر مانساند بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بے
 وہ محفلیں اُجڑ گئیں اور ایک میں سو گوارہ گیا ہوں کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے، میری
 غم زدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔

کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے کہ بہر حال اس قحط الرجال میں ان کی ہستیاں بڑی غنیمت تھیں۔ اب کس سے بات کریں، تبادلِ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔ اب مجھ ناکارہ و افتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا رہوں اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں :

افسوس کہ بالان ہمہ از دست شدند در بایے اجل یگان یگان پست شدند
 بودند تنگ شراب در مجلس عمر یک لحظہ زما پیشترک مست شدند
 اس سے چند صفحات آگے چل کر صاحب زمان کے متعلق پیشین گوئی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

حاجی ابراہیم سرہندی کا نغزِ گجرات کی صدارت پر کیا گیا تھا۔ اس نے ائمہ سے رشوت لے کر کافی روپیہ اور مال و اسباب جمع کر لیا۔ اگر وہ بے چارے رشوت دینے سے انکار کرتے تھے تو وہ ان کی مددِ معاش روک دیتا تھا۔ اس کی حرکتیں بادشاہ کے علم میں بھی آئیں اور یہ بھی پتا چلا کہ وہ دکن جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اسے بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا گیا اور واپس بلا کر حکیم عین الملک کے سپرد کر دیا گیا۔ تاہم شبانہ مجلسوں میں اس کو باقاعدہ بلا یا جاتا تھا۔ اس نے اس زمانے میں بزرگان دین کے متعلق جھوٹی سچی باتیں لکھ کر ایک رسالہ بادشاہ کی خدمت میں خوشامد کے طور پر پیش کیا، لیکن اس کا پول بہت جلد کھل گیا۔ اصل میں اس نے ایک پُرانی کرم خوردہ کتاب میں غیر معروف خط میں ابن عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ صاحب زمان بہت ہی عورتوں سے نکاح کرے گا، دارِ طہی منڈا ہوگا اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کر دی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور مہربان ہو کر اسے مقریوں میں شامل کر لیا۔

حاجی ابراہیم کی مذکورہ تحریر کے مطابق میاں امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابوسعید کی کتابوں میں سے ایک پُرانا رسالہ فراہم کیا گیا، جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ ایک صحابی کا لڑکا دارِ طہی منڈا کر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا، تو

آپ نے فرمایا، اہل جنت کی یہی وضع ہوگی۔ ”یہ حدیث“، کبھی اکبر کو بڑے اہتمام سے دکھائی گئی۔

حاجی ابراہیم سرہندی، شاہ فتح اللہ، شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح کے ساتھ بڑی بے باکی سے مباحثے کرتا تھا اور ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ اسی لیے اکبر نے اس کو رتھنپور کے قلعے میں بھیج دیا۔ وہ اسی جگہ فوت ہوا، اس کی لاش قلعے کی فصیل سے نیچے پھینک دی گئی۔ لاش لمبے کپڑوں میں لپیٹی ہوئی تھی، اس لیے مشہور ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ کو قلعے سے نیچے گرا دیا۔ یہ حادثہ ۹۹۴ھ میں پیش آیا۔^{۹۵}

اس سے چند صفحات آگے چل کر لکھا ہے :

حاجی ابراہیم سرہندی کو پہلے ہی معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بادشاہ کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ اس نے کافی مال متاع جمع کر لیا ہے اور اس کے حرم میں بہت سی عورتیں موجود ہیں اور وہ دکن کی طرف فرار ہو جانے کی فکر میں ہے۔ اسے گرفتار کر کے اسی سال بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اکبر نے کچھ عرصہ تک اسے عین الملک کی نگرانی میں رکھا اور بعد میں قلعہ رتھنپور بھیج کر قتل کر دیا گیا۔^{۹۶}

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی دربار اکبری میں حاجی ابراہیم سرہندی کا ذکر کیا ہے اور اپنے خاص اسلوب بیان اور انداز تحریر میں ان کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ وہ دربار اکبری سے متعلق علما کے کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

”لطیفہ: حاجی ابراہیم سرہندی، مباحثوں میں بڑا جھگڑا لو اور مغالطوں میں جھپلاوے کا تماشا تھے۔ ایک دن چار ایوان کے جلسے میں مرزا مفلس سے کہا کہ موسیٰ کیا صیغہ ہے اور اس کا ماخذ اشتقاق کیا؟ مرزا علوم عقلی کے سرمائے میں بہت مال دار تھے مگر اس جواب میں مفلس ہی نکلے۔ شہر میں چہرچاہو گیا کہ حاجی نے مرزا کو لاجواب کر دیا، اور حاجی بڑے ہی فاضل ہیں۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ بھی تاثیر زمانہ کا ایک شعبہ ہے۔ یہ رباعی

ملا صاحب نے فرمائی :

انہر فساد و جنگ بعضے مردم کہ زند بکوئے مگر ہی خود را گم
در مدرسہ ہر علم کہ آموختہ اند **فِي الْقَبْرِ لِيُصْبِرُ هُمْ وَلَا يَنْفَعَهُمُ اللَّهُ**

جلال الدین ابراہیم کی سچنوں سے بہت دلچسپی لیتا تھا، اس قسم کی مجلسیں رات کو بھی جاری رہتی تھیں۔ دربارِ اکبری کے اہل علم ان میں باقاعدہ شامل ہوتے تھے۔ اس ضمن میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

لطیفہ : تحصیل فوائد پر نظر کر کے بادشاہ خوش اعتقاد دل سے چاہتا تھا کہ یہ جلے گرم رہیں۔ چنانچہ ان ہی دنوں میں قاضی زادۃ لشکر سے کہا کہ تم رات کو سجت میں نہیں آتے۔ عرض کی حضور، آؤں تو سہی لیکن حاجی وہاں مجھ سے پوچھیں، عیسے کیا صیغہ ہے تو کیا جواب دوں؟ لطیفہ اس کا بہت پسند آیا۔

منتخب التواریخ کے مصنف، ملا عبدالقادر بدایونی دربارِ اکبری میں شامل ہوئے تو حاجی ابراہیم سرہندی نے ان سے بھی اپنی عادت کے مطابق پنچہ آزمائی شروع کر دی۔ ملا صاحب کو اکبری حمایت حاصل تھی۔ آزاد لکھتے ہیں :

”ملا صاحب کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ حاجی ابراہیم کسی کو سانس نہیں لیتے دیتا، یہ اس کا کلمہ توڑے گا۔ چنانچہ علم کا زور، طبیعت بے باک، جوانی و امنگ، بادشاہ خود مدد کو پشت پر، اور بڑھوں کا اقبال بڑھا ہوا چوکا تھا۔ یہ حاجی سے بڑھ کر شیخ صدر کوٹھکیں مارنے لگے۔“

حاجی ابراہیم سرہندی کی عادات اور ان کے کردار اور انجام کے بارے میں مولانا آزاد رقم طراز ہیں :

حاجی ابراہیم سرہندی کے رہنے والے تھے، مگر بڑے جھگڑالو تھے، مباحثوں

۳۹ ایضاً ص ۳۹ -

۳۸، ۳۹ دربارِ اکبری، ص ۳۸، ۳۹ -

۳۹ ایضاً ص ۳۹، ۴۰ -

میں حریف کا منہ بند کر دیتے تھے اور مغالطے کے بادشاہ تھے۔ ابھی یہ بات، ابھی وہ بات، ابھی یہاں، ابھی وہاں۔ اکبر نے چاہا کہ دستی مٹریہ ”اللہ اکبر“ کھدوائے، حاجی صاحب مخالفت پر کھڑے ہو گئے، اور یہ روکنا کچھ دین داری کی رعایت سے نہ تھا، فقط تقریر کی زور آزمائی تھی۔ پھر بادشاہ کی رغبت دیکھ کر آپ ہی سرخ و زعفرانی لباس کے جواز کا بھی فتویٰ دے دیا۔ میر سید محمد میر عدل نے عصا تو اٹھایا تھا مگر بیچ گئے۔ لفظ تم بخت، ملعون پر خیر گز گئی، بھاگ گئے، ورنہ وہ مار بیٹھتے۔

آخر ۹۹۵ھ میں احمد آباد گجرات کے صدر ہو کر گئے۔ چند روز کے بعد دربار میں خبر پہنچی کہ نوب رشونیں کھاتی ہیں، مشائخ اور ائمہ مساجد سے ہزاروں روپیہ لیا ہے جس نے نہیں دیا اس کی مدد معاش سے وضع کر لیا ہے، اور جو روٹوں سے گھر بھر لیا ہے انھیں بھی خبر لگ گئی، چاہتے تھے کہ دکن کو بھاگ جائیں، دربار میں خبر جا پہنچی، بادشاہی سپاہی نے جا لیا، پکڑے آئے، حکیم عین الملک کے حوالے ہوئے، پھر بھی رات کے دربار میں بلائے جاتے تھے۔ مگر اب یہاں دربار کا عالم اور ہو گیا تھا۔ انھوں نے رنگ دیکھ کر ایک دقیانوسی کرم خوردہ رسالہ نکالا، شیخ محی الدین ابن العربی کی عبارت کے حوالے سے اس میں ایک عبارت لکھی یا لکھو ادوی کہ حضرت امام مہدی کی بہت سی بیبیاں ہوں گی اور وہ دائرہ منڈے ہوں گے اور کئی آتے پتے اور بھی ایسے لکھے کہ اکبر میں موجود تھے۔ اس سے یہ ثابت کرنے تھے کہ اکبر امام مہدی ہیں۔ یہ نسخہ نہ چلا، بادشاہ نے زنجبورو کے قلعے میں بھیج کر قید کر دیا۔ ملا صاحب اکبر کی شکایتوں کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ وہاں اورج رفعت نے خواری کے گڑھے میں گر دیا اور مطلب اپنا نکالا (یعنی مار ڈالا)۔

ابوالفضل لکھتے ہیں کہ حاجی نے پہرے والوں سے سازش کر کے کپڑے کے تھکان کھول کر لٹکائے کہ کند کی طرح اس پر سے اتر جائیں۔ قضا نے دھکا دیا، اوپر سے گر پڑے اور صبح کو مرے ہوئے ملے ۱۱۱۱ھ

علامہ سید عبدالرحمن حسنی لکھنویؒ نے بھی نزہۃ الخواطر میں حاجی ابراہیم سرہندی کا تعارف کرایا ہے اور سالِ وفات ۹۹۴ھ تحریر کیا ہے۔^{۱۶} ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی منتخب التواریخ میں یہی سالِ وفات لکھا ہے۔ البتہ محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں جس انداز میں ان کی وفات کا واقعہ بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کی وفات ۹۹۵ھ کو ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس ضمن میں ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان صحیح ہے کیونکہ وہ ان کے معاصر تھے اور تمام واقعات کے عینی شاہد۔

حاجی ابراہیم سرہندی، بلاشبہ اپنے وقت کے عالمِ دین اور فقیہ تھے۔ مگر افسوس ہے، مناظرہ بازی، زبانِ درازی، مکرو فریب، رشوت خواری، بخت و جدل، ہر ایک سے پنجہ آزمائی اور علم کی کشتی اور عقل کے ذنگل کے لیے کمر بستہ ہو جانے کے شوق نے ان کو کسی کام کا نہ چھوڑا اور غلط کرداری کی بنا پر وہ زندگی کے ایسے موڑ پر جا کھڑے ہوئے جس سے اگلی منزلِ تباہی کے سوا اور کوئی نہ تھی۔ اہلِ علم کا اصل شیوہ تو سنجیدگی و متانت سے خدمتِ دین اور تبلیغِ کتاب و سنت ہے نہ کہ خصوصیت و الزام تراشی کے مواقع پیدا کرنا اور دوسرے کی تذلیل و توہین پر اتر آنا۔!

۷۔ شیخ ابراہیم جون پوری

شیخ ابراہیم جون پوری حنفی المسلك تھے۔ بڑے فاضل شخص تھے اور اپنے عصر کے مشہور فقہاء میں سے تھے۔ انھوں نے شاہ آباد میں شیخ عبدالقادر س گنگوہی کے ساتھ علمِ کلام کے اس مسئلہ پر مناظرہ و مباحثہ کیا تھا کہ کسی شخص معین کے لیے یہ کہنا کہ یہ اہلِ جنت سے ہے یا اہلِ جہنم میں سے، جائز ہے یا نہیں؟ شیخ ابراہیم کا موقف یہ تھا کہ میرے اور اللہ کے درمیان یا میرے اور لوگوں کے درمیان تعلق و رابطہ کی جو نوعیت ہے

^{۱۶} نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۵، ۶۔ ان کے حالات کے لیے اذکارِ ابراہیم، ص ۳۸۴، ۳۸۵ بھی دیکھیے

^{۱۷} منتخب التواریخ ص ۳۲۶۔

اس کے پیش نظر کسی خاص اور معین شخص کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اہل جنت سے تعلق رکھتا ہے یا اہل جہنم سے۔^{۱۸} اس بحث کی تفصیل شیخ محمد بن مبارک جون پوری کے حالات میں بیان کی گئی ہے۔

۸۔ قاضی ابراہیم سندھی

قاضی ابراہیم دریلوی سندھی کی کنیت ابو عبداللہ تھی، دریلو کے رہنے والے تھے اور ان کا شمار سندھ کے جلیل القدر علما میں ہوتا تھا۔ ان کے بیٹے شیخ عبداللہ سندھی مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی اولاد و اعقاب میں اللہ نے بڑی برکت عطا فرمائی۔^{۱۹}

۹۔ شیخ ابواسحاق لاہوری

شیخ ابواسحاق بن حسین قادری لاہوری عالم اجل اور صالح بزرگ تھے۔ شیخ داؤد بن فتح اللہ جہنی وال سے اخذ طریقت کیا تھا۔ ان سے عرصہ تک منسک رہے۔ بعد ازاں لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے دور کے عالم کبیر اور تفسیر قرآن میں ماہر تھے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

شیخ ابواسحاق لاہوری حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری

^{۱۸} نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۷۷۔

^{۱۹} تاریخ معصومی ص ۲۳۲۔ تحفۃ الکرام ص ۴۲۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۷۷۔ تذکرۃ علماء ہند، ص ۲۶۱۔ شیخ داؤد کچھ عرصہ جہنی وال میں قیام پذیر رہنے کے بعد شیرگرھ چلے گئے تھے جو ضلع ساہیوال (پنجاب) کا ایک قصبہ ہے جہنی وال کو اب چونیاں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو ضلع قصور کی ایک تحصیل ہے۔

میں مشہور تھے۔ ان کے دل میں مرشد کی محبت جاگزیں تھی۔ تغیراتِ زمانہ اور انقلاباتِ دُور راں سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور دل میں خدا طلبی کا جذبہ جاگ اٹھتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

ان کے بس دو تین رفیق تھے۔ ان کے علاوہ نہ کسی سے ملتے اور نہ کسی واپس ہاں بلاتے۔ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا۔ ہمیشہ ایک جگہ رہے ہیں، جو ایک باغ میں تھا، گونڈ نشین رہتے۔ شیخ داؤد جہنی وال سے ملاقات کا؛ سنستیاقی ہوتا تو لاہور سے سیدل مکمل جاتے اور ایک رات میں چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے اور ان کو ملے بغیر واپس آجاتے۔

خود ملا عبد القادر بدایونی بھی ان کی نحرمت میں گئے تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے

ہیں :

ایک سال میں بھی لاہور میں ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کے ماں ایک رات اور ایک دن جمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک محافظ کے ساتھ روانہ ہو گیا، حالانکہ وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا۔ راستے میں راہزن اور لٹیرے میرا راستہ روک لیتے اور حیران ہو کر پوچھتے کہ اس خطرناک جنگل میں تم تنہا کہاں جا رہے ہو۔ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میاں شیخ ابواسحاق کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اب شیخ داؤد کے پاس شیر گڑھ جا رہا ہوں تو وہ ان کا نام سن کر عقیدت و احترام سے پیش آتے، کھانے پینے کے لیے دودھ دہی وغیرہ لے آتے اور راستہ بنا کر احتیاط و حفاظت کے لیے کہتے کہ جہاں کوئی خطرناک آدمی ملے اس کو شیخ ابواسحاق کا نام بتا دینا۔

اس سے آگے ملا عبد القادر رقم طراز ہیں :

جس سال شیخ داؤد جہنی وال نے انتقال کیا، ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پنجاب میں عام وبا پھوٹ پڑی تھی، اسی وبا میں تین چار ماہ کے اندر اندر شیخ کے تمام اہل خاندان اور مشہور خلفا جو تقریباً پچاس ساٹھ آدمی تھے، ایک کے بعد ایک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد شیخ ابواسحاق بھی انتقال فرما گئے۔ یتھ

مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیاء میں لکھتے ہیں :

شیخ ابواسحاق مروّجہ علوم میں مہارت رکھتے تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ کے عالم تھے اور اپنی خانقاہ میں ان علوم کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ تمام عمر لوگوں کی ہدایت میں مصروف رہے اور خلق کثیر نے ان سے علمی اور روحانی فیوض حاصل کیے۔ ۵ محرم ۸۵ھ کو لاہور میں وفات پائی۔^{۲۱۴}
مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے تاریخ وفات ۶ محرم ۸۴ھ تحریر کی ہے۔^{۲۱۳}

۱۰۔ شیخ ابوبکر اکبر آبادی

شیخ ابوبکر قرشی حنفی اکبر آبادی، عالم و فقیہ تھے اور اپنے دور کے مشہور و فاضل میں سے تھے سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت میں ہندوستان کے مشہور شہر آگرہ میں آئے اور پھر وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ علم فقہ میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب وصایا کی شرح لکھی۔ پھر اصول بزدوی کی شرح سپرد قلم کی۔ آگرہ کے نواح میں جوگی پور کے مقام پر وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔^{۲۱۴}

۱۱۔ قاضی ابوسعید بھکری سندھی

قاضی ابوسعید بن قاضی زین الدین بھکری سندھی، فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور اپنے وقت کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کا شمار دسویں صدی ہجری کے معروف سندھی اور ہندی علمائے کرام میں ہوتا ہے۔ علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ذکاوت و فطانت میں ضرب المثل تھے فصیلت اور حاضر جوابی میں اُس دور میں کوئی ان کا مد مقابل نہ تھا۔^{۲۱۵}

^{۲۱۴} خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ ^{۲۱۳} نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۸، ۷۔

^{۲۱۴} اذکار ابرار، ص ۲۲۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۸، ۷۔

^{۲۱۵} تحفۃ الکرام، ص ۴۴۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۹۔

فقہائے ہند جلد سوم

”تذکرہ علمائے ہند میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :
قاضی ابوسعید بھکری ولد قاضی زین الدین بو فور فضیلت و حضورِ قریحت از ممتازان
روزگار بود۔“

یعنی قاضی ابوسعید ولد قاضی زین الدین بھکری، و فورِ فضیلت اور حاضرِ جوانی
میں اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں سے تھے۔

۱۲۔ شیخ ابوالغیث حسینی بخاری

شیخ ابوالغیث حسینی بخاری، بہت بڑے فقیہ اور صلح عالم دین تھے۔ کبار
مشائخ و علما سے کسبِ فیض و اخذِ علم کیا اور مرتبہ بلند کو پہنچے۔ پھر ملوک و امرا کے نظریں
و ندما میں شامل ہو گئے، مگر اس کے باوجود صلاح و تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھے۔ بذل
سخا، حسن کردار، صداقت شعاری، آثارِ سلف صالحین کی اقتدا اور اوقاتِ معینہ میں
عبادت گزار اور غیرہ میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اس کے ساتھ ہی درس و افادہ کا سلسلہ
بھی جاری رکھا۔ اللہ نے ان کو مال و دولت کی نعمت عطا کی، وجاہت و حشمت سے
نوازا اور عز و شرف سے بہرہ ور فرمایا لیکن ساتھ ہی یہ توفیق خداوندی بھی شامل حال رہی کہ
نماز باجماعت کے اس حد تک پابند تھے کہ کبھی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوتی، حتیٰ کہ
بیماری میں بھی باقاعدہ اس پر عمل پیرا رہے۔

ملا عبد القادر بدایونی نے ان کا تذکرہ نہایت عقیدت و احترام سے کیا ہے ان
کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

میر ابوالغیث بخاری بڑے پاک شرب اور عالی ہمت بزرگ تھے۔ ان کے اخلاق پر فرشتوں کے
اخلاق کا گمان ہوتا تھا، غنا کے پردے میں فقر کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے بہت
سے علما و مشائخ سے استفادہ کیا تھا، سخاوت و بخشش، آزادہ روی، حسن معاشرت، صدقِ معاملت،

۵۲۶ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔

اور میل جول میں اللہ کی کھلی نشانی تھے۔ احکام شریعت کی پابندی اور صوفیائے سلف و خلف کی پیروی پوری طرح کرتے تھے۔ آثارِ سنت اور نماز باجماعت سے ایسا شغف تھا کہ مرض میں بھی باوجود اس کی شدت کے، تکبیر تحریر کبھی ان سے فوت نہ ہونے پائی۔ ان کی مجلس کبھی اللہ تعالیٰ ادا اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور بزرگانِ دین کی باتوں سے خالی نہ رہی۔ ان کی تاریخِ وفات ”میرستودہ سیر“ سے نکلتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے اس تقویٰ شاعر فقہیہ اور عالمِ دین نے ۹۹۵ھ کو تونج کے مرض سے کھنڈ میں وفات پائی اور دارالسلطنت دہلی میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

۱۳۔ شیخ ابوالفتح بن جمال الدین مکی ثم ہندی

شیخ ابوالفتح بن جمال الدین عباسی مکی ثم ہندی اکبر آبادی، اپنے زمانے کے معروف عالم اور فقیہ تھے۔ دراصل شروان کے باشندے تھے، لیکن طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر رہنے کی وجہ سے مکی مشہور ہو گئے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت میں واردِ ہند ہوئے اور اکبر آباد (آگرہ) میں اقامت پذیر ہوئے، لہذا اکبر آبادی کہلائے۔

شیخ ابوالفتح سیر و سیاحت کے شائق تھے۔ اپنے وطن سے خشکی کے راستے عازمِ ہند ہوئے۔ جب دریائے سندھ کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ امیر سحر ایک غیر مسلم ہے۔ نہایت کینہہ خاطر ہوئے اور کہا، جس ملک کے مسلمانوں کی عنانِ اختیار دوسروں کے ہاتھ میں ہو، ابوالفتح کو اس ملک میں رہنا زیب نہیں دیتا۔ لہذا قندھار کو طے جانے کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے ان دنوں فرماں رولے اقلیمِ ہند سلطان سکندر لودھی، اطرافِ ملتان کا دورہ کر رہے تھے۔ اس کو پتا چلا کہ ایک پرمیزگار عالم و فقیہ واردِ سندھ ہوا تھا اور اب وہ واپس

فقہائے ہند جلد سوم

جاری رہے، تو اس نے ایک عربیضہ ارسالِ خدمت کیا اور نہایت عجز و انکساری کے ساتھ ہندوستان کے دارالخلافہ (اگرہ) نشریف لانے کی درخواست کی۔ شیخ نے سلطان اور ارکانِ حکومت کی نصیحت کی غرض سے سلطان سے ملاقات کی۔ وہ انتہائی محبت و عقیدت سے پیش آیا۔ شیخ نے اس کو اس سے بھی زیادہ منکسر و متواضع پایا، جس کا اندازہ اس کی تحریر سے ہوا تھا۔

سکندر لودھی، نیک دل اور علما و صلحا کا قدر دان حکمران تھا۔ شیخ ابو الفتح مکی کا وہ بدرجہٴ نفایت احترام کرتا تھا۔ بعض لوگوں کو سلطان کے اس تعلق خاطر کی بنا پر شیخ سے حسد پیدا ہو گیا اور وہ شیخ کو اذیت پہنچانے اور سلطان کو ان سے بدگمان کرنے کے درپے ہوئے چنانچہ ایک دولت مند حاسد نے شیخ کی طرف سے ان کے اندازِ تحریر سے باطل ملتا جلتا خطِ سلطان کے ایک دشمن کے نام تحریر کیا۔ خط چونکہ باقاعدہ سازش کے تحت بھیجا گیا تھا، اس لیے منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے چند راہ گروں کو دے دیا گیا۔ کاتب نے راہ گروں سے ساز باز کر رکھی تھی، اس نے خط ان سے برآمد کر کے سلطان کو پہنچا دیا۔ سازش کی کڑیاں کچھ اس طرح ملائی گئی تھیں کہ خط دیکھتے ہی بادشاہ کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا۔ اس نے وہی خط شیخ کو بھیجا اور کسی قدر شکوہ بھی کیا۔ شیخ نے جواب میں کہا، ابو الفتح اس قماش کا آدمی نہیں ہے کہ اس قسم کی دل آزار تحریر سے اپنے فہم کو مٹوٹ کرے۔ یہ مجھ پر افترا باندھا گیا ہے، ہفتری بہت جلد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا۔ منقول ہے کہ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس شخص کا ہاتھ ایک مسرت اونٹ نے اس طرح چبا ڈالا کہ وہ بے کار اور خشک ہو گیا۔

شیخ ابو الفتح کے حالات میں یہ واقعہ بھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سکندر لودھی کے بعد تختِ ہند کا وارث جب ابراہیم لودھی بنا، تو ظہیر الدین بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ سلطان ابراہیم لودھی نے اس سے مقابلے کی زبردست تیاری کی اور قلمروئے ہند کے ہر طبقے کو لڑائی کے لیے آمادہ کیا۔ اس سلسلے میں اس نے جو فہری جمع کی، اس میں باقاعدہ سرکاری فوج کے علاوہ علما و فضلا اور فقرا بھی شامل تھے۔ علما و فضلا کے

یہی یہ حکم تھا کہ وہ شب بیدار لشکر میں ہم رکاب رہیں۔ بزرگان دین میں سے سید فریح اللہ شیرازی بھی شامل لشکر تھے اور شیخ ابوالفتح بھی حکیم شاہی کے مطابق بادل نخواستہ اس فوج میں شریک تھے۔ فوجیوں کا یہ بہت بڑا قافلہ دار الحکومت (آگرہ) سے کوچ کر کے دہلی پہنچا۔ وہاں بادشاہ کے حکم ثانی کے انتظار میں کئی دن ٹھہرنا پڑا۔ ایک روز مغرب اور عشا کے درمیان شیخ ابوالفتح علی صحن میں ٹھل رہے تھے کہ یک بارگی سمت مغرب سے عجلت کے ساتھ کوٹے۔ ایک شخص نے جو وہاں کھڑا تھا، شیخ کے اس اچانک کوٹنے کو بلاوجہ قرار دیا، اور صورت حال سے آگاہ ہونے کی غرض سے دریافت کیا کہ ٹھلتے ٹھلتے اس طرح مغرب کی جانب کوٹنے کا آخر کیا سبب ہے؟ فرمایا، اللہ کے نزدیک اس طرف سے، اس لشکر پر خدائی آفت اور زلی آشوب کا نازل ہونا مقدر ہو چکا ہے۔ لہذا یہاں سے بھاگنا ضروری ہے۔ دوسرے روز علی الصبح اپنے دوستوں کو آگاہ کر کے آگرہ کو روانہ ہو گئے۔

جب ابراہیم لودھی کا لشکر ظہیر الدین بابر سے مقابلہ کے لیے پانی پت پہنچا اور دونوں متحارب فوجیں میدان جنگ میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو زبردست لڑائی ہوئی، سلطان ابراہیم مارا گیا، کثیر تعداد میں فوج قتل ہوئی اور بے شمار لوگ کھیت رہے۔ منقول ہے کہ سرزمین ہند کے اس عالم کبیر اور حبیب اللہ قادری نے ایک سو چونتیس سال کی عمر پائی، اس طویل مدت میں خلق کثیر کوراہ ہدایت پر لگایا، لہذا تعداد متلاشیان حق اور طالبان علم کو فیض پہنچایا۔ ۲۲ شعبان ۹۵۳ھ کو آگرہ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ نماز جنازہ شیخ فریح الدین محدث شیرازی نے پڑھائی۔

۱۴۔ مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری

مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور بن شرف الدین عمری تھانیسری، حنفی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے شیخ و امام اور عالم کبیر تھے۔ ان کی فضیلت و نبالت سب کے نزدیک مسلم تھی۔

فقہ، اصول فقہ اور نحو کا علم قاضی محمد فاروقی سے حاصل کیا اور علوم حکمیہ کی تکمیل شیخ حسین بکری سے کی۔ پھر آگرہ گئے اور وہیں مستقل طور سے شیخ رفیع الدین محدث شیرازی کے جوار میں سکونت اختیار کر لی اور ان سے حدیث پڑھی۔ اس ہندی عالم و فقیہ نے پورے پچاس سال آگرہ میں مسند دس بچھائے رکھی۔ جن اکابر علمائے ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی، ان میں شیخ افضل محمد تمیمی، قاضی ناصر الدین، حاجی ابراہیم سرہندی، شیخ عبدالقادر بدایونی، شیخ کمال الدین حسین اور دیگر بہت سے حضرات شامل تھے۔

مفتی ابوالفتح نے ۸ جمادی الاولیٰ ۷۶۹ھ کو وفات پائی، ان کے بعض شاگردوں نے تاریخ وفات ”موت مفتی“ سے نکالی ہے۔^{۱۱۹}

ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :

شیخ ابوالفتح تھانوی اپنی زمانے کے بڑے متبحر اور بلند مرتبت عالم تھے۔ حدیث کا علم مولانا سید رفیع الدین محدث سے حاصل کیا۔ میر صاحب ہی کے محلے میں آگرہ میں تقریباً پچاس سال تک علوم عقلیہ و نقلیہ کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس سے بڑے ذہین اصحاب علم پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے اور میاں کمال الدین حسین نے بھی ان بزرگ دار کے سامنے زانوئے شاگردی نہ کیا ہے۔

مفتی ابوالفتح کے لڑکے بھی صاحب علم تھے اور آگرہ کی مسند افتا پر فائز تھے چنانچہ بدایونی لکھتے ہیں :

ان کے لڑکے شیخ عیسیٰ اب آگرہ میں مفتی کے عہدہ پر متعین ہیں۔ ابراہیم عہد کے اس جلیل القدر فقیہ کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

۱۱۹ منتخب التواریخ ص ۳۲۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۲

۱۲۰ منتخب التواریخ ص ۳۲۳۔

۱۵- شیخ ابوالفضل خطیب گادرونی

شیخ ابوالفضل خطیب گادرونی، عالم کبیر اور علامہ دہر تھے۔ معقول و منقول اور اصول و فروع کے ماہر تھے۔ ان کا شمار اپنے عصر کے مشہور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ملا جلال الدین محمد اسعد صدیقی دوآنی وغیرہ علمائے وقت سے علم حاصل کیا۔ پھر وار دہند ہوئے اور سلطان محمود گجراتی کے عہد حکومت میں گجرات گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ شاہان گجرات نے ان کی بڑی سرپرستی کی۔ عرصہ تک احمد آباد میں درس و تدریس کے ذریعے تبلیغ علم میں مصروف رہے بہت سے لوگوں نے ان سے تحصیل علم کی، جن میں ابوالفضل اوفیضی کے والد ملا مبارک بن خضر ناگوری بھی شامل ہیں۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ اس عالم دین کی قرآن مجید خصوصیت سے نظر تھی اور اس کے مشکل مقامات کو حل کرنے میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ بعض تذکرہ نگار ان کو اصلاً شیراز کا باشندہ سمجھ کر شیرازی لکھتے ہیں اور بعض گادرون کی طرف نسبت کر کے گادرونی کہتے ہیں۔

بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حاشیہ و تعلیقات علی تفسیر البیضاوی؛ تفسیر بیضاوی پر یہ ان کے بہترین علمی کام ہیں۔ ان میں آیات کے شان نزول کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور بعض علمی نکات و لطائف بھی بیان کیے گئے ہیں۔ تفسیر بیضاوی کا یہ نسخہ پشاور اور رام پور کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

۲- حاشیہ علی شرح المواقف؛ یہ حاشیہ کتب خانہ پشاور میں موجود ہے، جو لائق مطالعہ ہے۔

۳- شرح الارشاد؛ یہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی مشہور تصنیف الارشاد کی شرح ہے، یہ کتاب علم نحو کے موضوع پر ہے۔ اس ہندی عالم دین نے ۹۵۹ھ میں وفات پائی۔

۱۶۔ سید ابوالفضل حسینی استرآبادی

سید ابوالفضل حسینی استرآبادی، شیخ وقت، فاضل دوران اور عالم کبیر تھے۔ شافعی المسلک تھے۔ یوں تو علم کے تمام گوشوں پر عبور رکھتے تھے، مگر علوم حکمیہ کے تو خصوصیت سے ماہر تھے۔ علامہ جلال الدین محمد بن اسعد دوانی کے شاگرد تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور ہجرت (کاٹھیاواڑ) میں مقیم ہو گئے۔ وہاں ان کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہوا تو شہرت علم سے متاثر ہو کر بے شمار تشنگانِ علوم حاضر خدمت ہوئے اور اس فوج میں بہت جلد علما و طلباء کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس دور میں اصحابِ علم کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبدالعزیز بن محمد گجراتی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

فقہی اعتبار سے شافعی مسلک سے متعلق تھے اور ان کی عادت تھی کہ کتب شافیہ میں جو آسان فقہی مسائل مرقوم ہیں، ان میں بھی اشکال کی ایک صورت پیدا کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ مسئلہ سب کو معلوم ہے کہ سجدہ سہو، اس وقت کیا جائے گا، جب نمازی سے سہواً نماز کا کوئی رکن ادا ہونے سے رہ جائے، مگر یہ کہتے تھے: اگر کوئی شخص عمدًا نماز کا کوئی رکن ادا نہ کرے تو اس پر بھی سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ اس پر بحث شروع کر دیتے، انھیں ہر چند یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی کہ سجدہ سہو کو اسی بنا پر ”سہو“ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق نماز میں سہو ہو جانے سے ہے، عمر سے نہیں، لیکن وہ بدستور بحث جاری رکھتے اور کہتے، اگر کوئی رکن نماز ترک ہو گیا ہے تو سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ وہ رکن سہواً ترک ہو گیا ہو یا عمدًا اس کو ادا نہ کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں سجدہ سہو کرنا لازم ہے۔

اسی طرح اور بھی متعدد فقہی مسائل میں لوگوں کو الجھا دینے کے عادی تھے کتب فقہ بالخصوص شافعی فقہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ افسوس ہے، دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے اس فقیہ کی تاریخِ ولادت

اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔^{۳۲}

۱۷۔ شیخ ابوالقاسم بن احمد مکی

شیخ ابوالقاسم کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ ابوالقاسم بن احمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن عبد اللہ بن محمد الشرف محمد بن محبوب ابی بکر بن تھنی ہاشمی شافعی مکی۔ اپنے اسلاف کی طرح ابن فہد کے نام سے معروف تھے۔ ہفتے کی رات ۱۲ ربیع الاول ۸۴۶ھ کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو دل میں طلب علم کے شوق نے انگریزانی لی اور قاہرہ دمشق کی درس گاہوں کی راہ لی۔ وہاں کے اساتذہ سے کسب فیض کیا اور سند و اجازہ سے بہرہ ور ہو کر مکہ مکرمہ کو واپس لوٹے۔ پھر عازم ہند ہوئے اور گجرات کو، جو اس دور میں مرکزِ علما و فقہا تھا، اپنا مسکن ٹھہرایا۔ وہاں طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ بعد ازاں عمر کے آخری دور میں مانڈو تشریف لے گئے اور وہیں اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔
 شیخ ابوالقاسم بن احمد مکی نہایت اونچے درجے کے شافعی المسلک فقیہ تھے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی، نزہۃ الخواطر میں محمد بن عمر آصفی کی تصنیف ظفر اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالقاسم مکی نے جب ساحل ہند پر قدم رکھا تو ان کے پاس صحیح بخاری کی شرح، فتح الباری کا ایک نسخہ تھا، جو ان کے والد اور عم محترم کے ہاتھ کا مکتوبہ تھا۔ یہ نسخہ انھوں نے گجرات کا ٹھہراؤ کے ایک حکمران کو پیش کیا۔^{۳۳} سلطان محمود شاہ بیکرہ کی وفات کے بعد، گجرات سے مانڈو گئے اور اسی سال سے زائد عمر پا کر ۹۲۵ھ میں فوت ہوئے۔^{۳۴}

^{۳۲} نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳، ۱۴۔

^{۳۳} یہ نسخہ سلطان محمود شاہ بیکرہ (متوفی ۲ رمضان المبارک ۹۱۷ھ) کو پیش کیا تھا۔ معلوم

ہوتا ہے، فتح الباری کا یہ پہلا نسخہ تھا جو دیار ہند میں آیا اور اسے ایک شافعی المسلک فقیہ مکہ مکرمہ سے یہاں لائے۔

^{۳۴} نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴، ۱۵۔

۱۸۔ قاضی ابوالمعالی بخاری

قاضی ابوالمعالی بخاری، شیخ عصر، عالم کبیر اور فقیہ زمان تھے۔ کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ان کے عہد میں فروع و اصول میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ فقہ حنفی پر ان کی دست نظر کا یہ عالم تھا کہ بقول مولوی رحمان علی کے:

”اور فقہ چناں دست گا ہی داشت کہ اگر بالفرض والتقدیر جمع کتب فقہ حنفی از عالم بر افتادے، او از سر نو تو انست نوشت“^{۳۵}

یعنی وہ علم فقہ میں اس درجہ دست گاہ رکھتے تھے کہ اگر بالفرض فقہ حنفی کی تمام کتابیں دنیا سے ختم ہو جائیں تو وہ انھیں از سر نو لکھ سکتے تھے۔

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی رقم طراز ہیں کہ فقہ پر انھیں اس درجہ عبور حاصل تھا کہ اس موضوع سے متعلق حسب المفتی کے نام سے انھوں نے ایک مبسوط و مفصل کتاب لکھی جو تقریباً ساٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کا ایک نسخہ خدابخش لائبریری (پٹنہ۔ ہندوستان) میں موجود ہے۔ اس کا آغاز ”الحمد لله الذی جعل العلم هداية الى الدرجات العظمیٰ“ الخ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔^{۳۶}

یہ نامور عالم و فقیہ، دراصل توران کے رہنے والے تھے، ۹۶۹ھ میں مغل حکمران جلال الدین اکبر کے عہد میں برصغیر پاک و ہند میں آئے اور آگرہ میں مقیم ہو گئے۔ آگرہ میں انھوں نے مسند دین و تدبیر آراستہ کی، جس میں بے شمار حضرات نے اخذ علم کیا، ان کے شاگردوں میں اکبری عہد کے مشہور مورخ و عالم ملا عبد القادر بدایونی بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنی معروف تصنیف منتخب التواریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

قاضی ابوالمعالی، عزیز بخاری کے داماد، شاگرد اور خلیفہ تھے۔ ان کو فقہ پر ایسا عبور تھا کہ اگر

^{۳۵} تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۔

^{۳۶} نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۶۔

فقہ حنفی کی تمام کتابیں دنیا سے اٹھالی جائیں تو وہ از سر نو، ان سب کو لکھوا دیتے۔ انھوں نے عبداللہ خاں بادشاہ توران کو فن منطق اور علم جدل، ختم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ماوراء النہر سے ملا عصام الدین الفرائسی امدان کے بد باطن طلبا ان ہی کی وجہ سے شہر بدر کیے گئے تھے۔ اس ہنگامہ کا سبب یہ ہوا کہ جب یہ علم بخارا اور سمرقند میں پھیلا تو خبیثت اور شریر لڑکے جہاں بھی کسی مسلم الطبع صلح آدمی کو دیکھتے تو کہنے لگتے، ”بہنو گدھا ہے“ (ہذا حمار) کیونکہ ”لا حیوان“ اس سے سلوب ہے منطق کی اصطلاح میں ”نفی عام“ چونکہ ”نفی خاص کو مستلزم“ ہے، لہذا اس سے سلب انسانیت لازم آتا ہے۔ اس قسم کے نفی مخالفے جب کثرت سے پھیل گئے تو قاضی ابوالمعالی نے والی توران عبداللہ خاں کو اس کے سد یاب پر آمادہ کیا اور اس گروہ کا اخراج کر دیا اور منطق و فلسفہ کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی۔ اسی زمانے میں قاضی ابوالمعالی کے مخالفوں نے یہ روایت بھی ان کی طرف منسوب کی، کہ وہ کہتے ہیں جس کا غلطیہ منطق لکھی ہو، اس سے استنجا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔^{۳۱۷}

اس کے ساتھ ہی ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:

قاضی ابوالمعالی ہمیشہ ہر نماز کے بعد حلقہ میں ذکر کیا کرتے اور مدینا تے تھے۔ ۵۹۹ھ کو آگرہ آئے تھے۔ میں نے شرح وقایہ کے پہلے چند سبق ان سے پڑھے۔ بلاشبہ وہ اس فن میں بجز بے پایاں تھے۔^{۳۱۸}

مولانا محمد حسین آزاد نے دوبارہ اکبری میں ”شیخ عبدالقادر بدایونی امام اکبر شاہ“ کے عنوان کے ضمن میں قاضی ابوالمعالی کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

قاضی ابوالمعالی بخاری کو جب عبداللہ خاں ازبک نے جلاوطن کیا تو وہ بھی آگرہ آئے۔ ان کے جلاوطن کرنے کا قصہ بھی عجیب ہے۔ خود لکھتے ہیں کہ جب علم منطق توران میں پہنچا تو دیکھتے ہی دیکھتے لوگ بڑے شوق سے متوجہ ہوئے مگر مصالح ایسا تیز لگا کہ سب فلسفی فیلسوف ہو گئے۔ جب کسی نیک بخت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کی منہسی کرتے اور کہتے، ”گدھا ہے گدھا“ لوگ منع کرتے تو کہتے کہ ہم دلیل منطقی سے ثابت کر دیتے ہیں۔ دیکھو ظاہر ہے کہ یہ لایحوان ہے اور

حیوان عام ہے، انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو کہ اس سے خاص ہے، وہ بھی نہیں۔ پھر گدھا نہیں تو کیا ہے۔ جب ایسی ایسی باتیں حد سے گزر گئیں تو مشائخِ حنفیہ نے فتویٰ لکھ کر عبداللہ خاں کے سامنے پیش کیا، اور منطق کا پڑھنا پڑھنا احرام ہو گیا۔ اس میں قاضی ابوالمعالی، ملا عمام، ملا مرزا جان اور اکثر شخص بد عقیدہ ہو کر دہاں سے نکالے گئے۔^{۳۹} اس سے آگے ملا عبدالقادر بدایونی کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

(ملا عبدالقادر) کہتے ہیں کہ چند سبق شرح وقایہ کے میں نے بھی قاضی ابوالمعالی سے پڑھے اور حق یہ ہے کہ اس علم میں دریائے بے پایاں تھے۔ نقیب خاں بھی اس میں شریک ہوئے۔ یہ مسائل فقہ پر مشتمل ان کی تصنیف حسب المفتی ہے، جس کے نسخے بانکی پور، رام پور، قاہرہ اور انڈیا آفس لندن کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔^{۴۰} دسویں صدی ہجری کے اس عظیم اور جید عالم دین کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو

سکا۔

۱۹۔ شیخ ابوزید برہان پوری

شیخ ابوزید بن لشکر محمد برہان پوری، شیخ صلاح اور فقیہ وقت تھے۔ مشائخِ عشقیہ شطاریہ میں سے تھے۔ اپنے والد اور شیخ عیسیٰ بن قائم سندھی سے اخذ فیض کیا۔ پھر مشائخ پر فائز ہوئے۔ خلیف کثیر کو فیض پہنچایا، عبادت گزار، زاہد، قانع، عقیف اور متوکل علی اللہ تھے۔ تمام دنیوی علاقوں سے منقطع ہو کر عبادتِ الہی میں مصروف ہو گئے تھے۔ ۹۹۹ھ میں فوت ہوئے۔^{۴۱}

۳۹ قاضی ابوالمعالی کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں، کیوں کہ وہ تو بہت بڑے فقیہ تھے اور خود اہل منطق کی اس قسم کی مخالط آمیزیوں سے شاک تھے۔ ان ہی نے تو عبداللہ خاں سے اس کی شکایت کی تھی۔ ان کے توران سے نکلنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ علمائے منطق ان کے شدید مخالف ہو گئے تھے۔

۴۰ دربار اکبری، ص ۲۲۵۔

۴۱ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ص ۳۰۱۔

۴۲ اذکار ابرار، ص ۳۹۳، ۳۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۔

۲۰۔ مولانا اشیر الدین کا ہانی

مولانا اشیر الدین بن عبدالعزیز ابہری ثم کاہانی سندھی، اپنے وقت کے معروف علما اور اصحابِ صلاح و تقویٰ میں سے تھے۔ محدث اور شیخ تھے۔ درحقیقت ہرات کے رہنے والے تھے، وہاں سے ۹۲۸ھ میں اپنے والد بکر م شیخ عبدالعزیز کے ساتھ بلادِ سندھ میں آئے اور ایک گاؤں ”کاہان“ میں سکونت پذیر ہو گئے، جو اس زمانے میں سیوستان کے نواح میں اقلیم سندھ میں واقع تھا۔ تمام علوم میں ماہرِ کامل تھے۔ مروجہ کتبِ حدیث اپنے والدِ محترم سے پڑھیں۔ ہر وقت درس و افادہ میں مصروف رہتے۔ بلادِ سندھ کے بے شمار طلباء نے ان سے اخذِ علم کیا۔^{۱۵۶}

میر علی شیر قانع ٹٹھنھوی نے تحفۃ الکرام میں ان کا اور ان کے والد ماجد کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

مخدوم عبدالعزیز محدث ابہری اور ان کے فرزند تبحر اور تحقیق و تدقیق میں یگانہ اور اقلیمِ علم کے شہنشاہ، جامِ فیروز کے زمانے میں شاہ اسماعیل صفوی کی بغاوت کی وجہ سے اپنے دونوں گویہرانِ عالی (یعنی ہراسر افضل و سزنا پاہنر فرزندوں، مولانا اشیر الدین جن کی فضیلت و کمال کا غلغلہ حدِ آسمان سے بھی اوپر جا پہنچا تھا اور مولانا یار محمد جو جامِ معیتِ علوم میں یگانہ روزگار تھے، کے ساتھ ہرات سے موضع کاہان میں تشریف فرما ہوئے اور مولانا لیدر تلامذہ کی مانند اس سرزمین کو اشاعتِ علم سے سرورِ روح کا چشمہ بنا دیا۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے ہمیں کے ہو رہے اور کتابِ حیات کے مطالعہ سے ہمیں آنکھیں بند کیں۔ شرح مشکوٰۃ شریف اور اکثر کتبِ مروجہ کے حواشی جیسی عجیب و غریب تصنیفات یادگار چھوڑ گئے۔^{۱۵۷}

^{۱۵۶} ماثر حمی ج ۲، ص ۲۷۵۔

^{۱۵۷} تحفۃ الکرام ص ۲۲۲۔ نیز دیکھیے نثر تہذیب الخواہج ص ۱۷۔

محمد معصوم بھکری نے بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی روایت کے مطابق وہ ۹۱۸ھ میں شاہ اسماعیل سفوی کی بغاوت کی وجہ سے واردِ کابلان ہوئے نیز یہ کہ ان کی شرح مشکوٰۃ مکمل نہیں ہو سکی اور اس کا مسودہ ان کے کتب خانے میں موجود ہے۔^{۱۱۱}

۲۱۔ شیخ احمد بن ابوالفتح غازی پوری

شیخ احمد بن ابوالفتح غازی پوری شہر غازی پور میں پیدا ہوئے، جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ وہیں پلے بڑھے اور اپنے والد ماجد شیخ ابوالفتح اور دیگر علمائے عصر سے کسبِ علم کیا۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ پر کامل عبور رکھتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے انھیں بہت بڑے فقیہ و عالم اور شیخ قرار دیا ہے۔ بعد کو موضعِ زمانیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، جو اعمالِ غازی پور میں ایک قریہ ہے۔ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے اور یہی ان کا اصل مشغلہ تھا۔^{۱۱۲}

۲۲۔ قاضی احمد بن اسماعیل ظفر آبادی

قاضی احمد بن اسماعیل حسینی واسطی ظفر آبادی، احمد نور کے نام سے معروف تھے۔ عالم و قاضی تھے۔ فقہ حنفی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ فہمِ حدیث میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ ظفر آباد کے منصبِ قضا پر فائز تھے۔ تصوف و سلوک سے بھی لگاؤ تھا اور اس سلسلے میں اپنے والدِ بزرگم سے بیعت تھے۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ تصوف کے موضوع پر رموز المعانی ان کی تصنیف ہے۔ اپنے نام سے ایک قریہ آباد کیا، جس کو احمد نور کے نام سے موسوم کیا، نعل حکمران جلال الدین ابرک کے عہدِ حکومت میں ۹۹۵ھ میں وفات پائی۔ ”گلزارِ ارم یا فتنہ“ داد کا تاریخ ہے۔^{۱۱۳}

۱۱۱۔ تاریخ معصومی فارسی ص ۱۰۶

۱۱۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۱۸ بحوالہ عاشقینہ۔

۱۱۳۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۹۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۱۸۔

۲۳۔ شیخ احمد بن اسحاق سندھی

شیخ احمد بن اسحاق سندھی، ارضِ سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ شیخ عبدالرشید سندھی سے علم حاصل کیا اور سندھ تدریس کو زینت بخشی۔ سرزمینِ سندھ کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ نہایت صالح و عقیق ہمتی و پرہیزگار اور متدین شخص تھے۔ ان کے بہت سے کثوف و کرامات اور عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں۔ ۹۳۶ھ کو سندھ کے ایک مقام ہالہ کٹھہ میں فوت ہوئے رحمۃ اللہ علیہ

۲۴۔ شیخ احمد بن اسماعیل مندوی

شیخ احمد بن اسماعیل قادری مندوی، اپنے وقت کے عالم و محدث تھے۔ حدیث، فقہ اور دیگر علوم کے ماہر تھے۔ حرمین شریفین کا سفر کیا اور طویل عرصہ تک مشہور شافعی المساک عالم شیخ محمد بن ابوالحسن البکری سے اسلاک و لزوم اختیار کیے رکھا اور ان سے اخذِ علم بھی کیا رحمۃ اللہ علیہ

نہ تو ان کی کسی تصنیف کا پنا چل سکا ہے اور نہ تاریخِ ولادت و وفات کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکے ہیں۔

۲۵۔ شیخ احمد بن بدرالدین مصری

شیخ احمد بن بدرالدین عباسی مصری ثم ہندی گجراتی، ان کا لقب شہاب الدین تھا۔ شافعی المساک تھے۔ جید عالم، بہت بڑے محدث اور اپنے عصر کے شیخ تھے۔ تقویٰ و صالحیت میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے علم و فضل کی فراوانیوں کی وجہ سے اس دور کے

۱۱۵ تاریخ معصومی ص ۲۹۹۔ تحفۃ الکرام ص ۴۶۲، ۴۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۸۔

۱۱۶ اذکار ابرار ص ۲۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۸۔

علمائے کرام ان کی انتہائی توفیق کرتے تھے۔

یہ عالم دین جمعہ کی رات ۲، ۹ کو مصر میں پیدا ہوئے اور بڑھاپے سن بھالتے ہی حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ اپنے دور کے مشاہیر مشائخ و فضلاء کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کیا جن میں شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری، علامہ شیخ برہان الدین بن ابوشریف، شیخ الامام نور الدین کئی، شیخ کمال الدین طویل، شیخ زین الدین غزی اور شیخ نور الدین بلخی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔ ۳۶۷ھ کو مدینہ میں شیخ الاسلام ابو العباس طنباوی بکری سے ملے اور ان سے اخذِ علم کیا۔

شیخ احمد مصری مذاہبِ اربعہ اور ان کی فقیہیات پر نحو و کتب تھے۔ ان کے موقوفات و مسودات میں سے جو علمی چیزیں ان کے بعد دستِ یاب ہوئیں، وہ حسبِ ذیل ہیں :

۱- فقہ سے متعلق نووی کی المنہاج پر حواشی و تعلیقات۔

۲- شاطبیہ، جو قرأت کے بارے میں ہے۔

۳- حدیث کے موضوع پر مقدسی کی العمدة پر حواشی۔

۴- نووی کی اربعین پر حواشی۔

۵- الاجر و میہ، جو علمِ نحو کے موضوع پر ہے۔ ۶- مختصر ابی جعاف پر حواشی۔

یہ شافعی محدث و فقیہ، علمِ حرف یعنی حروف کے محل استعمال اور ان کی خصوصیات، علمِ فلکیات اور علمِ میقات میں بھی یدِ طولی رکھتے تھے۔ علمِ فضل کی اس فراوانی کے ساتھ ساتھ خشیتِ الہی، ورع و تقویٰ، انکسار و تواضع، لوگوں سے اختلاف اور میل جول سے احتراز، مواقعِ شہرت سے گریز، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے تمسک، اسلکِ سلف کی پابندی اور قرآن و حدیث پر عمل، ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

ان کے والد بزرگوار شیخ بدر الدین مصری کے بارے میں بیچکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ ملکِ شام میں قیام فرما تھے کہ شدید مرض میں مبتلا ہو گئے اور حالتِ مرض میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین اور آپ کی رسالت اور نبوت کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے ملتی صحبت ہوئے۔ چنانچہ عالمِ دنیا میں آنحضرت کی زیارت ہوئی۔ آپ ان سے فرما

رہے ہیں، ”ابو احمد اکھڑے ہو جاؤ تمہیں اس مرض سے اللہ نے شفا یاب کر دیا ہے۔“ اس وقت ان کے کوئی ایسا بچہ نہ تھا جس کا نام احمد ہو اور ان کی بیوی مصر میں تھیں، جو حالت حمل میں تھیں۔ چند روز بعد بچے کی ولادت کی اطلاع آئی، اس بچے کا نام انھوں نے احمد رکھا اور یہ وہی احمد ہیں جن کا اسم گرامی سر عنوان ہے۔

شیخ احمد کو بے شمار اشعار یاد تھے، جو اکثر مجلسوں میں سناتے تھے اور ان کا منظر بھی بیان فرماتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ ۹۲۳ھ کے لگ بھگ میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھا کہ وہاں میں نے عبداللہ بکثیر سے یہ واقعہ سنا، وہ کہتے تھے کہ مکہ مکرمہ میں ایک مصہوی عالم تشریف لائے۔ ایک روز انھوں نے حرم شریف میں وعظ کنا شروع کیا۔ انھوں نے پہلے الحمد للہ والصلوة والسلام علی رسول اللہ پڑھا۔ پھر وعظ کا آغاز مندرجہ ذیل اشعار سے کیا اور کہا کہ بچپن میں میرے والد نے مجھے یہ اشعار سنائے تھے:

اذا شئت ان تحي سليمان الاذى و ذنبك مغفور وعرضك صدين

فلا ينطق منك اللسان بسوءة فعندك سوءات وللناس الحسن

وعيدك ان اهدت اليك معايبا فغمض وقل يا عين للناس اعين

وعاشر بمعروف وسامح من اعتدى ولا تدفع الا بالتي هي احسن

اگر تم ازینوں اور کلیفوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور یہ خواہش رکھتے ہو کہ تمہارے گناہ بخشے جائیں اور تمہاری عزت مستون رہے۔

تو اس کی صورت یہ ہے کہ کسی کے بارے میں تمہاری زبان سے برائی کی کوئی بات نہ نکلنے پائے، کیوں کہ اگر تم لوگوں کی برائیوں سے واقف ہو تو لوگ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

اگر تمہاری آنکھیں کسی کے عیوب تمہارے سامنے ظاہر کریں تو خاموش ہو، اور آنکھوں سے کہو کہ لوگوں کے پاس بھی آنکھیں موجود ہیں۔

نیکی کی بات کرو اور زیادتی کرنے والے سے درگزر نہ کرو اور لوگوں سے بدترین انانہ سے گفتگو کرو۔

فقہائے ہند جلد سوم

وہ ان اشعار کی مکمل تصویر تھے۔

کان واللہ فقیہا عالما

غیر لایدری مدارات الوری

ولہ عرض مصعون ما انعم

ومدارات الوری امر مہم

بخدا وہ فقیہ اور عالم تھے۔ ہر قسم کے اتہام سے ان کی عزت محفوظ تھی۔

وہ اس بات کی پرواہ نہ کرتے تھے کہ لوگ کیا سلوک کرتے ہیں اور لوگ

کام سلوک بہت بڑی چیز ہے۔

شیخ احمد بن بدر الدین شافعی مصری نے ۴ رمضان المبارک ۹۹۲ھ کو احمد آباد میں

وفات پائی۔

۲۶۔ شیخ احمد بن جعفر گجراتی

شیخ احمد بن جعفر بن محمود حسینی سندھی گجراتی، ۸۷۰ھ کو گجرات میں پیدا ہوئے اور

وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد المکرم شیخ جعفر اور دیگر علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذتہ

کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل عرصہ تک تدریس اور افادۂ طلباء میں مصروف

رہے۔ پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ وہاں سے واپس

آ کر پھر گجرات میں مسند تدریس کو رونق بخشی اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

اپنے دور کے شیخ و عالم اور ماہر تجوید تھے۔ قرأت و تجوید اور علوم دینیہ میں یدِ ظنی رکھتے

تھے۔ دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین سے بے شمار علماء و طلباء استفادہ

کیا۔ پیر کے دن ۱۶ صفر ۹۴۴ھ کو وفات پائی۔

۲۷۔ شیخ احمد بن خلیل بیجا پوری

شیخ احمد بن خلیل بیجا پوری، عالم و فاضل اور محدث تھے۔ اساتذہ ہند سے تعلیم

لئے انور سافر، ص ۴۰، تا ۴۰۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۱۹،

۱۱۹ھ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۲۰، بحوالہ مرآت احمدی

حاصل کی، پھر حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے، بعد ازاں وہاں کے ائمہ عصر سے علم حدیث پڑھا اور مراجعت فرمائے ہند ہوئے۔ یہاں آکر عادل شاہ بیجاپوری کے ندما و مقربین میں شامل ہو گئے۔ وہ ان سے اس قدر قرب و ربط رکھتا تھا کہ سفر و حضر میں اپنے سے جدا نہ ہونے دیتا۔ اس محدث و فقیہ نے عید الفطر کی رات ۹۸۰ھ کو موضع کندر میں وفات پائی جو اعمال بلگام میں واقع ہے۔ ان کے بعض شاگردوں نے لفظ فرشتہ سے ان کی تالیخ و وفات نکالی ہے ۱۱۷ھ

۲۸۔ شیخ احمد بن زین الدین جون پوری

شیخ احمد بن زین الدین بروہی جون پوری، جون پور کے نواح میں ایک مقام ”دبرونہ“ کے رہنے والے تھے۔ صلح عالم دین اور فقیہ عصر تھے۔ بہت ہی نیک اور پرہیزگار تھے۔ شیخ معروف بن عبدالواسع جون پوری کے شاگرد تھے، اور شیخ معروف مولانا اللہ داد کے تلمیذ و مرید تھے، جو مدارک التنزیل، ہدایہ، کافیہ اور شافیہ کے تالیف تھے۔ شیخ احمد نے اخذ طریقت بھی شیخ معروف سے کیا اور لمبی مدت تک ان سے وابستہ رہے یہاں تک کہ مرتبہ کمال کو پہنچے۔

اکثر علوم و روحیہ ماہر تھے۔ متبع شریعتِ مطہرہ اور زاہد و قانع بزرگ تھے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کے تحائف و ہدایا قبول نہ کرتے اور اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ ان کے شیخ نے کچھ رقم دے دی تھی، اس سے تجارت کرتے اور جو نفع حاصل ہوتا، اس سے گزربسر کرتے تھے۔ ان کے یہ اقوال مشہور ہیں:

الزم الفقواء فان الخیر فیہم

واسأل العلماء فان الحق معہم

کہ فقرار سے وابستہ رہو، خیر ان ہی میں ہے۔

امور دینیہ میں علما سے سوال کرو، اس لیے کہ حق ان ہی کے ساتھ ہے۔
یکم جمادی الاخریٰ ۱۳۶۳ھ کو بروہن میں انتقال کیا۔

۲۹۔ شیخ احمد بن ضیاء الدین مندوی

شیخ احمد بن ضیاء الدین حسینی مندوی، مشہور عالم و فقیہ تھے اور تصوف و طریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ سراج العاشقین کے لقب سے ملقب تھے۔ شیخ سلیمان بن عفان مندوی کے فیض یافتہ تھے۔ عابد و زاہد، قلیل الطعام، قلیل النوم، راضی برفا الہی اور متوکل علی اللہ تھے۔ ۲۹ محرم ۹۸۸ھ کو فوت ہوئے۔

۳۰۔ شیخ احمد بن عبدالقدوس گنگوہی

شیخ احمد بن عبدالقدوس گنگوہی حنفی المسک تھے اور علم و فقاہت میں معروف! تصوف و سلوک سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور مشہور مشائخ وقت میں سے گردانے جاتے تھے۔ اپنے والد بزرگ و شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے فیض یافتہ تھے۔ سماعِ غنا، تواجد، اور وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس باب میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔ حلتِ غنا اور اثباتِ وحدت الوجود سے متعلق انھوں نے الگ الگ رسالے تصنیف کیے۔ لیکن ان مسائل میں ان کے بیٹے شیخ عبدالنبی محدث گنگوہی صدر الصدور نے ان کی مخالفت کی اور حرمتِ سماع پر ایک رسالہ تصنیف کیا، جس میں اپنے والد اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مسک کی سخت تردید کی۔ اس پر شیخ عبدالقدوس نے ان کو گھر سے نکال دیا اور وہ دہلی چلے گئے۔ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کو ان کی عافیت کا پتا چلا تو اس نے ان کو ہند کی وزارتِ عظمیٰ پر متمکن کیا اور صدر الصدور کے منصب سے

۱۸۳۳ تہذیبہ الخواطر، ج ۴، ص ۲۲، ۲۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۸

۱۸۳۴ تہذیبہ الخواطر، ج ۴، ص ۲۳ بحوالہ اخبار الاصفیاء۔

نواز۔ شیخ احمد بن عبدالقدوس نے ۹۷۲ھ میں وفات پائی۔

۳۱۔ شیخ احمد بن عبدالملک لاہوری

شیخ احمد بن عبدالملک لاہوری فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ نہایت فاضل تھے اور حدیث و فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔ بعض درسی کتابیں شیخ منصور لاہوری نے پڑھیں اور امہات الکتب کے لیے شیخ عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری کے سامنے لائے۔ تلمذ نہ کیا اور ان ہی کے ساتھ لاہور آئے اور پھر بیس سکونت پذیر ہو گئے۔ سراپا فاضل، فتاویٰ اللہ، پیکر زہد اور بدرجہ غایت پابند شریعت تھے۔ ہمیشہ تدریس و افادہ میں مامور رہے۔ جمعہ کے روز ۱۰ محرم ۹۶۶ھ کو فوت ہوئے۔

۳۲۔ شیخ احمد بن مجد الدین شیبانی

شیخ احمد بن مجد الدین بن تاج الدین شیبانی نرنولوی، امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی کی نسل سے تھے۔ نرنول میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ شیخ حسن بن خالد ناگوری اور شیخ بایزید بن قیام الدین اجیری سے تحصیل کی اور عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ شیخ وقت اور بہت بڑے عالم تھے۔ کتابوں پر عبور و استحضار کا یہ عالم تھا کہ اٹھارہ سال کی عمر میں سند تدریس پر فائز ہو گئے تھے۔ نرنول سے اجیر چلے گئے تھے۔ جب رانا سانگا اجیر پر حملہ آور ہوا اور اس نے مسلمانوں کو قتل اور ان کے اموال و دولت کو لوٹنا شروع کیا تو ۹۲۲ھ کو وہاں سے نکلے اور نرنول چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے، پھر ناگور منتقل ہو گئے۔ وہیں سفر آخرت کو روانہ ہوئے۔ بڑے فاضل، متقی اور متورع بزرگ تھے۔ ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

۱۵۵ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۳ بحوالہ اخبار الاصغیاء

۱۵۶ ایضاً، ص ۲۳، ۲۴۔

میں مصروف رہتے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے۔ ان کا معمول تھا کہ آدھی رات کو اٹھ جاتے اور ذکر و عبادت اور تہجد میں مصروف ہو جاتے۔ چاشت کے وقت تک کسی سے بات نہ کرتے۔ اس کے بعد ظہر تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ پھر عصر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ عصر کے بعد وعظ و تذکیر کے انداز میں مدارک التنزیل کا درس دیتے۔ درس کے وقت ان پر رفت و بجا کا غلبہ طاری رہتا اور قلب کی دنیا بدی ہوتی نظر آتی۔ مدارک التنزیل کے درس کا وہی انداز تھا جو ان کے بزرگوں اور اساتذہ کا تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی بڑے سے بڑے کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، جو وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کم عمری کے دور میں طلبِ معاش کے سلسلے میں اپنے چند متعلقین کے ساتھ مانڈو گئے۔ شیخ محمود دہلوی وہاں کے شیخ الاسلام اور حکومت کی طرف سے علما کے صدر الصدور تھے۔ جماعت کھڑی ہوئی تو شیخ محمود نے اللہ اکبر کہہ کر امام سے پہلے ہی نماز کے لیے ہاتھ باندھ لیے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو شیخ الاسلام سے کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ شیخ احمد کو یہ بات ناگوار گزری، وہ آگے بڑھے اور شیخ الاسلام سے کہا، آپ کی نماز نہیں ہوئی، اس لیے کہ امام کے کبیر کہنے سے پہلے ہی آپ نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے تھے۔

مانڈو کی شاہی رسم یہ تھی کہ لوگ پوری طرح زمین کی طرف جھک کر اور انگوٹھا زمین پر رکھ کر شیخ الاسلام کو سلام کرتے تھے، لیکن شیخ احمد شیبانی اور قاضی ادیس دہلوی جو ایک زبردست عالم تھے، شاہی رسم کے مطابق سلام نہیں کرتے تھے، وہ بروا کنتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ یہ دونوں شریعت کے مطابق اسلام علیکم کہتے اور بادشاہ کے برابر بیٹھتے تھے۔ بادشاہ نے عدل و انصاف کے تقاضوں کو بطریق حسن پورا کرنے کی غرض سے قاضی ادیس کو اجمیر کا قاضی مقرر کیا تھا اور چار گاؤں انعام میں دیئے تھے اور مسند افتا شیخ احمد کے سپرد تھی۔ ان کے اسلاف بھی اس مسند پر فائز تھے۔

اس عالم دین نے ۲۵ صفر ۹۲ھ کو انتقال کیا۔

۳۳۔ شیخ احمد بن محمد نروالی

شیخ احمد بن محمد بن قاضی خان عدنی خرقانی۔ ان کی کنیت ابو العباس تھی اور لقب علاء الدین۔ یہ ابو العباس علاء الدین احمد نروالی گجراتی کے نام سے معروف تھے۔ مفتی قطب الدین محمد نروالی کے والد تھے جو مکہ مکرمہ کے منصب افتا پر فائز تھے ان کے جد امجد کا نام قاضی خاں تھا، مگر یہ وہ قاضی خاں نہیں ہیں، جو مشہور فتاویٰ (قاضی خاں) کے مصنف ہیں، بلکہ یہ علمائے نروالیوں سے ہیں۔

شیخ احمد بن محمد ۸۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور نروالی کے فاضل علما سے علم حاصل کیا۔ پھر عازم حرمین شریفین ہوئے اور وہاں امہ حدیث کی ایک بڑی جماعت سے کتب احادیث پڑھیں۔ یہ صحیح بخاری کی سند عالی کے حامل تھے جس کا سلسلہ صرف چھ سطروں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے، جو درج ذیل ہے :

شیخ احمد بن محمد نے صحیح بخاری حافظ نور الدین ابو الفتح احمد بن عبد اللہ طائوسی۔ نزل گجرات سے پڑھی جو صلاح و تقویٰ سے متصف تھے۔ انھوں نے شیخ یوسف ہروی سے پڑھی جو صد سالہ کے نام سے معروف تھے یعنی انھوں نے تین سو سال عمر پائی۔ انھوں نے محمد بن شاذلی فرغانی سے پڑھی جو ایک معمر بزرگ تھے۔ انھوں نے سمرقند کے ایک بہت بڑے بزرگ شیخ ابوالقمان سجستانی بن عثمان بن مفضل بن شاہان ختلانی سے پڑھی جنھوں نے ایک سو تین تالیس سال عمر پائی۔ انھوں نے شیخ محمد بن یوسف فربری سے سماعت کی۔ انھوں نے خود جامع صحیح بخاری امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔

شیخ ابو العباس احمد علاء الدین نروالی، نہایت صالح، عالم دین اور اپنے دور کے معروف محدث تھے۔ مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کر لی تھی، آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے قطب الدین محمد کا بیان ہے کہ جب تک میرے والد کی بینائی قائم رہی وہ ہر سال قربانی کے دن رمی سے فوراً بعد حجرہ عقبہ سے مکہ مکرمہ آجاتے، بیت اللہ کی طرف رخ کر کے حطیم میں بیٹھ جاتے اور طواف کرنے والوں کو دیکھتے رہتے۔ وہ نماز مغرب تک وہیں بیٹھتے۔ مغرب کے بعد بیت اللہ کا طواف اور سعی کرتے۔ پھر منیٰ میں واپس چلے جاتے۔

فرمایا کرتے اولیاء اللہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر سال حج کریں اور افضل پر عمل پیرا ہوں، اور افضل یہ ہے کہ یوم النحر کو دن کے پہلے حصے میں طواف زیارت کے لیے آئیں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں اور حطیم میں بیٹھ کر طواف کرنے والوں کو دیکھتا رہتا ہوں، شاید کہ میری نظر کسی ایسے نیک آدمی پر پڑ جائے یا اس کی نظر مجھ پر پڑ جائے جس کی وجہ سے میں اللہ کے نزدیک کامیاب قرار پا جاؤں۔ بینائی ختم ہونے کے بعد بھی وہ معمول کے مطابق وہاں آ کر بیٹھ جاتے اور فرماتے، میں تو کسی کو دیکھ نہیں سکتا، لیکن ممکن ہے کسی مردِ صالح کی نظر مجھ پر پڑ جائے اور میں اللہ کا صالح بندہ بن جاؤں۔ ان کی وفات ۹۴۹ھ کو مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

۳۴۔ شیخ احمد بن محمد ہبیری

شیخ احمد بن محمد بن طیب حنفی ہبیری، عالم و فقیہ تھے اور ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور فقہاء میں ہونا تھا۔ قصبہ ہبار کے قریب ایک قریب میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ ہبیر بن طیب سے جو اس دور کے عالم دین اور مشہور اساتذہ میں سے تھے اور شیخ بدھ طیب کے نام سے معروف تھے، کسب علم کیا۔^{۱۵۹} سز زین ہند کے دسویں صدی ہجری کے اس فقیہ کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا معلوم ہوتا ہے مینصف نہ تھے بلکہ مسائل فقہ پر عبور رکھتے اور طلباء کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔

۳۵۔ مفتی احمد بن محمد سندیلوی

مفتی احمد بن محمد حسینی سندیلوی، شیخ وقت، عالم و فقیہ اور اصولی تھے۔ مسلک حنفی تھے۔ اپنے عصر کے ان فقہاء و اصولیین میں سے تھے جو اس ضمن میں خاص شہرت کے حامل تھے۔ صوبہ یوپی کے شہر سندلیہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما

۱۵۵۱ء اعلام باعلام بیت الحرام ص ۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۲۵، ۲۶ —

یاو ایام ص ۶۲۔

۱۵۹ لطف قدوسی ص ۴۷، ۴۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۲۶۔

پائی۔ اپنے والد بزرگوار اور دیگر علمائے وقت سے علم حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے شہر سندیلہ کی مسندِ افتا پر فائز ہوئے اور ایک عرصہ تک اس پر متمکن رہے۔
ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ غالباً یہ مصنف نہ تھے۔ البتہ فقہی مسائل پر مہارت رکھتے تھے اور صاحبِ فتویٰ تھے۔

۳۶۔ شیخ احمد سرہندی

شیخ احمد سرہندی حنفی مسلک کے حامل تھے۔ عالم و فقیہ تھے اور ان حضرات میں سے تھے جو اس زمانے میں سرزمینِ پاک و ہند میں فقہ و اصول کے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ تمام عمر مسندِ تدریس بچھائے رکھی اور بے شمار لوگوں کو علم فقہ کی تعلیم دی۔ مسائل فقہی پر اس درجہ عبور تھا کہ افتا میں مرجحِ خلائق ہوئے۔ ۹۸۶ھ میں وفات پائی۔

۳۷۔ شیخ احمد فیاض امیٹھوی

شیخ احمد فیاض امیٹھوی بڑے عالم، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اپنے عہد کے مشہور فقہاء میں سے تھے۔ تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کثیر المطالعہ، کثیر الدرس اور فصیح البیان تھے۔ بات چیت کا انداز بڑا پیارا، اور دھیما تھا۔ عذوبتِ لسان میں ممتاز تھے۔ علائقِ دنیوی سے منقطع ہو کر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے تھے، اور دین و تقویٰ کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ تکلفات سے قطعی دور تھے۔ فناعمت و زہدان کا شیوہ، اور مسلمانوں کی خیر خواہی ان کا پیشہ تھا۔

۱۱۷۰ھ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۷۔ بحوالہ عاشقینہ۔

۱۱۷۰ھ اذکار ابرار، ص ۵۰۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۰۔

ملا جہد القادریہ الیونی لکھتے ہیں کہ دین سے محبت کا یہ عالم تھا اور توبتِ حفظ اس درجہ تیز تھی کہ بہت زیادہ معمر ہو گئے تھے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی تھی مگر قرآن مجید ایک سال کے عرصہ میں حفظ کر لیا تھا۔ اکثر درسی کتابیں پڑھانے میں مشغول رہتے۔ کوئی شاگرد پڑھنے ہوئے غلطی کر جاتا تو محض یادداشت سے ٹوک دیتے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ میں جب ان سے ملنے گیا تو شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے۔ نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے سختی سے قائل تھے۔ ان کے ہم عصر اور ہم شہر ایک اور عالم دین شیخ نظام الدین ایٹھوی تھے، جو میاں نظام الدین ایٹھوی کے نام سے مشہور تھے، وہ فاتحہ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ شیخ احمد فیاض اس باب میں ان سے بحث کرتے، ان کی تردید فرماتے اور کہتے کہ جب حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں امام کی اقتما میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب ٹھہرایا گیا ہے تو آپ اس سے کیوں روکتے ہیں؟ اور حدیث پر کیوں عمل پیرا نہیں ہوتے؟ مولانا سید عبدالحی حسنی لاکھنوی نے انھیں حنفی المسدک قرار دیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے دسویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت فقیہ اور متقی و زاہد عالم دین کی نہ تو کسی تصنیف کا علم ہو سکا ہے اور نہ نایبِخِ ولادت و وفات کا پتا چل سکا ہے۔

۳۸۔ سید احمد ملتانی

سید احمد ملتانی حنفی فقہ، اصول، کلام اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت میں دہلی آئے اور مختلف مشائخ سے ملے۔ پھر شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی صحبت اختیار کی۔ ان سے معارف المعارف اور

۵۶۲ منتخب التواریخ ص ۳۰۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۳۱۔

۵۶۳ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۳۱۔

عوالس البیان وغیرہ کتب تصوف کا درس لیا۔ اپنے مرشد اور استاذ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی طرح یہ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے مگر علم و فضل اور فقاہت میں بیگانہ تھے۔ شیخ رکن الدین بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے لطائف قدوسی میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۱۱۱۱ھ

۳۹۔ شیخ اسحاق بن کاکول لاہوری

شیخ اسحاق بن کاکو عمری لاہوری، شیخ وقت اور حلیل القدر عالم تھے۔ مشہور بزرگ فریدالدین مسعود اجدہنی (گنج شکر) کی اولاد سے تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی اور اپنے والد شیخ کاکو (متوفی ۸۸۲ھ) سے اخذ علم کیا۔ شیخ کاکو شیخ پیر محمد لاہوری کے فیض یافتہ تھے، پیر محمد کے علاوہ انھوں نے دیگر علمائے عظام سے بھی تعلیم حاصل کی۔ ۱۱۱۱ھ

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شیخ اسحاق کا ذکر بڑے عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شیخ اسحاق کے والد کا نام شیخ کاکو تھا۔ لاہور کے لوگ شیخ اسحاق کے معتقد ہیں۔ وہ بڑے صاحب علم، متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے کبھی کسی کے دروازے پر نہیں گئے، نہ کسی سے کسی شے کے طالب ہوئے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم میں ماہر کامل تھے۔ ہر آن اللہ کی یاد میں مشغول رہتے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی، اس وقت تک از خود بات نہ کرتے تھے۔

ایک دن ایک نامعقول شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا ایک دیگیچے ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا، اس کو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلا تامل و انکار اسے

۱۱۱۱ھ لطائف قدوسی ص ۵۲، ۵۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۳۲۔

۱۱۱۱ھ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۳۲، ۳۳۔

سر پر اٹھالیا اور بازار سے لے کر اس کے مکان تک پہنچا دیا۔ اسی دن سے اس کے دل سے کھوٹ نکل گیا اور وہ دنیا داری ترک کر کے ایک عالم دین بن گیا۔

ملا عبد القادر مزید لکھتے ہیں :

میں نے ۹۹۵ھ میں شیخ موسوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ایک دن میں نے شیخ فیضی سے، جسے ان ہی دنوں ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا، مذکورہ بالا واقعہ بیان کیا۔ فیضی، جیسا کہ اس کی عادت تھی وہ رضی و حال کے تمام علما و مشائخ کا مذاق اڑاتا تھا۔ حضرت کی بھی مذمت کرنے لگا۔ اس کی باتوں پر میں صبر کر کے خاموش ہو رہا۔ ٹھیک یا نہیں وہی رات تھی یا دوسری، میں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ ابو الفضل ایک جنگل میں ٹھہرا ہوا ہے اور ایک پرانے کھنڈر میں جس کی بس دو تین دیواریں کھڑی تھیں، شیخ اسحاق ان توپوں کی جماعت میں ہیں جو ہر چاند رات کو بادشاہی اعزاز میں بندوبست سر کرتے ہیں انھوں نے بندوق اٹھا کر میری طرف چلا دی اور میرے چاروں طرف چنگاریاں بجھ گئیں۔ یہ دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں جاگ اٹھا۔ دوسرے ہی دن شیخ کی خدمت میں نذر لے کر گیا، جسے انھوں نے قبول فرمایا۔ میں نے اپنا خواب کا یہ قصہ بیان کیا تو کچھ نہ کہا، بس دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

وہ لاہور کے بہت سے مشہور علما کے استاذ ہیں، جیسے شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل جو اپنے زمانے کے بے مثل عالم ہیں اور شیخ منور وغیرہ۔

بدایونی آگے چل کر رقم طراز ہیں :

شیخ اسحاق کا کو جوانی میں شکار کے بڑے شوقین تھے، چنانچہ سبق پڑھانے سے جب فارغ ہوتے، باز، عقاب وغیرہ لے کر شکار کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور شکار گاہ میں پیدل ہی گھومتے رہتے۔ انھوں نے سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ ۹۶۶ھ میں انتقال فرمایا۔

۶۶ منتخب التواریخ ص ۲۹۵، ۲۹۶۔ نیز ملاحظہ ہو طبقات اکبری ج ۲ ص ۴۶۰، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۔

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ملا عبدالقادر بدایونی کے حوالے سے یہ سن وفات بھی لکھا ہے اور ساتھ ہی اخبار الاصفیاء کے حوالے سے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ وہ ۲۹ ربیع الاول ۹۹۷ھ کو فوت ہوئے۔

۴۰۔ شیخ اسماعیل بن ابدال لاہوری

شیخ اسماعیل کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک منتهی ہوتا ہے جو یہ ہے :

اسماعیل بن ابدال بن نصر بن محمد بن موسیٰ بن عبدالجبار بن ابوصالح بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالفتاد شریف جیلانی۔ یہ عالم اجل اور شیخ وقت تھے۔ اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں گردانے جاتے تھے۔ فقہ، اصول فقہ، کلام اور علوم عربیہ میں ان کی بہرہ وافر حاصل تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے یہ پہلے بزرگ ہیں جو برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے۔ ان سے قبل اس خاندان کے کسی بزرگ نے ہندوستان کا قصد نہیں کیا، اگر کیا بھی تو سکونت اختیار نہیں کی۔ یہ دارالسلطنت دہلی میں آئے اور عرصہ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ پھر رتھنبور منتقل ہو گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ ان سے بے شمار علما و مشائخ نے کسب فیض اور اخذ علم کیا، جن میں شیخ محمد بن حسن جون پوری شیخ عبدالملک بن عبدالغفور یانی پتی المعروف بے شیخ امان اللہ یانی پتی، علامہ جمال الدین لاہوری اور شیخ عبدالرزاق ساکن جھنجانہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

شیخ اسماعیل بن ابدال نے ۹۹۴ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ان اشعار سے نکلتی ہے۔

مسکن خود یافت در دارالسلام
نیز "اسماعیل مخدوم آنام"
۹۹۴ھ

شد جو اسماعیل از دارالبعث
رحلتش آمد عیاں ممتاز وقت
۹۹۴ھ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کا سال وفات ۹۰۶ھ تحریر فرمایا ہے ^{۶۸}۔
 شیخ اسماعیل بن ابدال کی نسبت لاہور کی طرف ہے اور یہ لاہوری مشہور ہیں
 جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لاہور میں رہے ہیں، مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ لاہور کب آئے
 اور کس زمانے میں یہاں سکونت پذیر ہوئے۔

۴۱۔ شیخ اسماعیل بن عبداللہ لاہوری

شیخ اسماعیل بن عبداللہ بن محمد حسنی اچھی نتم لاہوری، شیخ وقت صالح عالم
 دین، نامور فقیہ اور نہایت متقی تھے۔ شہر اُچ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش
 پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ عبداللہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر جلال الدین ابرکے عہد حکومت
 میں وارد لاہور ہوئے، اس نے ان کو ہزار بیگہ خراجی زمین عطا کی اور انھوں نے لاہور
 میں سکونت اختیار کر لی۔

خرزینۃ الاصفیاء میں مفتی غلام سرور لاہوری رقم طراز ہیں کہ بادشاہ بہمن جلال الدین
 اکیران کا بہت معتقد تھا۔ اس نے ان کو لاہور بلا یا اور یہاں رہنے کی درخواست کی۔ علاقہ
 فیروز پور میں گزارے کے لیے ہزار بیگہ زمین بھی عطا کی۔
 اکبر بادشاہ مشتاق دیدار پرنور آن جناب شد، اُن حضرت را در لاہور طلبیدہ،
 از غایت اعتقاد یک ہزار بیگہ زمین زرعی در علاقہ فیروز پور گزارانید و حضرت سید در لاہور
 بمقام لکھی محلہ سکونت اختیار کرد۔

مگر وہ چوں کہ بدرجہ کمال مستغنی المزاج اور فقیہ منش تھے، اس لیے زمین قبول
 کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ جلال الدین ابرک کے عہد
 میں ۹۷۸ھ کو لاہور میں فوت ہوئے ^{۶۹}۔

^{۶۸} (خبر لاخیا، ص ۲۰۸۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۱۳۵، ۱۳۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۳۶)

^{۶۹} خزینۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۱۲۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۳۷

۲۲۔ شیخ اسماعیل بن محمد ملتانی

شیخ اسماعیل بن ابراہیم فتح اللہ ربیعی اسماعیلی ملتانی ثم بیدری، احمد آباد (بیدری) میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور اپنے والد گرامی شیخ ابراہیم سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ ایک عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں اور تصوف و معرفت سے اس درجہ بہرہ یاب ہوئے کہ مرتبہ بلند کو پہنچے۔ بہت بڑے عالم، پرہیزگار اور فقیہ تھے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد سلطان عماد شاہ نے ان کو علاقہ برار میں تشریف لانے کی دعوت دی جو انھوں نے قبول کر لی اور وہاں اس نے ایک فریہ عطا کیا، جس کا نام پتھری تھا وہیں اقامت پذیر ہو گئے اور وہیں ۱۳ رمضان ۹۸۵ھ کو وفات پائی۔ لکھ

۲۳۔ علامہ اسماعیل نقشبندی لاہوری

شیخ علامہ اسماعیل لاہوری، حدیث اور فقہ کے جید علما میں سے تھے اور حدیث میں سند عالی رکھتے تھے۔ کتاب و سنت کی کتابیں ایران میں شیخ الاسلام سیف الدین شہید بروی اور شیخ جمال الدین عطار اللہ حسینی محدث سے پڑھیں۔ ۹۸۰ھ کو لاہور میں فوت ہوئے۔ لکھ

۲۴۔ شیخ اللہ بخش گیلانی لاہوری

شیخ اللہ بخش بن محمد بن زین العابدین بن عبدالقادر حسنی اوچی لاہوری، مشہور عالم و فقیہ اور برصغیر پاک و ہند کے معروف مشائخ میں سے تھے، لاہور آئے اور وہیں اقامت گزین ہو گئے۔ اپنے دور کے مقتدرائے خلائق تھے۔ خلق کثیر نے ان سے

لکھ نہ بہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷

لکھ اذا کار ابرار، ص ۴۹۸ — نہ بہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸

اخذ فیض کیا۔ لاہور سے عازم بنگال ہوئے اور بنگال میں ہی ۹۹۴ھ کو وفات پائی ^{۱۱}۔

۴۵۔ شیخ اللہ بخش گجراتی

شیخ اللہ بخش چشتی گجراتی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے اور متقی و صالح بزرگ تھے۔ طویل عرصہ تک درس و تدریس اور افادۂ طلباء میں مصروف رہے۔ پھر حجت و اشتغال سے کنارہ کش ہو کر سلوک و تصوف کی وادیوں میں آگئے تھے۔ طریقہ عشقبہ شطاریہ سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے شیخ محمد غوث گوالیاری سے اخذ فیض کیا اور خاصی مدت تک ان سے منسلک و ملازم رہے۔ ایام تصوف میں صاحب وجد و حال بزرگ تھے، لیکن زندگی کے آخری دنوں میں ان کے اندر پھر انقلاب و تغیر کی لہر اٹھی اور قرآن و حدیث کے مطالعہ کو زندگی کا نصب العین ٹھہرایا اور شب و روز اسی میں بسر ہونے لگے۔ انھوں نے ۱۲ بیع الثانی ۹۷۰ھ کو وفات پائی ^{۱۲}۔

۴۶۔ شیخ الحداد بن عبد اللہ جون پوری

شیخ الحداد بن عبد اللہ جون پوری دیار ہند میں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور شیخ عبد الملک

۱۱۵۰ اخبار الاخیار، ص ۲۰۶ بعض حالات سید زین العابدین۔ خزینۃ الاصفیاء،

ج ۱، ص ۱۳۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۹۔

۱۱۵۳ اذکار ابرار، ص ۲۰۲، ۲۰۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۳۹

۱۱۵۴ تذکرہ نگاروں نے ان کا نام الحداد لکھا ہے، لیکن درحقیقت یہ لفظ اللہ آدم ہے، اس

لیجئے آئندہ ہم اسے اللہ داد ہی لکھیں گے۔

جون پوری سے تعلیم حاصل کی جو اس دور کے جلیل القدر عالم اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے تلمیذ تھے۔ ان کو صرف ایک واسطے سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حصول علم کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور علم و افتاء اور تحقیق و تدقیق کی بلند منزلوں پر پہنچے۔

میر سید غلام علی آزاد بگرامی نے سجتہ المرجان فی آثار ہندوستان، آثار الکرام اور وفيات الاعلام میں ان کا ذکر کیا ہے، اور ان کے اساتذہ میں شیخ عبداللہ تلمیذی اور شیخ عزیز اللہ تلمیذی کے اسمائے گرامی درج کیے ہیں، لیکن زبیرتہ الخواطر میں مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی اس سے اختلاف کرتے ہیں، ان کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ تلمیذی اور شیخ عزیز اللہ تلمیذی دو بزرگ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں تلمذ (بلتان) سے دہلی گئے اور یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ اللہ داد جون پور کی مسند تدریس پر فائز تھے اور ان کا شمار اس نوح کے کبار اساتذہ میں ہونا تھا۔ لہذا ایسی صورت میں دہلی جا کر ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں کسی تذکرہ میں یہ بھی مرقوم نہیں ہے کہ انھوں نے تلمذ جا کر ان سے استفادہ کیا ہو۔ البتہ ان دونوں بزرگوں سے ان کا لقا ثابت ہے اور ایک دوسرے سے بحث مباحثہ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ ایک مرتب سکندر لودھی نے اپنی قلمرو کے تمام علما کو جمع کیا۔ ایک جانب سے تلمذ کے شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ اور دوسری طرف سے شیخ اللہ داد اور ان کے لڑکے شیخ بہکاری نے علمی مباحثہ کیا، جس سے معلوم ہوا کہ پہلے دو بزرگ تقریریں اور دوسرے دو تحریریں سب سے فائق تر ہیں۔ اگر یہ دونوں بزرگ ان کے استاذ ہوتے تو ان سے بحث و مناظرہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، اس لیے کہ استاذ کے احترام کا لقا ضایہ ہی ہے۔

شیخ اللہ داد جون پوری، تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور علم نحو میں بے نظیر تھے اور ان علوم میں ان کے زمانے میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ بیک وقت کئی خوبیوں کے حامل تھے، صاحب افتاء بھی تھے، عظیم مصنف بھی تھے اور بلند مرتبے کے مصنف اور شراح بھی!

ان کی علمی ہمہ گیری اور وسعت مطالعہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر و فقہ اور نحو تینوں علوم کی بلند پایہ کتابوں پر جو حاشی تحریر کیے اور ان کی شرحیں لکھیں جس کی تفصیل یہ ہے :

۱- تفسیر مدارک التشریح پر حواشی لکھے اور اس کے مثل مقامات کی شرح سپرد قلم کی۔ یہ حواشی پوری تفسیر کے نہیں ہیں، بلکہ سورت نمبر ۱، ۲، ۳ اور ۴ کے ہیں۔ یہ کتاب انڈیا انس لائبریری لندن میں موجود ہے۔

۲- ہدایہ کی شرح۔

۳- اصول بزدوی کی شرح اور تعلق۔

۴- کافیہ پر حواشی اور اس کے اہم مقامات کی عقدہ کشائی۔

۵- کافیہ کی شرح۔

۶- حاشیہ علی شرح جامی۔

۷- قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ جو ایک بہترین شرح ہے اور حواشی ہندیہ کے نام سے معروف ہے، اس پر حواشی۔

ان کے علمی اور تدریسی و تصنیفی کارنامے ان کے اساتذہ و شیوخ کی زندگی میں نمایاں ہو کر اہل علم کے سامنے آگئے تھے۔

شیخ اللہ داد، فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور بعد کو تصوف اور طائفت سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، تصوف اور طریقت سے لگاؤ کی بھی ایک عجیب وجہ ہوئی۔ وہ یہ کہ اس زمانے کے مشہور بزرگ اور صوفی حامد شاہ مانگ پوری جون پور میں تشریف لائے اور شیخ اللہ داد کے ہمدرد و رفیق شیخ حسن طاہران کے مرید ہو گئے۔ شیخ اللہ داد کو یہ بات ناگوار گزری اور اپنے اس دوست سے کہا کہ تم نے حامد شاہ مانگ پوری کے حلقہ ارادت میں شامل ہو کر طلبائے علم کے علمی وقار کو نقصان پہنچایا ہے۔ شیخ حسن طاہر نے شیخ حامد شاہ کے مرتبہ علم اور روحانیت کی بڑی تعریف کی مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ بالآخر حسن طاہر نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیے اور حامد شاہ کے علم تحقیق

کا امتحان کر لیجیے۔ شیخ اللہ داد نے ہدایہ کے چند مشکل مقامات ذہن میں مجتمع کیے اور ان کے حل و کشود کے لیے ان کی مجلس میں جا پہنچے۔ گفت گو ہوئی تو انھوں نے بول باتوں میں ہدایہ کے ان مقامات کی اس انداز سے تشریح کی کہ وہ حیران رہ گئے اور اسی وقت ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔

شیخ اللہ داد جون پوری نے ۹۲۳ھ کو جون پور میں وفات پائی۔ ۵۵

۴۷۔ مولانا اللہ داد بن کمال الدین لکھنوی

مولانا اللہ داد بن کمال الدین بن محمد بن محمد اعظم حسینی لکھنوی، شیخ وقت اور فاضل شخص تھے۔ ان کا شمار اس دور میں سر زمین ہند کے مشہور علما میں ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہیں بچپن کا زمانہ گزرا، اسی شہر میں شباب کی منزلیں طے کیں اور اسی کی فضا میں کہولت اور بڑھاپے کو پہنچے۔ لکھنؤ ہی کے علما سے اخذ علم کیا اور پھر وہیں درس و افتا کی مسند پر فائز ہوئے اور کتابیں تصنیف کیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں، ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

وہ نہایت صاحبِ تصرف، ذہین، مستعد اور دانش مند عالم دین تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں تو بالخصوص اس زمانے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نحو میں اعلیٰ

۵۵ اخبار الاخیار، ص ۱۹۷۔ منتخب التواریخ ص ۸۶۔

حدائق الخفیه ص ۳۶۵، ۳۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۴۱، ۴۲۔
ترویجہ الاصفیاء، ص ۴۱۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۶۳۰، ۶۳۱۔ کافر الکلام ص ۶۶،
سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ص ۴۳۔ کشف الظنون، ج ۱ ص ۱۰۰۔ فضا الارباب
من ذکر علما را نحو و الادب ص ۱۹۶۔ ابجد العلوم ص ۸۹۴، ۸۹۵۔ تجلی نور حصہ دوم
از میرزا نور الدین جون پوری ص ۳۹، ۴۰۔

نے ایک رسالہ لکھا، جس کا نام ایک مقتدر حاکم کے نام پر ”قبطون“ رکھا تھا۔ اس کی عبارت انتہائی پُر تکلف تھی۔ میں حسین خاں کے عہدِ حکومت میں جب لکھنؤ گیا تو ان سے ملاقات کی۔ ان کی تصانیف میں دو چیزیں بڑی عجیب و غریب اور نادرتھیں۔ ان میں سے ایک رسالہ تھا، جس کا طول چودہ سطر کا تھا اور عرض بھی اتنی ہی سطور کا تھا۔ اس کے حاشیوں پر بھی مضمون تحریر تھا۔ اس رسالے میں چودہ علوم کے احکام و مسائل درج تھے۔ دوسرا ایک اور رسالہ تھا، جو مقاماتِ حریری کی طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس کے پانچ حصے تھے۔ اس کا نام انھوں نے قبطون رکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میری اور بھی تصانیف ہیں۔ بدایونی اس سے آگے مزید لکھتے ہیں :

ان کے چچا نادبھائیوں کا بیان ہے کہ یہ چودہ علومِ مشتمل رسالہ اور رسالہ رقیطون دراصل حکیم زبرتی کی تصانیف ہیں جو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے زمانے میں جون پور آیا تھا اور بعض مسائل کے بارے میں ان سے اس کا مشہور مناظرہ و مباحثہ ہوا تھا اور وہ محولِ علم کا عصر میں سے تھا۔ پھر وہ دو نورسائے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے شیخ اعظم لکھنوی کے کتب خانے میں پہنچے، شیخ اعظم شیخ اللہ داد کے والد تھے، اور انھیں اہل علم کی طرف سے امام اعظم ثانی (امام ابو حنیفہ) کا خطاب ملا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ رسالے وراثتاً میاں اللہ داد لکھنوی کے قبضے میں آئے اور آخر دم تک ان کے پاس رہے۔ انھوں نے ان کی تصنیف کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔

یہ شیخ اعظم ثانی لکھنوی، مولانا اللہ داد لکھنوی کے پردادا تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے شیخ اعظم ثانی بن شیخ ابوالقاسم موسیٰ بن شیخ ضیاء الدین کرمانی۔ اپنے عصر کے متبحر عالم اور علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ تھے۔ علم فقہ میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور فقہی مسائل کے متعلق بڑی صاف اور مدلل گفتگو کرتے تھے۔ اس علم سے متعلق کئی رسائل کے مصنف تھے۔ ان کے پردادا ہلاکو خاں کے زمانے میں کرمان سے ہجرت کر پاک و ہند میں آئے اور شاہ سمرقندی سے ملاقات کی اور ان سے لکھنؤ پہنچے اور ان ہی کی وجہ سے اس شہر میں منوطن ہو گئے تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳، ۲۴)

منتخب اللباب میں خانی خاں لکھتے ہیں کہ جب جلال الدین اکبر نے جون پور کا عزم کیا اور خان زمان خاں کی طرف روانہ ہوا تو لکھنؤ بھی گیا۔ وہاں اس نے مولانا اللہ داد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کا تذکرہ شیخ عبدالنبی گنگوہی سے کیا، انھوں نے ان کے فضل و کمال کی تعریف کی تو انھیں مولانا کی خدمت میں بھیجا اور پیغام دیا کہ بادشاہ ان سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ وہ گئے مگر مولانا نے بادشاہ کے پاس جانے اور ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ نماز کا وقت آیا تو بادشاہ جامع مسجد میں گیا اور وہاں ان سے ملاقات کی۔ بادشاہ نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر ان سے منصب افتا پر فائز ہونے کی درخواست کی جس کو منظور کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ ۹۸۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد وہ عمر بھر اسی منصب پر فائز رہے۔ انھوں نے ۹۹۱ھ میں وفات پائی۔

ب

۲۸۔ شیخ بایزید سندھی

میرک بایزید بن ابوسعید بن میر علی شاہ عرب شاہی سبزواری ثم سندھی سکھری، شیخ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اس دور کے مشہور فضلاء میں ہوتا تھا۔ اصلاً سبزواری کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے قندھار آئے، پھر شاہی بیگ ارغون قندھار کے ساتھ ارض سندھ میں داخل ہوئے اور سکھراور بھکر دو شہروں کے شیخ الاسلام مقرر کیے گئے۔ اس زمانے میں سکھر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

۱۷۔ منتخب التواریخ ص ۳۰۸، ۳۰۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶، ۲۵۔

نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۲۳، ۲۲۔

۱۸۔ تحفۃ الکلام ص ۲۰۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۲۸۔

فہمائے ہند جلد سوم

۴۹- شیخ بدر الدین گجراتی

شیخ بدر الدین بن جلال الدین گجراتی حنفی المسلک تھے۔ گجرات میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور اپنے والد مکرم شیخ جلال الدین سے علم حاصل کیا۔ شیخ جلال الدین نے اپنے باپ شیخ محمد سے اور شیخ محمد نے اپنے باپ علامہ شیخ کمال الدین دہلوی سے اخذِ علم کیا۔ شیخ بدر الدین عالم و فقیہ، صحیح العقیدہ، صوفی اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ افسوس ہے، ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۵۰- شیخ بدر الدین حسینی اکبر آبادی

شیخ بدر الدین بن جلال الدین اکبر آبادی ۹۴۳ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور شیخ جلال الدین بن عبداللہ اکبر آبادی اور شیخ ابوالفتح بن عبدالغفور تھانی سے اخذِ علم کیا۔ بہت بڑے عالم و فقیہ تھے اور اپنے دور کے فحولِ علمائے ہند سے تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی تعلق تھا۔ اپنے والد شیخ جلال الدین اکبر آبادی کے بعد سنی مشیخت پر متمکن ہوئے۔ نہایت قانع، عقیف اور زیورِ صلاح و تقویٰ سے آراستہ تھے۔ پچیس سال کی عمر پا کر ۲۹ بیح الاول ۹۹۸ھ کو فوت ہوئے۔

۵۱- شیخ برہان الدین کالپوی

شیخ برہان الدین بن تاج الدین کالپوی، شیخ صالح اور فقیہ وقت تھے اور کسبِ اہل مشائخ میں شمار کیے جاتے تھے۔ شیخ عبدالملک بن ابراہیم کالپوی سے اخذِ علم کیا اور عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ پھر لوگوں سے منقطع ہو کر گھر میں گوشہ گزری ہو کر بیٹھ گئے۔ زندگی کے آخری دم تک گھر سے باہر نہیں نکلے حتیٰ کہ دفن بھی گھر ہی میں کیے گئے۔

۲۷ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۵۱ بحوالہ مجمع الابرار

۲۸ اذکار ابرار، ص ۳۸۲، ۳۸۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۵۱

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں بڑے احترام سے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے :

شیخ برہان الدین بڑے زاہد، منوکل، گوشہ نشین اور مستغنی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں، وہ میرا اللہ داد کی صحبت میں، جن کا سلسلہ ایک واسطے سے سید محمد جون پوری سے ملتا ہے، صرف تین دن رہے اور فقر و غنا کا وہ فیض حاصل کیا کہ درجہ کمال کو چاہتے۔ نہایت عبادت گزار اور صاحبِ حضور تھے۔ تقریباً پچاس سال تک گوشت بلکہ بہت سی چیزوں کا کھانا پینا ترک کیے رکھا، صرف تھوڑے سے دودھ اور مٹھا س پر گزار کرتے رہے۔ آخری عمر میں تو پانی تک ترک کر دیا تھا۔ نظر لظاہر بس ایک روحانی اور نورانی مجسمہ دکھائی دیتے تھے۔ کاپی ہیں ان کا حجرہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ اس حجرے میں وہ ہمیشہ ذکر و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ عربی علوم نہیں پڑھے تھے، کچھ پھر بھی قرآن مجید کی تفسیر اس بلاغت کے ساتھ بیان کرتے کہ حیرت ہوتی تھی، ان کی صحبت میں دلوں کو کھول دینے والا اثر تھا۔

ملا عبدالقادر، ان سے خود اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

میں جب چنار کے سفر سے لوٹا، ۹۶۷ھ کا کوئی مہینہ تھا اور عبداللہ اوزبک کا دورِ فوراہ تھا، ایک رات شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، بڑی پہنچی ہوئی باتیں کیں اور اپنے مہندی اشعار جو وعظ و نصیحت، تصوف اور توحید و تحریک کے مضامین پر مشتمل تھے، سنائے۔

دوسرے دن صبح علی اسکو روزِ جو رویشِ دوستی کی صفت کے باوجود پورا ترک تھا، اور مرحم آزادی اور ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا، میرے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے گیا۔ عجیب اتفاق ملاحظہ ہو کہ جب وہ چلنے لگا تھا تو اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی، اور ان کو غلط گالیاں دی تھیں۔ جب ہم شیخ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے سب سے پہلے جو

ملا مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں انھیں فقیہ قرار دیا ہے ظاہر ہے، اگر وہ عربی علوم کے عالم نہ تھے تو فقیہ کیوں کہہ گئے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ علوم عربیہ میں بہت زیادہ عبور اور مہارت نہ رکھتے ہوں۔

فقہائے ہند جلد سوم

بات بیان کی وہ یہ حدیث تھی :

قال النبي صلى الله عليه وسلم من أسلم المسلمون من لسانه ويده
يعني رسول الله صلى الله عليه وسلم في فرمايا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے
مسلمان محفوظ رہیں۔

یہ حدیث پڑھ کر انھوں نے اس کے نکات کی بڑی عالمانہ اور دلکش پیرایہ میں تشریح
کی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کیے پر نادم اور شرمندہ ہو کر توبہ
کرنے لگا۔ شیخ سے دعا کی درخواست کی کہ کچھ نذرانہ بھی پیش کیا، جو شیخ نے قبول نہ کیا۔
بدایونی آخر میں لکھتے ہیں :

شیخ مجدد صوح کی عمر سو سال ہوتی ہے۔ ۹۷۰ھ میں رحلت فرمائی۔ میں نے ان کی تاریخ
اس مصرع سے نکالی ہے۔

دل گفت کہ شیخ اولیا بود

۵۲۔ قاضی برہان الدین گجراتی

قاضی برہان الدین نہروالی گجراتی، شیخ شہاب الدین گجراتی کی اولاد سے تھے، شیخ
وقت، عالم و فاضل اور محدث و فقیہ تھے۔ ان کا شمار ان مشہور اساتذہ میں ہوتا تھا
جنہوں نے پہلے پل علاقہ گجرات میں تدیس کا سلسلہ شروع کیا اور علوم کی نشر و ذیوع کا ذریعہ
بنے تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار تشنگانِ علوم نے ان سے اپنی علمی
تشنگی بھائی۔ ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ برصغیر
پاں وہنر کے دسویں صدی ہجری کے نامور عالم، عظیم فقیہ اور مشہور معلم و مدرس تھے۔

۵۵ منتخب التواریخ ص ۲۷۹، ۲۸۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۵۳، ۵۵۔

اذکار ابرار، ص ۳۰۵

۵۶ یا وایام ص ۶۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۵۵ بحوالہ ظفر الوالہ

۵۳۔ مولانا برہان الدین ملتانی

مولانا برہان الدین ملتانی حنفی المسلك تھے۔ فاضل بزرگ تھے اور فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر حصار میں سند تدریس پر فائز تھے۔ ان میں بے شمار علما و طلبانے اخذِ علم کیا۔ شیخ عبداللہ بن ہبلول سندیلوی گجراتی نے بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حصار میں تفسیر اور بعض کتب درسیہ پڑھی تھیں۔ بعد ازاں ان کے ساتھ مولانا نے گجرات کا سفر بھی کیا تھا۔

۵۴۔ شیخ بلال محدث سندھی

شیخ بلال سندھی عالم کبیر اور محدثِ وقت تھے۔ تفسیر اور حدیث کے بہت اونچے مرتبے کے علما میں سے تھے۔ شریعتِ مطہرہ کے بدرجہا نیت پابند اور عامل کتاب و سنت تھے۔ تصوف و طریقت میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا، اس ضمن میں ان سے بہت سے کثوف و کرامات کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

۵۵۔ شیخ بہار الدین انصاری جیندی

شیخ بہار الدین بن ابراہیم بن عطاء اللہ انصاری شطاری جیندی، مشرقی پنجاب کے شہر جیند کے رہنے والے تھے، جو ریاست جیند کا دارالخلافہ تھا۔ ان کی جائے پیدائش بھی جیند تھی، اور نشوونما بھی اسی شہر میں ہوئی۔ بہت بڑے عالم، شیخ، فقیہ، علوم عربیہ اور اصولِ فقہ کے ماہر کامل تھے۔ متعدد مشائخ و علما اور بزرگانِ دین کی صحبت و ملازمت میں رہے اور اس سلسلے میں بہت سے بلاد و

۶۵ اذکارِ برابر، ص — نزہۃ الخواہج ۲ ص ۵۶

۵۵ اذکارِ برابر، ص ۳۷۵ — نزہۃ الخواہج ۲ ص ۵۶

قصبات میں گھومے پھرے۔ حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور حرم شریف میں شیخ احمد الشریف جیلانی شافعی سے طریقہ تہذیبیہ کے مطابق اخذ فیض کیا۔ بعد ازاں مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور حاکم مالوہ سلطان غیاث الدین خلجی کے عہد میں مانڈو آئے۔ وہاں عرصہ تک قیام فرما رہے۔ پھر احمد آباد کے شہر بیدر کا سفر کیا۔ اذکار و اشغال کے موضوع پر شیخ ابراہیم بن حسین الدین ایرچی کے لیے ایک رسالہ تصنیف کیا۔ ۹۲۱ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر الہ آباد میں ہے۔

۵۶۔ شیخ بہار الدین عمری جون پوری

شیخ بہار الدین کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ بہار الدین بن خلیق اللہ بن مبارک بن احمد بن ابو الخیر بن نصر اللہ بن محمود بن محمد بن شیخ حمید الدین عمری ناگوری ثم جون پوری، اپنے وقت کے فقیہ، عالم، محدث اور شیخ تھے۔ شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کے شاگرد تھے۔ علوم عالیہ میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ تصوف و طریقت سے بھی لچسپی تھی اور اس سلسلے میں شیخ حامد شاہ مانک پوری کے فیض یافتہ تھے۔ گنج ارشدی میں شیخ غلام شہید کے بیان کے مطابق سات سال شیخ حسین بالادستی کے ساتھ رہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب شیخ حسین جون پوری میں مقیم تھے۔ ان کے بالادست تشریف لے جانے کے بعد سترہ سال شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کی صحبت و ملازمت میں بسر کیے پھر شیخ حامد شاہ مانک پوری سے منسک ہو گئے۔ نو سال ان کی خدمت میں گزارے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد مشائخ اور بزرگان دین سے استفادہ کیا۔

بعد ازاں عازم حرمین شریفین ہوئے اور تین سال مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ پینتالیس سال انھوں نے سب سے علیحدگی و انزوا اختیار کر کے جبل ابی قیس پر بسر کیے۔ جبل ابی قیس سے صرف نماز کے اوقات میں نیچے اترتے اور مسجد حرام میں نماز ادا کرتے۔

۱۹ اخبار الاخیار، ص ۱۹۸ تا ۲۰۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳ ص ۵۹، ۶۰

ان کی عمر سو سال سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن بنیائی بالکل صحیح تھی اور اس عمر میں بھی ٹینک استعمال کرنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ مکہ مکرمہ میں حدیث پڑھی اور عالی سند حاصل کی۔ وہاں طریقہ نقش بند یہ کہ مطابق شیخ کمال الدین اسماعیل شروانی سے کسب فیض کیا۔ اور کافی عرصہ ان کی صحبت میں رہے۔ شیخ کمال الدین اسماعیل شروانی، شیخ کبیر عبید اللہ احرار کے فیض یافتہ تھے۔

شیخ بہار الدین جون پوری کی حدیث سے محبت اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ دن رات حدیث کی مختلف کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ ان کی ایک تصنیف بھی ہے، جس کا نام ارشاد السالکین ہے، یہ کتاب اپنے موضوع میں نہایت مفید اور عمدہ کتاب ہے۔

اس عالم دین نے ۲۶ رمضان کو، ایک روایت کے مطابق ۴ جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ کو وفات پائی۔

۵۷۔ شیخ بہار الدین گجراتی

شیخ بہار الدین بن معز الدین بن شہاب الدین خطابی گجراتی، شیخ صالح اور فقیہ تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھائی نفعیل بن خطاب قریشی کی اولاد سے تھے۔ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طریقت بھی تھے۔ انھوں نے عمر کا طویل حصہ سیر و سیاحت میں بسر کیا۔ ہندوستان سے باہر بھی گئے۔ ہند میں واپس آ کر آٹھ سال گجرات میں مقیم رہے۔ پھر برہان پور چلے گئے اور وہاں بہت بڑی خانقاہ نعمیہ کی اور تمام عمر اسی خانقاہ میں عبادت الہی میں گزار دی۔ ۹۱۲ھ میں وفات پائی۔

۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۶۰، ۶۱۔ تاریخ شیراز ہند

جون پور، ص ۶۶۴، ۶۶۵۔ اللہ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۶۰، ۶۱۔ بحوالہ کجرا

پ

۵۸- شیخ پیر محمد گجراتی

شیخ پیر محمد کا سلسلہ نسب مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص تک پہنچتا ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ وہ سلسلہ نسب یہ ہے: پیر محمد بن جلال الدین بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابراہیم بن جعفر بن جلال بن محمود بن عبداللہ بن عبدالحمید بن عبدالرحمن بن عثمان بن مصعب بن ابان بن عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔

شیخ پیر محمد رحمۃ اللہ علیہ موضع جانپانیر میں پیدا ہوئے جو اعمال گجرات میں واقع تھا۔ وہیں نشوونما پائی اور اپنے زمانے کے اساتذہ سے اخذِ علم کیا۔ پھر حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج و عمرات سے متمتع ہوئے۔ واپس آئے تو شیخ محمد غوث گوالبیاری سے طریقت و تصوف کی تعلیم حاصل کی، ایک عرصہ تک ان سے منسلک رہے اور ان کے بعد سند مشائخ پر فائز ہوئے۔ شیخ پیر محمد گجراتی عالم و فقیہ بھی تھے اور سلوک و تصوف سے بھی وابستگی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۹۶۹ھ کو وفات پائی۔

ت

۵۹- شیخ تاج الدین مندوی

شیخ تاج الدین یوسف بن کمال الدین قرشی رتھنبوری ثم مندوی مالوی ۸۸۵ھ کو رتھنبور میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ شیخ وقت، اصلاح عالم دین اور فقیر زمان تھے۔ اس کے ساتھ ہی طریقت و صلح میں بھی ایک مقام رکھتے تھے اور مشہور مشائخ میں سے تھے۔ حصولِ علم سے فارغ ہوئے تو مانڈو تشریف لے گئے۔ وہ سلطان ناصر الدین شاہ خلجی کا عہد تھا۔ سلطان ان سے نہایت اکرام و توقیر سے پیش آیا،

۱۔ نزہۃ الخواصر، ج ۳ ص ۶۶ بحوالہ تاریخ دکن از عبدالمجبار آصفی۔

عزت سے ٹھہرایا اور ہر ممکن طریق سے ان کی امداد کی۔ شیخ تلج الدین مندوی نے ۵۰ھ ۹۵ھ میں انتقال کیا۔

۶۔ مولانا تقی الدین پنڈوی

وزیر کبیر مولانا تقی الدین بن عین الدین پنڈوی، محدث اور فقیہ تھے سلطان مبارک نے ازراہ تکریم ان کو ملا کالقب دیا تھا، ان کے والد مولانا عین الدین کو مجلس مختار اور ان کے دادا کو مجلس سرور کا خطاب عطا کیا تھا۔ وہ علاقہ بنگال میں نصرت شاہ اور ان کے والد حسین شریف مکی کے عہد میں طویل مدت تک منصب وزارت پر متمکن رہے۔ بنگال کے مختلف شہروں میں انھوں نے بہترین اور یادگار عمارتیں تعمیر کیں، جن میں شہر سنار گاؤں میں ایک بہت بڑی مسجد بھی ہے۔ یہ مسجد انھوں نے ۹۲۹ھ میں تعمیر کی تھی۔ اس کے شمار ابھی تک باقی ہیں۔

ج

۶۱۔ شیخ جعفر بن میران سندھی

شیخ جعفر بن میران بوبکانی سندھی بلایہ سیستان کے ایک شہر بوبک میں پیدا ہوئے اور خالص علمی ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے دور کے عالم کبیر اور شیخ تھے ان کا شمار علاقہ سندھ کے مشہور فقہاء میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ میران بوبکانی سلسلہ درس جاری تھا جس میں بے شمار علما و طلباء نے استفادہ کیا۔ مستفیدین کی جماعت میں شیخ طاہر بن یوسف سندھی برہان پوری بھی شامل ہیں۔ شیخ جعفر نے اپنے باپ (شیخ میران) سے تحصیل کی۔ جہاں یہ علوم شرعیہ میں

۱۵ اذکار ابرار ص ۲۲۹ تا ۲۵۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۶۸، ۶۹

۱۶ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۶۸، ۶۹

معلومات نامہ رکھتے تھے، وہاں حکمت و فلسفہ، ادب و انشا، منطق و نجوم و جفر میں بھی ماہر تھے۔ لیکن آخر عمر میں ان علوم سے دلچسپیاں ختم کر دی تھیں اور کتب حدیث و تصوف کے مطالعہ میں منہمک ہو گئے تھے۔ یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ تصوف میں کامل اشتغال کے باوجود مسائل شرعیہ میں میلان طبع شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی آراء و تحقیقات کی طرف تھا۔

شیخ جعفر یوبکانی مخدوم نوح کے ہم عصر تھے، جناب کمالات اور مقتدر عالم دین تھے۔ تحفۃ الکرام میں مخدوم نوح اور شیخ جعفر کے بارے میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ ایک روز مخدوم نے کہا: ”میں نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔“ شیخ جعفر نے جواب دیا: ”ان آنکھوں سے نہ دیکھا ہوگا۔ اس کیفیت کو واضح کرنے کے لیے آپ کو چاہیے کہ جب ایسی حالت آپ پر طاری ہو تو کسی خادم کو اپنی آنکھیں بند کرنے کا حکم دیں۔ اگر اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار قائم رہے تو پھر یقین کیجیے کہ یہ آنکھ، وہ ظاہری آنکھ اور یہ دیدار، وہ عام دیدار نہیں ہے۔“

مخدوم نوح نے یہ تجربہ کرنے کے بعد فرمایا: ”اگر جعفر نہ ہوتا تو نوح کا فر ہو جاتا۔“ شیخ جعفر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں:

۱۔ المتانۃ فی مرمۃ الخزانۃ۔ ان کی یہ تصنیف فقہی اور علمی اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا اصل باعث گجرات کے ایک عالم دین قاضی جگن گجراتی (متوفی ۹۲۰ھ) کی تصنیف، خزانۃ الروایات ہے۔ یہ کتاب فروع حنفیہ کو محیط ہے، لیکن محققین کے نزدیک یہ کتاب غیر مستند، غیر معتبر، اور ناقابل اعتماد ہے اور رطب دیالس کا پلندہ ہے۔ علامہ مخدوم جعفر یوبکانی نے لائقاً کی تصنیف کے وقت اس کتاب کو سامنے رکھا اور وہ تمام مواد اس سے نکال دیا جو سند و اعتبار کے نقطہ نظر سے قطعی ناقابل اعتنا ہے۔ اس کے بجائے انھوں نے مفتی بہا مسائل اور قومی روایات کا اضافہ فرمایا۔ اس محنت و کاوش کے بعد یہ کتاب

المتاننتہ فی صرمتہ الخزانة کے نام سے موسوم ہوئی۔ اب اس کتاب کو بجا طور پر کبار اعلام فقہ کے نزدیک معتبر اور مستند قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں سندھی ادبی بورڈ کراچی (مجلس احیاء الادب السنڈی) کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس پر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی سندھی نے مٹو اور معلومات افزا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ یہ خالص فقہی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ جعفر یوبکانی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے افکار و آراء سے بہت متاثر تھے۔

۲۔ حل العقود فی طلاق السنود۔ یہ علامہ ممدوح کی ایک عجیب و غریب تصنیف ہے۔ اس میں باشتدگانِ سندھ کے طلاق دینے کے طریقے اور شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بعض قدیم کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس سے دسویں صدی ہجری کے سندھی تمدن اور زبان پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

۳۔ الصادق المنصف المحق بالادلة التي هي بالتقديم احري واحق: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

۴۔ حاصل النهج۔ یہ فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے۔

۵۔ نهج التعليم۔

۶۔ عجالۃ النافعین۔

۷۔ حل العقود۔

افسوس ہے، شیخ جعفر یوبکانی کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۱۔ تحفۃ الکرام ص ۲۵۹، ۲۶۰ مقدمۃ المتاننتہ فی صرمتہ الخزانة (از مولانا ابو سعید غلام مصطفیٰ سندھی)۔ اذکار ابرار ص ۳۷، ۳۸، ۳۹۔ نزہۃ الخواص ص ۶۹، ۷۰۔ تاریخ معصومی ص ۲۷۸۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۷۰۲۔ النافع الکبیر ص ۱۲۔ یادایام ص ۵۲۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

۶۲۔ قاضی جگن گجراتی

قاضی جگن گجراتی حنفی المسلک تھے، معروف عالم و شیخ اور مشہور فقیہ تھے۔ علاقہ گجرات کے ایک قصبہ کنیکہ کے رہنے والے تھے۔ فقہ حنفی کے مسائل پر مشتمل ان کی ایک مبسوط اور مفہوم تلخیص تصنیف ہے، جو خزائن الروایات کے نام سے موسوم ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کو غیر مستند اور غیر معتبر کتاب قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ قاضی موصوف نے مسائل جمع کرنے اور روایات غریبہ کو اکٹھا کرنے میں عمر کھپا دی۔ اس کتاب کا آغاز انھوں نے کتاب سے کیا ہے، کیوں کہ ان کو اشرف العبادات کی حیثیت حاصل ہے۔

کے بارے میں حاجی خلیفہ کے الفاظ یہ ہیں:

خزانة الروایات فی الفروع - للقاضی جگن الحنفی الہندی، الساکن
کن من اللجوات وهو مجلداً اوله الحمد لله الذی خلق الانسان وعلمه البیان
ذکر فیہ انه افنی عمره فی جمع المسائل وغریب الروایات
وابتداً بکتب العلم لانه اشرف العبادات ۱۰
مولانا عبدالحی قرنگی محلی لکھنؤی نے بھی اس کتاب کے متعلق اظہار رائے کیا ہے
وہ فرماتے ہیں،

انه من الکتب الغیر المعتمرة، لانه معلوم من الرطب والیابس
مع ما فیہ من الاحادیث المخرعة والاختیار المختلفة ۱۱
یعنی یہ کتاب (خزائن الروایات) کتب غیر معتبرہ میں سے ہے، اس لیے نہ یہ
رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے، اس میں موضوع احادیث اور مختلف فیہ روایات
دلچسپی گئی ہیں۔

بہر حال قاضی جگن گجراتی کی یہ تصنیف جو خزانۃ الروایات کے نام سے معروف ہے اور مسائل حنفیہ کو محیط ہے، اہل علم کے نزدیک ناقابل اعتماد اور غیر مستند ہے۔ علامہ مخدوم جعفر یو بکافی سندھی نے اپنی کتاب ”المتانہ“ کی تصنیف کے وقت اس کتاب کو پیش نگاہ رکھا اور اس سے غیر معتبر مسائل اور غیر مستند مواد کو نکال دیا اور اس کے بجائے مفتی بہا مسائل اور قوی روایات کا اضافہ کیا۔ انھوں نے اس میں سے ایک نئی فقہی کتاب تصنیف کی جس کا نام المتانہ فی صرمة الخزانہ رکھا۔ اس کا ذکر علامہ جعفر یو بکافی کے ترجمہ میں کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں جو کتب فقہیہ معرض تحریر میں آئیں، یہ کتاب ان سب کے مندرجات و اقتباسات کا مجموعہ ہے اور مرتب نے ان کتابوں کا عام طور پر حوالہ دیا ہے۔ اس کی ترتیب بھی اس نوع کی دوسری کتابوں جیسی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ شروع میں کتاب العلم کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ فقہ کے مطالعے اور دینی مسائل کی تحقیق سے ان کو تمام عمر گہری دلچسپی رہی اور اس کے نتائج کو انھوں نے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

کتاب العلم میں انھوں نے علم اور علما کی فضیلت بیان کی ہے۔ وہ خود حنفی تھے۔ اس لیے امام ابو حنیفہ کے اوصاف و فضائل پر بھی ایک مقالہ قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے فتاویٰ اور مفتی سے متعلق فنی نکات کی بھی تشریح کی ہے اور اصول فتاویٰ کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شرط اولیں یہ ہے کہ فتاویٰ قرآن اور حدیث سے اخذ کردہ دلائل قطعیہ پر مبنی ہوں۔ اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو پھر فتاویٰ امام ابو حنیفہ کے فیصلوں اور اس کے بعد امام ابو یوسف اور امام محمد کے فیصلوں کے مطابق ہوں۔ اگر امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں کی آرا میں اختلاف ہو تو پھر مفتی کو اختیار ہے کہ جس رائے کو چاہے راجح ٹھہرائے، لیکن اگر کسی شاگرد کی رائے اسناد کی رائے کے مطابق نہ ہو تو پھر ان کی رائے کو ترجیح دی

جائے۔ بجز اس صورت کے کہ مستند فقہانے استصلاح کے پیش نظر دونوں شاگردوں میں سے کسی ایک کی رائے کو قبول کیا ہو۔ اگر مفتی کو کوئی مستند حدیث مل جائے اور وہ اس کے اطلاق کے بارے میں مطمئن ہو تو پھر امام ابوحنیفہ کی رائے نظر انداز کر دی جائے، کیوں کہ خود ان کا یہ مشہور قول ہے کہ اگر میری رائے مستند حدیث کے خلاف ہو تو اس کو نظر انداز کر دو۔^{۱۵}

قاضی جگن گجراتی کے سالِ ولادت کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ ان کا سنِ وفات ۹۲۰ھ ہے۔ یہ چار بھائی تھے اور چاروں منصب قضا پر متعین تھے۔^{۱۶} مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی یادایام میں قاضی جگن کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

قاضی جگن گجرات کے بہت بڑے عالم تھے، مگر ان کا نام و نسب تک محفوظ نہیں۔ قاضی چلیپی نے کشف الظنون میں لکھا ہے کہ قاضی جگن گجرات کے قصیدہ میں رہتے تھے۔ حیف ہے کہ ایک شخص قسطنطنیہ میں بیٹھ کر بتائے کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے اور خود گجرات والے اتنا بھی نہ جانتے ہوں۔ فقہ حنفی میں ان کی کتاب خزانۃ الروایات بہت مشہور کتاب ہے مگر علمائے احناف اس کی روایتوں کو معتبر نہیں سمجھتے۔ تقریباً ۹۲۰ھ میں انھوں نے رحلت کی۔^{۱۷}

۶۳۔ شیخ جلال الدین اکبر آبادی

شیخ جلال الدین بن عبداللہ بن یوسف اکبر آبادی، ۹۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والد مکرم شیخ عبداللہ بن یوسف سے علوم عربیہ، فقہ اور

۱۵۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ ص ۹۱۔

۱۶۔ ملاحظہ ہو: مقدمہ المآثر فی مرآۃ الخزانۃ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۵۲۔

یادایام ص ۶۲۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ص ۲۲۵۔

۱۷۔ یادایام ص ۶۲۔

نحو کی تعلیم حاصل کی، منطق و حکمت کے لیے علامہ ابوالبقابن عبداللہ خراسانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابھی بیس سال کی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ فارغ التحصیل ہو گئے اور سند تدریس کو زینت بخشی۔ ان کی علمی شہرت دوردراز تک پھیل گئی اور ان کا شمار اپنے عصر کے کبار و مشہور علما میں ہونے لگا۔ جن حضرات نے ان سے اخذِ علم کیا، ان کی تعداد بہت وسیع ہے، ان میں قاضی جلال الدین ملتانی، شیخ افضل محمد انصاری، شیخ بدرالدین بن جلال الدین حسینی اور خلقِ کثیر شامل ہے۔ اس شیخِ وقت اور عالم دین نے ۱۶ ذی القعدہ ۹۶۱ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں وفات پائی۔

دسویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۶۴۔ شیخ جلال الدین جامی دہلوی

شیخ جلال الدین بن فضل اللہ دہلوی، دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے۔ ظاہری علوم کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شیخ سہار الدین ملتانی کے حلقہٴ ارادت میں داخل ہوئے، طویل مدت تک ان کی صحبت میں رہے اور تصوف و طریقت سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر بغداد، مصر، دمشق، شیراز، ہرات، بلخ و اندلس، اردستان اور خراسان وغیرہ کا سفر کیا اور ائمہ فن سے ملاقات کی، جن میں شیخ جلال الدین محمد بن السعد دوانی، مولانا عبدالرحمن جامی، شیخ عبدالغفور لاری، محمد حنفی، احمد اندلسی اور نظام الدین شیرازی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس اثنا میں وہ حجاز بھی گئے، حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر، بیہمی مکی سے علم حاصل کیا، پھر مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور سب اطراف سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور زہد و عبادت کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔

۵۵ اذکار ابرار، ص ۱۳۱، ۲۶۸، ۲۶۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۴،

ص ۷۰، ۷۱۔

بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ شاعر بھی تھے، جمالی تخلص کرتے تھے۔ مغل بادشاہ ہمایوں ان کا بہت معتقد تھا اور ان کی دین داری اور تقویٰ و صلاح سے انتہائی متاثر تھا۔ اس نے کئی دفعہ ان کو عمدہ صدارت پیش کیا مگر انھوں نے قبول نہیں فرمایا۔ فارسی میں ان کا ایک دیوان بھی ہے جس کا نام مرواہ ہے، ان کی تصانیف میں مرآة المعانی اور سیر العارفين شامل ہیں۔ سیر العارفين مختلف مشائخ کے حالات اور سوانح پر مشتمل ہے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

مارا ز خاک کو بیت پیرا ہن است بر تن

آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بد اسن

اس عالم دین اور معروف شاعر نے ۱۰ ذی القعدہ ۹۴۲ھ کو وفات پائی۔

۶۵۔ شیخ جلال الدین تھانیسری

شیخ جلال الدین بن محمود عمری تھانیسری، مرد صالح اور کبار مشائخ میں سے تھے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ بحث و اشتغال کو اس انداز سے مطمح نظر ٹھہرایا کہ انہوں نے عصر میں درجہ امتیاز کو پہنچے۔ طویل عرصہ تک درس و افادہ میں مصروف رہے اور ساتھ ہی سداقتاً و تصنیف پر فائز ہوئے۔ پھر شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حلقہ طریقت میں داخل ہوئے اور تصوف و سلوک کی تشریح و عمل کرنے لگے۔ اس میں اتنا آگے بڑھے کہ سب امور میں قطع علائق کر کے کلیتہً زہد و عبادت میں منہمک ہو گئے۔ انھوں نے نوٹے برس عمر پائی۔ اس اثنا میں ریات و عبادت کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا۔ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے، چلنے پھرنے کی ہمت نہ رہی تھی اور ہر وقت تکیے پر ٹیک لگا کر بیٹھے رہتے تھے، مگر جوں ہی کان میں اذان کی آواز پڑتی، جسم میں طاقت لوٹ آتی، فوراً کھڑے ہو جاتے اور

تعدیل ارکان کے ساتھ نماز ادا کرتے۔

ارشاد اللطائف کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے جو سلوک و تصوف کے موضوع پر مشتمل ہے، اس میں انھوں نے گمراہ اور جاہل صوفیا کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔ مدعیان تصوف کو زہد و اتقا اور عبادت الہی پر کار بند رہنے کی تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ سلف صالحین کے مسلک پر عمل پیرا ہوں، اصول شریعت کو ملحوظ رکھیں، تلاوت قرآن مجید کا التزام کریں، نوافل و سنن باقاعدہ پڑھتے رہیں، فرائض کی ادائیگی میں زیادہ سے زیادہ سعی کریں اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا اہتمام کریں، کیوں کہ صوفیا کی اصل ذمہ داری یہی ہے۔

انھوں نے پچانوے سال عمر یا کر ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ کو تھانیسریں وفات پائی۔

۶۶۔ شیخ جلال الدین برہان پوری

شیخ جلال الدین برہان پوری، متوکل کے نام سے معروف تھے، علما و فقہما اور کبار مشائخ میں سے تھے۔ شیخ شرف الدین بن عبدالقدوس گجراتی برہان پوری سے کسب فیض کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ حتیٰ کہ مرتبہ مشیخت کو پہنچے۔ ان سے سید ابراہیم بھکری اور بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔ ایک روایت کے مطابق ۹۸۳ھ میں، ایک روایت کے مطابق ۹۸۸ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

دسویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

۹۹ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۳۰، ۴۲۔ اخبار الاخیار ص ۲۵

اذکار ابرار ص ۵۴۹، ۵۸۰۔ انوار العارفین ص ۲۶۶۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۲۳۹، ۲۴۰۔

طبقات اکبری ص ۳۹۳، ۳۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۴۳

۶۷۔ قاضی جلال الدین ملتانی

قاضی جلال الدین ملتانی، حنفی المسک تھے، فاضل کبیر، متبحر عالم اور شیخ عصر تھے۔ ان کا شمار اس دور کے کبار علما میں ہوتا تھا۔ بھکر میں پیدا ہوئے اور ملتان میں نشوونما پائی۔ حصول علم کے لیے آگرہ گئے اور شیخ جلال الدین بن عبداللہ اکبر آبادی سے درسی کتابیں پڑھیں۔

ایک روایت کے مطابق پہلے گجرات گئے اور علامہ شیخ وجیبہ الدین بن نصر اللہ علوی گجراتی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، پھر عازم آگرہ ہوئے اور وہاں ایک مدت گوشہ نشینی میں بسر کی اور عرصہ تک تجارت میں مصروف رہے۔ پھر سب طرف سے منقطع ہو کر درس و افادہ کو مقصد حیات قرار دے لیا۔ بہت عرصہ تک اکبر آبادی میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اہل علم میں ان کے فضل و کمال کا لوہا مانا گیا۔

اس زمانے میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر ہندوستان پر داد و حکمرانی دیتا تھا۔ قاضی کمال الدین یعقوب کر دی جو فقیہ و اصول میں عدیم النظیر تھے، منصب قاضی القضا پر متمکن تھے۔ اکبر نے قاضی موصوف کو اس منصب سے علیحدہ کر کے شیخ جلال الدین کو ان کی جگہ قاضی القضا تقرر کیا۔ وہ خاصا عرصہ اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ بعد ازاں اکبر نے ان کو معزول کر کے دیگر علما کے ساتھ بلادِ دکن میں بھیج دیا تھا۔

دیانت و امانت میں بے مثل تھے، مگر ان کا لڑکانہایت بددیانت تھا، اس منصب سے ان کی علیحدگی کا باعث وہی لڑکانہ تھا، ورنہ اکبر ان سے بہت مطمئن تھا۔ باشندگانِ دکن نے ان کی آمد کی خبر سنی تو نہایت خوش ہوئے اور بڑی تعظیم سے پیش آئے مگر دکن میں سکونت اختیار نہیں کی۔ دکن سے بیجا پور تشریف لے گئے اور وہاں کے حاکم نے ان کی بڑی تکریم کی۔ انھوں نے بیجا پور ہی میں ۹۹۹ھ میں انتقال کیا۔

المنتخب التواریخ ص ۳۰۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۱، ۴۲، نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۷۲۔

لیکن ملا عبدالقادر بدایونی ان کے انتقال کے بارے میں لکھتے ہیں:
 بزیارت بیت اللہ المحرام مشرف شد وہاں چاد دعوت حق را لبیک اجابہ
 ودی اللہ (کہ حج کے لیے گئے اور وہیں وفات پا گئے)

۶۸۔ شیخ جلال الدین بدایونی

سید شریف جلال الدین حسینی بدایونی بدایون میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔
 پھر عازم دہلی ہوئے اور وہاں شیخ عبداللہ بن القمصان (اللہ واد) عثمانی تلبی سے
 منطق و حکمت کی کتابیں پڑھیں۔ پھر آگرہ گئے اور وہاں شیخ رفیع الدین محدث صفوی
 شیرازی سے حدیث کی تکمیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد واپس بدایون آئے اور
 وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو تمام عمر جاری رہا۔ بہت بڑے عالم اور محدث
 تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے اخذ علم کیا جن میں شیخ عبداللہ بدایونی، سید محمد
 امروہوی اور بہت سے لوگ شامل ہیں۔

دسویں صدی ہجری کے اس عالم کی نہ تو تاریخ ولادت و وفات کا علم ہو سکا ہے
 اور نہ کسی تصنیف کا۔

۶۹۔ شیخ جلال الدین کالپوی

شیخ جلال الدین صوفی، کالپی کے باشندے تھے، جلال واصل کے نام سے
 مشہور تھے، حنفی المسک تھے اور اپنے زمانے کے صالح عالم دین اور نیک فقیہ
 تھے۔ سداً مولانا خواجگی نحوی سے تعلق رکھتے تھے۔ طریقت سے بھی لگاؤ تھا، اس
 سلسلے میں صاحب جو اہر خمسہ شیخ محمد غوث عطاری شطاری کے فیض یافتہ تھے۔

۱۲۔ منتخب التواریخ ص ۳۰۵

۱۳۔ نذہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۷۵۔ منتخب التواریخ ص ۸۶

تصوف سے دلچسپی کے بعد وجودِ وحال کی کیفیت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر ان کا معتقد تھا اور ان سے تحسین ظن رکھتا تھا۔ ۹۹۰ھ کے لگ بھگ کاپلی میں فوت ہوئے ۱۰۰۰ھ

۴۰۔ شیخ جمال الدین بن محمود گجراتی

شیخ جمال الدین بن محمود بن علم الدین بن سراج الدین عمری گجراتی، گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، اپنے والد شیخ محمود اور چچا زاد بھائی نصیر الدین بن محمد الدین گجراتی سے اخذِ علم کیا۔ ان کے آبا و اجداد کا شمار علما و فضلا میں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چلے اور جامعِ علم و معرفت ہوئے۔ نہایت صالح، متقی اور فقیہ عصر تھے۔ شاعر بھی تھے۔ فارسی میں ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب مذاکرہ ہے جو فارسی زبان میں ہے اور حقائق و معارف پر مشتمل ہے۔ اس عالم و فقیہ بزرگ کو ۹۰۴ھ بیچ الاول ۹۰۴ھ کو ایک روایت کے مطابق ۹۰۸ھ کو کوفہ ہند نے احمد آباد میں شہید کر دیا تھا ۱۰۱۵ھ

۴۱۔ مفتی جمال الدین بن نصیر الدین دہلوی

مفتی جمال الدین بن نصیر الدین بن سماء الدین دہلوی، خانوادہ علم و صلح سے تعلق رکھتے تھے، اپنے والد شیخ نصیر الدین اور بڑے بھائی شیخ عبدالغفور سے تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی میں درس و افادہ میں مصروف ہو گئے، فقہی اعتبار سے حنفی المسلك تھے۔ نہایت عالم و قاضی شخص تھے۔ اسی بنا پر دارالسلطنت دہلی میں مفتی احناف کے منصب بلند پر فائز ہوئے۔ کنبو برادری کے فرد تھے اور میاں جمال خاں مفتی دہلی کے نام سے معروف

۱۲ منتخب التواریخ ص ۳۲۶ — اذکار ابرار، ص ۵۹۲ — نزہۃ الخواص ص ۴۵

۱۵ انوار العارفین ص ۳۷۹، ۳۸۰ — نزہۃ الخواص ص ۴۷ —

تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ علوم عربیہ کے دقیق اور پیچیدہ مسائل کے حل و کشود میں ماہر تھے، علوم عقلی و نقلی دونوں پر عبور تھا۔ بالخصوص تفسیر، فقہ، اصول اور کلام میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ نہایت زاید، قانع، حلیم الطبع اور شریف النفس تھے، ملوک و سلاطین اور وزراء و امرا کے دروازوں پر کبھی دستک نہیں دی۔ اس کے باوجود اس طبقے میں انتہائی عزت و تعظیم کے حامل تھے۔ شب و روز درس و افادہ میں مشغول رہتے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ سکاکی کی مفتاح العلوم کی شرح سپرد قلم کی اور اس کی دونوں شرحوں پر بہترین محاکمہ کیا۔ عضدی کی شرح لکھی اور شروع سے آخر تک چالیس مرتبہ اس کا درس دیا۔ انوار الفقہ کی شرح ضبط تحریر میں لائے۔ علم نحو کی مشہور کتاب بشرح جامی پر مفصل و بسیط حاشیہ لکھا، جس کا آغاز الحمد للہ المرفوع شأنہ، المنصوب برہانہ، المعجزہ سلطانہ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن میں اکثر اچھے عالم اور محقق بزرگ تھے۔ دسویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ نے نوے سال عمر پاکر ۹۸۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۷۲۔ شیخ جمال الدین برہان پوری

شیخ جمال الدین برہان پوری، صالح عالم دین اور اپنے دور کے محدث تھے۔ برہان پوری میں شیخ ابراہیم کی مسجد میں سند تدریس پر فائز تھے۔ مشہور محدث شیخ طیب بن یوسف سندھی، جب برہان پور تشریف لائے اور سندھی پورہ میں اقامت گزین ہوئے، جو شیخ ابراہیم کی مسجد سے ایک میل کی مسافت پر واقع تھا، تو انھوں نے ان کی آمد کو مغتنم جانا اور باوجودیکہ عوام و خواص میں عظیم مرتبہ کے حامل تھے، روزانہ ان کی

۱۶ منتخب التواریخ ص ۳۰۶، ۳۰۵۔ طبقات اکبری ص ۳۹۱۔ المشاہیر ص ۷۶

تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳، ۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۷۷، ۷۸

خدرت میں حاضر ہونے اور علمی استفادہ کرنے لگے۔ چنانچہ ان سے باقاعدہ شروع سے آخر تک صحیح بخاری پڑھی گئی۔

دسویں صدی ہجری کے اس عالم حدیث و فقہ نے برہان پور میں وفات پائی افسوس ہے، ان کی ولادت و وفات کی تاریخ کا علم نہیں ہو سکا۔

۷۳۔ شیخ جمال محمد گجراتی

شیخ جمال محمد بن ملک چاند گجراتی، گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ جمہوری کے عرف سے معروف تھے اور گجرات کا ٹھکانہ دار اور اہل علم کے مشہور علما و مشائخ میں سے تھے۔ ان کا شمار علم حدیث کے بہت بڑے علما میں ہوتا اور انھیں محدث کہا جاتا تھا۔ حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حج سے واپس آ کر عرصہ تک گجرات میں مقیم رہے، پھر برہان پور میں تشریف لے گئے اور وہاں جا کر باقاعدہ سند تدریس آراستہ کی، تفسیر اور حدیث کے جلیل القدر عالم تھے۔ روزانہ صبح سے شام تک تدریس میں مصروف رہتے۔ ۹۹۸ھ کو برہان پور میں انتقال کیا۔

۷۴۔ مفتی جنید قریشی ملتانی

مفتی جنید بن بہار الدین قریشی ملتانی، اکبر آبادی، شیخ وقت، فقہیہ عصر اور عالم زمان تھے۔ محدث علم و فضل میں پیدا ہوئے اور صلح و تقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد شیخ بہار الدین سے علم حاصل کیا۔ پھر ان کی جگہ افتاء و تدریس کی مسند پر متمکن ہوئے۔ جہاں بہت بڑے عالم و فاضل تھے، وہاں جو دو سخا اور حلم و کرم میں بھی بے نظیر تھے۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا، کھانے کے وقت مہمانوں کو

کامہ اذکار برابر، ص ۳۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۷۸۔

کامہ " " " " ص ۴۳۸، ۴۳۹۔ " " " " ص ۷۹۔

اپنے ساتھ لاتے۔ ہر شخص کی سفارش کرتے، اس کے کام آتے اور ہر ممکن طریق سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے۔

ایک روایت کے مطابق ۴ شعبان ۹۹۸ھ کو، اور ایک روایت کے مطابق ۹۹۹ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ۹۱۵ھ

بیچ

۷۵۔ شیخ چندن اکبر آبادی

شیخ چندن اکبر آبادی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جتیر علماء میں سے تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ سماء الدین دہلوی سے مستفیض ہوئے۔ نہایت نیک، متقی اور عالم و فاضل بزرگ تھے۔ ان کا ایک قول ہے:

حببت الی ادبعتہ اشیاء العلم والعمل والحیات والعافیة۔

مجھے چار چیزیں محبوب ہیں۔ علم، عمل، زندگی اور عافیت۔ یہ نہ ان کی تالیخِ ولادت و وفات کا علم ہو سکا اور نہ کسی تصنیف کا ہی پتا چل سکا ہے۔

۷۶۔ شیخ چندن جون پوری

شیخ چندن جون پوری، جلیل القدر عالم حدیث اور بہت بڑے فقیہ تھے۔ درس و افادہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ نصیر الدین جھونسوی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے، جنہوں نے ان سے جون پور میں تمام درسی کتابیں پڑھیں۔

۷۷۔ شیخ چندن مندسوری

شیخ چندن بن بدھابن چھو مندسوری، متقی اور پرہیزگار عالم دین تھے تصوف سے

۹۱۵ھ اذکار ابرار، ص ۳۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۷۹۔

۹۱۵ھ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۸۱۔ ایضاً۔ بحوالہ گنج ارشدی

بھی تعلق رکھتے تھے اور سلسلہ چشتیہ سے منسلک تھے۔ شیخ صدر الدین چشتی سے اخذ فیض کیا تھا۔ سند تدریس پر فائز تھے۔ بہت سے علما و طلبانے ان سے کسب علم کیا تھا۔ نایاب اور عمدہ کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور ایسی بہترین کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود تھیں جو اگر کسی کے پاس نہ تھیں۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ اگر کسی ایسے شخص میں جمع کتب اور مطالعہ کا شوق دیکھتے جو ان کو خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا تو اس کو بلا تامل اور بلا کسی معاوضے کے کتابیں دے دیتے۔ اصلاً سکندرہ کے رہنے والے تھے لیکن ان کے دادا چچجو وہاں سے مندر سورجپلے گئے تھے، لہذا مندر سورجپلے ہی کو اصل وطن قرار دے لیا تھا اور وہیں اقامت گزیر رہے تھے۔ ۲۳ رمضان المبارک ۱۵۲ھ کو فوت ہوئے۔ ۳

ح

۷۸۔ مولانا حاتم سنبھلی

مولانا حاتم بن ابو حاتم سنبھلی حنفی، دیار ہند کے نامور علما میں سے تھے، شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ مختصرات سے فارغ ہونے کے بعد مشہور عالم و محقق شیخ عزیز اللہ تلمیذی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور پھر ان سے اس طرح وابستگی اختیار کی کہ مقبول و منقول کی تمام کتب درسیہ ان ہی سے پڑھیں۔ ان سے اخذ طریقت بھی کیا۔ پھر شیخ علامہ الدین دہلوی کی خدمت میں گئے۔ ان سے بھی فیض نصوف و سلوک حاصل کیا۔ بعد ازاں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مردم خیز شہر سنبھلی میں مستقر ہوئے۔ پچھائی اور پورے چالیس سال درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اس طویل مدت میں ان سے بے شمار تشنگان علم نے اپنی علمی تشنگی بچھائی اور سیرابی ذہن و فکر کا سامان فراہم کیا۔

فاضل کتب کثیر الدرس، عبادت گزار، پیکرِ منانت اور حلیم الطبع تھے۔ ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا اور دور دراز سے شائقین علم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے اور ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی وسیع و کثیر جماعت میں ارض ہند کے مشاہیر میں سے سید محمد امروہوی، ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ ابوالفتح خیر آبادی، شیخ عثمان بنگالی اور بہت سے علما شامل ہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھنے میں کہ ۶۰ و ۹۰ میں جب میری عمر صرف بارہ سال کی تھی، میں اپنے والد ماجد کے ساتھ، سنبھل میں ان کی خدمت میں گیا، ان کی خانقاہ میں قصیدہ بردہ کا درس ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے تبرکاً فقہ حنفی کی کتاب کنز الدقائق کے چند سبق پڑھائے اور مجھے اپنے خاص مریدوں میں داخل کیا۔ میرے والد سے فرمایا، ہم نے آپ کے بیٹے کو اپنے اسناد شیخ عزیز اللہ تلمذی کی طرف سے کلاہ اور شجرہ دیا ہے تاکہ یہ علوم ظاہری سے مستفید ہو سکے۔ دوسری جگہ بدایونی ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”یہ میرا عزیز اللہ تلمذی کے شاگرد ہیں معقول و منقول میں ان جیسا جامع عالم کوئی اور نہ تھا۔ خاص طور سے علم حدیث، اصول، فقہ اور علوم عربیہ میں بے نظیر تھے مشہور ہے کہ شرح مفتاح اور مطول، انھوں نے اول سے آخر تک چالیس مرتبہ پڑھائی تھی۔ دوسری منشی کتابیں بھی اسی طرح پڑھاتے رہے۔“

”ملا علاء الدین لاری، شرح عقائد نسفی پر ایک حاشیہ بڑے دعویٰ سے لکھا۔ ان کے پاس لے گئے، انھوں نے مطالعہ کے بعد اس پر ایسے اعتراضات وارد کیے کہ ملا علاء الدین سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔“

”دوبیاں صاحب کو فقہ میں امام اعظم ثانی کہنا چاہیے۔ ریاضت و مجاہدہ بھی

بہت کرتے تھے، تقویٰ و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان علمی کمالات کے ساتھ عرصہ تک قنڈر حاکم بھی رہے۔“

”خان خانان بیرم خاں کے زمانے میں ایک مرتبہ میں پانچ سال بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانے میں شیخ مبارک کے ہاں میں بھی پڑھتا رہا تھا۔ اس ملاقات کے موقع پر میں نے ان کو شیخ مبارک کا ایک استفتاء پیش کیا۔ پہلے تو وہ اس طویل غیر حاضری کے زمانے کے حالات پوچھتے رہے۔ پھر فرمایا:

”شیخ مبارک کس طرح کے عالم ہیں؟“

میں نے عرض کیا: ”علمیت، تقویٰ، فقر و مجاہدہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔“ اس زمانے میں شیخ موصوف ان باتوں کے بڑے پابند تھے فرمایا: ”ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، لیکن وہ ممدوی مشہور ہیں۔ آخر اس کی کیا حقیقت ہے؟“

میں نے جواب دیا: ”وہ میر سید محمد جون پوری کی بزرگی اور ولایت کے قائل ہیں، ان کی ممدویت کے قائل نہیں ہیں۔“

فرمایا: ”میر سید محمد کے کمالات میں کیا شک ہو سکتا ہے؟“

اس مجلس میں میاں حاتم کے شاگرد میر سید محمد عدلی بھی موجود تھے۔ انھوں نے دریافت کیا:

”پھر ملا مبارک کو لوگ ممدوی کیوں کہتے ہیں؟“

میں نے جواب دیا: ”وہ چون کہ سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اس لیے لوگ ان کو ممدوی سمجھنے لگے ہیں۔“

اس پر انھوں نے کہا: ”ایک دفعہ عبدالحی خراسانی، خان خانان کے سامنے شیخ مبارک کی بہت مذمت کر رہا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟“

میں نے کہا۔ ”شیخ مبارک نے ایک مرتبہ اس کو ایک خط کے ذریعے کچھ نصیحتیں کی تھیں، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مسجد میں جا کر نماز باجماعت پڑھا کرو۔ بس یہ بات اسے ناگوار گزری اور اس نے یہ گمان کیا کہ شیخ مہدوی ہیں اور مجھ کو رافضی سمجھنے لگے ہیں؟“

میرا یہ جواب سن کر میرے سید محمد عدلی نے کہا۔ ”عبدالرحیٰ خراسانی کا اپنے فاضل پر یہ استدلال تو صرف اسی صورت میں صحیح ہوتا جب کہ وہ اس منطقی کلیہ پر پورا اترے کہ ”تو نماز باجماعت ادا نہیں کرتا اور جو کوئی نماز باجماعت ادا نہ کرے، وہ رافضی ہے“ لہذا تو رافضی ہوا۔ حالانکہ اس کلیہ کا کبریٰ ممنوع ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی منطقی کلیہ پر پوری نہیں اترتی کہ شیخ امر بالمعروف کرتے ہیں اور جو کوئی امر بالمعروف کرے وہ مہدوی ہے۔“

اس گفتگو کے بعد میاں حاتم سنبھلی نے فرمایا۔ ”میں شیخ مبارک کے اس استفتا پر ہر کہہ دوں گا، لیکن میرے پاس ایک اور استفتا آیا ہے، جس پر تمام علما کے دستخط ہیں۔ مجھے اس پر کچھ شبہات ہیں، تم اسے شیخ بہاء الدین کے پاس لے جاؤ، جو بڑے محقق اور مفتی ہیں، اور ان سے کہو کہ سفر کی وجہ سے میرے پاس کتابیں نہیں ہیں، اگر آپ اس روایت کو، جس کی بنیاد پر آپ نے اس استفتا پر دستخط کیے ہیں، بعینہ بھج دیتے تو بہتر ہوتا۔ آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ مصیبت کے عالم میں لوگ اپنے بچوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔“

اس فتویٰ کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت صرف ”فتاویٰ ابراہیم شاہی“ میں ملتی ہے، فقہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اور فتاویٰ ابراہیم شاہی کو علما کے نزدیک معتبر کتاب نہیں سمجھا جاتا کہ اس کی بنا پر فتویٰ دیا جاسکے۔ اس کے جواب میں اگر آپ یہ کہیں کہ مفتی مرحومہ روایات میں سے کسی روایت کو ترجیح دے سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ ابراہیم شاہی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حالت اضطراری میں اکوئین کے لیے اولاد کی بیع کرنا جائز ہے۔

ظاہر ہے ”اکوئین“ کا لفظ باپ اور دادا دونوں پر مشتمل ہے، چنانچہ نکاح کے

فقہائے ہند جلد سوم

سلسلے میں جس کے ابوین مسلمان ہوں، وہ اس کا کفو ہے، یعنی جس کے آباؤ اجداد اسلام سے مشرف ہوئے۔ اس لیے یہاں بالاتفاق ابوین سے باپ اور دادا مراد ہے، نہ کہ ماں اور باپ۔ اہم اس روایت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی بیع کا دونوں کو اکٹھے بطریق اجتماع اختیار حاصل ہے، نہ کہ فرداً فرداً کسی ایک کو۔ انفرادی حیثیت سے بیع کی آخر کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

میاں حاتم نے شیخ مبارک کا استفتا تو اپنے پاس رکھ لیا اور مذکورہ استفتا مجھے دے دیا۔ یہ استفتا میں نے شیخ مبارک کو دکھایا تو انھوں نے میاں حاتم کی نقا کی بہت تعریف کی اور کہا: ”ان کو دعا و سلام کے بعد میری طرف سے کہنا کہ ہم نے بھی اس مشکل کی وجہ سے اس پر چہر نہیں کی تھی“

پھر جب میں نے وہ استفتا شیخ بہار الدین کو دکھایا تو فرمایا: ”چوں کہ دوسرے مفتیوں نے اس پر تصدیقی دستخط کر دیے تھے، اس لیے میں نے ان پر بھروسہ کیا اور زیادہ غور نہ کیا، بے شک مجھ سے سہو ہو گیا۔“

شیخ بہار الدین کے اس اعتراف غلطی پر بدایونی لکھتے ہیں: ”یہ بھی شیخ بہار الدین کی حق بینی، حق پرستی، نیک نفسی اور انصاف پسندی تھی کہ باوجود اس عظمت و کمال کے انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔“

ملا عبدالقادر بدایونی نے ایک جگہ ان کا سال وفات ۹۶۹ھ تحریر کیا ہے۔ اور تاریخ وفات ”درولیش دانشمند“ سے نکالی ہے ۹۶۸ھ و دوسری جگہ ۹۶۸ھ و سچ کیا ہے اور تاریخ اللہ کے فرمان: عند ملیک مقتدر سے نکالی ہے ۹۶۷ھ یہاں ایک تو اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ انسان اگرچہ کسی بھی بڑی سے

۵۶ منتخب التواریخ ۲۷۸،

۵۷ ایضاً ص ۳۰۱، ۳۰۲۔ نیز ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند ص ۴۵۔ نزہۃ الخواصر ج ۲ ص ۸۳۔

بڑی مصیبت میں مبتلا ہو، اولاد کو فروخت نہیں کر سکتا۔ قرن اول سے لے کر اب تک کتنی ہی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ اسلام کی بعض نہایت اونچی اور منقہ شخصیتوں کو سخت مصائب و آلام کے دور سے گزرنا پڑا مگر کسی نے یہ حرکت نہیں کی کہ اس سے مخلصی حاصل کرنے کے لیے اپنی اولاد کو بیچ ڈالا ہو، کیوں کہ یہ انسانیت کے منافی فعل ہے۔ فقہ اسلامی تو یہی ایک طرف، کوئی معمولی سے معمولی اخلاق بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بلاشبہ دو مقامات پر قرآن میں اَبُوَيْہ کا لفظ بربیل تعلیب باپ اور دادا کے لیے آیا ہے: مثلاً سورہ یوسف میں ہے:

..... كَمَا آتٰنَّهَا عَلٰى اَبُوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاسْحٰقَ ط (آیت: ۶)

حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت یوسف کے دادا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے پردادا ہیں۔

یاسورہ الاعراف میں ہے: يٰٓاٰدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكَمُ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اَبُوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يٰہَا اَبُوَيْكُمْ کا منطوق آدم وحواء ہیں۔

لیکن متعدد مقامات پر قرآن میں لفظ ابوین ماں اور باپ کے لیے آیا ہے۔ نہ کہ باپ اور دادا کے لیے۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱- وَرَاۤءَ بَوَيْهِ لِكُلِّ وَاٰحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ (سورہ النساء آیت ۱۱)

یہاں لفظ اَبُوَيْہ سے ماں باپ مراد ہیں۔

۲- اسی آیت میں وَرِثَہٗ اَبُوَاہ۔ یہاں بھی اَبُوَاہ سے ماں باپ ہی مراد ہیں۔

۳- وَ اٰمَنَّا الْعٰلَمُ فَكَانَ اَبُوَاہُ مُؤْمِنِيْنَ (الکہف: ۸۰)

لفظ اَبُوَاہ کا اطلاق ماں اور باپ پر ہوا ہے۔

۴- فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اَوْتٰ اِلَيْہِ اَبُوَيْہِ (یوسف: ۹۹)

۵- وَرَفَعَ اَبُوَيْہِ عَلٰى الْعَرْشِ (یوسف: ۱۰۰)

سورہ یوسف کی ان دونوں آیتوں میں اَبُوَيْہ کا لفظ ماں اور باپ کے بارے

میں استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح حدیث میں ہے: **أَبُوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ وَيُمَجِّسَانِهِ**۔
یہاں لفظ **أَبُوَاهُ** سے مراد ماں اور باپ ہیں۔

ان سطور کا مقصد یہ ہے کہ شیخ صاحب سنبھلی بلاشبہ بہت بڑے عالم اور
فقیہ تھے، مگر ان کی یہ بات صحیح نہیں کہ قرآن میں **أَبُوَيْنِ** کا لفظ ماں اور باپ کے لیے
نہیں آتا، باپ دادا کے لیے آتا ہے۔ **أَبَاءُ** کا لفظ البتہ قرآن میں آبا و اجداد کے لیے
استعمال ہوا ہے۔

۷۹۔ قاضی حبیب اللہ گھوسوی

قاضی حبیب اللہ کا سلسلہ نسب یہ ہے: حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین
بن یحییٰ بن شرف الدین بن نصیر الدین بن مفتی حسین عثمانی اصفہانی ثم گھوسوی جونپوری
ایک روایت کی رو سے ان کا سلسلہ نسب حضرت ابان بن عثمان کی طرف اور ایک
روایت کی رو سے حضرت عمر بن عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتهی ہوتا ہے۔ شیخ عصرا
عالم دین اور اپنے علاقے کے عظیم المرتبت فقیہ تھے۔ اس نواح میں علوم عربیہ اور فقہ و
اصول کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ اعمالِ حون پور میں ایک قصبے کا نام گھوسوی
تھا، حکومت وقت کی طرف سے انھیں وہاں کے قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ تمام عمر اس منصب پر
فائز رہے۔ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور اس سلسلے میں شیخ علی بن قوام الدین
جونپوری سے اخذ فیض کیا تھا۔

۸۰۔ شیخ حسام الدین منقعی ملتان

شیخ حسام الدین منقعی ملتان، نہایت نیک اور صالح عالم دین تھے۔ ملتان میں

۷۵ نزهة الخواصر ج ۴ ص ۸۵۔ بحوالہ عاشقہ۔

فروش تھے۔ ان کے تقویٰ و تدین کا یہ عالم تھا کہ لفظ ”منفق“ ان کے نام کا مستقل جز بن گیا تھا۔ کھانے پینے میں احتیاط کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس خراجی زمین تھی جس میں خود کاشت کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کام کر کے سامانِ اکل و شرب فراہم کرتے تھے۔ اس زمین کا خراج بھی باقاعدہ حکومت کو ادا کرتے تھے، لیکن جب ملتان کے سیاسی حالات خراب ہو گئے اور علاقے میں فتنہ و فساد پھیل گیا، تو خراجی اور دوسری زمینیں ایک دوسری سے مختلط ہو گئیں اور دونوں میں امتیاز باقی نہ رہا تو یہ زمین چھوڑ دی اور کوئی دوسرا ذریعہ معاش اختیار کر لیا۔

مشکوک و مشتبہ چیزوں کے استعمال سے اور ایسے مقامات پر جانے اور ان سے فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرتے تھے، جہاں ان کے نقطہ نظر سے کوئی اشتباہ پایا جاتا ہو۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شیخ بہار الدین زکیا ملتانی کے مقبرہ کے سایہ میں نہیں بیٹھتے تھے اور صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ یہ عمارت بیت المال کی رقم سے بنائی گئی ہے، جو سب مسلمانوں کا مشترکہ مال تھا اور ان سے پوچھے بغیر صرف ایک شخص کی قبر پر خرچ کر دیا گیا ہے۔ یہ ان کے مال کا ضیاع ہے۔ لہذا اس کے سایہ میں بیٹھنا اور کسی صورت میں بھی اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے جہری تھے، اس ضمن میں نہ کسی قسم کی ملامت کی پردہ کرتے تھے، نہ کسی سے خوف زدہ ہوتے اور نہ کسی کی رورعایت کے قائل تھے۔

مشتبہات سے دامن کشاں رہتے، اگر بے خبری میں کبھی مشتبہ لقمہ حلق سے نیچے اتر بھی جاتا تو بڑے ہی احتیاط اور ذہن میں انقباض کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ایک مرتبہ کھانا کھا یا تو یہی صورت حال پیش آئی اور سخت تکلیف سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ اسی حال میں گھر گئے اور تحقیق کی، تو پتا چلا کہ خادم چوہا بنانے اور آگ جلانے کے لیے پڑوسی کی ایک اینٹ اٹھا کر لایا تھا۔ اسی وقت پڑوسی کے گھر گئے، اس کو اینٹ کا معاوضہ دیا اور اس سے معافی مانگی پھر کہیں ثقالت و انقباض کی کیفیت

سے مخلصی حاصل ہوئی۔

ایک مرتبہ ایک شخص غلطی سے ان کے جوتے نہیں کر گھر لے گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ جوتے شیخ حسام الدین متقی کے ہیں۔ اسی وقت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کو جوتے پیش کیے اور معذرت طلب کی۔ شیخ نے یہ کہہ کر اس کو جوتے بھی واپس کر دیے اور ان کی قیمت بھی عطا کی کہ میں نے اپنی ہر شے اللہ کی راہ میں وقف کر دی ہے تاکہ اگر کوئی شخص ان کو میری اجازت کے بغیر اپنے تصرف اور استعمال میں لے بھی آئے تو گنہ گار نہ ہو۔

ملتان کے اس جیّد عالم دین، پابند شریعت اور پرہیزگار بزرگ نے ۹۶۰ھ میں وفات پائی یہ

۸۱۔ شیخ حسن بن احمد گجراتی

شیخ حسن بن احمد بن نصیر الدین عمری ابو صالح محمد گجراتی، علامہ شیخ کمال اللہ دہلوی کی اولاد سے تھے۔ ۹۲۳ھ کو احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں کے علما سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد شیخ احمد اور چچا شیخ جمال الدین سے اخذِ طریقت کیا۔

تفسیر، فقہ، اصول، علوم عربیہ اور تصوف کے عالم کبیر تھے اور علوم کی ان تمام شاخوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ۹۴۱ھ میں مسندِ سلوک اور مشیخت پر فائز ہو گئے تھے۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں قرآن حکیم کی ایک تفسیر بھی ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیات کے باہم ربط و تعلق کو واضح کیا گیا ہے

۱۵ اخبار الاخیاں، ص ۲۱۳، ۲۱۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۴۔

خریدینۃ الاصفیا ص ۴۲۶، ۴۲۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۸۶۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور اس ضمن میں نہایت محنت اور احتیاط کا ثبوت دیا ہے۔ علاوہ ازیں تفسیر رضویا پر حواشی و تعلیقات سپرد کیں۔ پھر نزمہ الارواح پر برطرا عمدہ اور لطیف حاشیہ لکھا۔

اس جلیل القدر عالم و فقیہ اور مصنف نے ۲۸ ذی القعدہ ۹۸۱ھ یا ماہ شوال ۹۸۲ھ میں انیسٹھ سال کی عمر پاکر داعی اجل کو لبیک کہا۔

۸۲۔ شیخ حسن بن حسام الدین نارنولی

شیخ حسن بن حسام الدین حشمتی نارنولی اپنے دور کے عالم اور فقیہ تھے۔ قاضی تاج الدین ہرودی کی نسل سے تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور اپنے والد شیخ حسام الدین سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ شیخ شمس الدین نارنولی سے فیضِ طریقت حاصل کیا۔ پھر شیخ نظام الدین کی خدمت میں گئے اور طویل عرصہ تک ان کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہے۔ بعد ازاں لاہور تشریف لے آئے اور وہیں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ چالیس سال تک لاہور میں ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ و استفادہ کیا۔ یہ عالم و فقیہ اور صاحبِ طریقت و سلوک بزرگ ۹۹۸ھ میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

۸۳۔ شیخ حسن بن طاہر جون پوری

شیخ حسن بن طاہر بن کمال الدین عباسی جون پوری، عالم دین اور فقیہ تھے۔

۹۹ انوار العارفین ص ۳۸۰ — نزمہ الخواطر، ج ۲، ص ۸۷ — اذکار ابرار،

ص ۳۲۱ — یادِ ایام ص ۶۳ —

۱۰۰ نزمہ الخواطر، ج ۲، ص ۸۸ بحوالہ اخبار الاصفیاء۔

فقہائے ہند جلد سوم

تصوف سے بھی تعلق رکھتے تھے اور بلاد ہند کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اصل وطن
ملتان تھا لیکن ان کے والد شیخ طاہر حصولِ علم کی غرض سے ملتان سے بہار چلے گئے تھے۔
انہوں نے وہیں شیخ محمد بن طیب کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، وہیں شادی کی اور
وہیں شیخ حسن پیدا ہوئے۔ پھر جون پور تشریف لے گئے۔ حسن نے جون پور میں
نشوونما پائی۔ بچپن ہی میں حصولِ علم کی راہ پر گامزن ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں
جون پور میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے تلامذہ کی سند درس کبھی ہوئی
تھی۔ حسن نے ان ہی سے تحصیل کی اور شیخ محمد بن عیسیٰ جون پوری کی بیٹی سے ان
کی شادی ہوئی۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد شیخ حامد بن ابو حامد حشتی مانک پوری سے
اختریت کیا۔ شیخ حامد نے اپنے اس مرید کو کمال الحق کے لقب سے ملقب کیا۔ شیخ ان کی
نیکی اور رشد و سعادت سے بہت متاثر تھے اور کہا کرتے تھے، حسن قیامت کے روز
میری مغفرت کے لیے حجت ثابت ہوگا۔

یہ عالم کبیر اور فقیہ عارف سلطان سکنر رلودھی کے عہد میں جون پور سے
آگرہ چلے گئے تھے۔ وہاں خاصی مدت قیام پذیر رہنے کے بعد دہلی تشریف لے
گئے تھے۔ دہلی میں انہوں نے اپنے اہل و عیال سمیت بچی منزل میں سکونت فرمائی
جو سلطان تغلق کے محلّات میں سے ایک محل کا نام تھا۔

ان کی تصنیفات میں ایک کتاب مفتاح الفیض ہے اور علم نوحید اور سلوک
کے موضوع سے متعلق کچھ رسائل کا بھی پتا چلتا ہے۔ انہوں نے جمعہ کے روز ۲۴
ربیع الاول ۹۰۹ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ اللہ

۸۴- شیخ حسن بن عبداللہ کا لپوی

شیخ حسن بن عبداللہ قریشی کا لپوی اپنے دور کے مشہور افاضل میں سے تھے،

اللہ اخبار الانبیاء ص ۱۹۶، ۱۹۷- خزینۃ الصغیاء ص ۴۰۹، ۴۱۰- تذکرہ علمائے ہند ص ۴۷۰

اور صالحیت و علمیت دونوں اوصاف سے منصف تھے۔ کاپی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اساتذہ عصر سے تعلیم پائی۔ حدیث کی سند شیخ عبدالنبی محدث گنگوہی سے حاصل کی۔ طریقت کے لیے شیخ برہان الدین انصاری کی خدمت میں حاضر ہوئے بہت بڑے عالم، زیورِ صالحیت سے مزین اور متقی تھے۔ شعر و شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ صوفیا کی مجالسِ غنا میں جاتے تو عقل و دین اور سکون و اعتدال کے ساتھ جاتے اور ان میں خالص توحید کی باتیں کرتے۔ تدریسِ افادہ آج کا اصل کام تھا، زیادہ تر اسی میں مصروف رہتے۔ ۹۸۹ھ کو راہی جنت الفردوس ہوئے۔ ۱۱

۸۵۔ شیخ حسن بن موسیٰ گجراتی

شیخ حسن بن موسیٰ گجراتی کی ولادت گجرات میں ہوئی اور وہیں ابتدائی تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے اور صلاح و تقویٰ سے آراستہ عالم دین تھے۔ حدیث، فقہ اور علمِ نحو کی تحصیل اپنے عصر کے نامور اساتذہ سے کی۔ بعد ازاں شیخ جلال الدین بن احمد بن جعفر حسینی رفاعی سے طریقت و سلوک کا درس لیا۔ ۹۴۱ھ میں منغل حکمران سلطان نصیر الدین ہمایوں نے گجرات فتح کیا تو شیخ حسن وہاں سے مانڈو چلے گئے، وہیں شادی کی اور اللہ نے اولاد بھی دی۔ گلزارِ ابرار کے مصنف شیخ مہر غوثی مانڈوی ان کے بیٹے تھے۔ شیخ حسن گجراتی متدین، عقیف النفس، متقی، نرم خو، صالح عالم و فقیہ تھے۔ جمعہ کے روز ۱۴ صفر ۹۷۴ھ کو فوت ہوئے۔ ۱۱

۸۶۔ شیخ حسن عرب دا بھولی گجراتی

شیخ حسن عرب دا بھولی گجراتی، بہت بڑے فاضل اور علامہ تھے اور دیارِ ہند

۱۱ھ ازکار ابرار ص ۳۵۳۔ نزہۃ الخواص ج ۴ ص ۹۰، ۸۹، ۱۰۸، ۱۱۱۔ نزہۃ الخواص ج ۲

کے مشہور عرب فقیہ تھے۔ بلکہ لفظ فقیہ ان کے نام کا جز بنتھا اور انھیں فقیہ حسن عرب دابھولی کہا جاتا تھا۔ سلطان محمود شاہ بیگرہ اور اس کے بیٹے مظفر شاہ حلیم کے ایام حکومت میں علامہ احمد آباد کے قصبہ سرکھچ کے مدرسہ میں درس و افادہ کی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان سے شیخ عبدالقادر حسینی اور خلق کثیر نے علم حاصل کیا۔

۸۷۔ خواجہ حسین ہروی

خواجہ حسین ہروی، شیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی کے فرزندوں میں سے تھے۔ معقولات کی کتابیں مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے پڑھیں۔ علوم شرعیہ و معقولات کی تحصیل خاتم العلماء والمحدثین شیخ ابن حجر سے کی۔ انشا پر دازی، صنائع بدائع، حسن بیان، فصاحت و بلاغت اور مزاح و لطافت میں عدیم النظیر تھے۔ شاعر بھی تھے اور ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ بقول بدایونی کے اوسط درجے کے شاعر تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے :

اے از مژہ بے تو آب رفتہ دزدیدہ خیال و خواب رفتہ
خود را بما چناں کہ نمودی نمودۂ افسوس آں چناں کہ نمودی نبودۂ
اس شعر کا ماخذ غالباً یہ رباعی ہے :
گویم مگر نہ اہل و فائیم نہ ایم اندر صفت صدق و صفائیم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چناں افسوس کہ آنچہ می نسا ئیم نہ ایم

یہ اشعار بھی ان ہی کے ہیں :

با ما گرو چو غنچہ در ابرو گلندۂ با غیر لب چو پتہ خنداں کشودۂ
مجنتے کہ مر باتو ہست می خواہم ہمیں تودانی و من دائم و خدا داد

۱۷۱۷ء اذکار ابرار، ص ۴۸۸ ضمن حالات شیخ عبدالقادر، نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۹۱

جلال الدین اکبر نے ان کو سنگھا سن پیتی کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا، مگر یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اس ترجمہ پر انھوں نے جو نعت لکھی تھی، اس کے چند شعر یہ ہیں :

خوش الحان عند لیبے باغ و بلبلغ مکمل ترگش از کحل ما زاغ
کشیدہ در زبور نسخ بے قیل قلم بر نسخہ توریت و انجیل
نبوت را بدرگاہش حوالہ امام الانبیا بر ختم الرسالہ

۲ نم کہ ممالک سخن ملک نیست صراف خرد صیر فی سلک نیست
ہر ہفت ورق ز دفتر من قست اسرارہ دو کون بر سر کلک نیست
خواجہ حسین ہروی نے ۹، ۹ ہد میں وفات پائی۔ فیضی نے جو ان کا تربیت یافتہ تھا، ”دام ظلہ“ سے تاریخ وفات نکالی ہے

۸۸۔ شیخ حسین بزرگی

شیخ حسین بزرگی عظیم المرتبت عالم دین اور خطہ ہند کے مشہور فاضل تھے۔ دہلی کے مدرسہ میں طلباء کے درس و افادہ میں مصروف رہتے۔ ارض ہند کے ملازمین مروجہ مشہورہ علوم میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ سب علما و مدرسین سے ممتاز و سر پرورد تھے۔ نہایت بلند اخلاق بھی تھے۔ یوں سمجھیے کہ علم و اخلاق کے تمام محاسن ان کی ذات میں جمع تھے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بے شمار علما و طلباء نے ان سے استفادہ کیا ہے

ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۷۱ منتخب التواریخ ص ۳۳۷، ۳۳۸ — تذکرہ علمائے ہند ص ۵۰ —

بزم تیموریہ ص ۱۰۳ —

۱۷۱ منتخب التواریخ ص ۳۲۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۹۷

۸۹۔ قاضی حماد ردولوی

قاضی حماد ردولوی، فقہی اعتبار سے حنفی مسلک سے منسلک تھے۔ اپنے عصر کے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ دسویں صدی ہجری کے ملک ہند کے مشہور اور نامور علما میں سے تھے۔ درس و تدریس اور افادہ عام میں مصروف رہتے تھے۔^۱ افسوس ہے اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

۹۰۔ مولانا حمید الدین سنہلی

مولانا حمید الدین سنہلی، شیخِ دقت، واعظِ خوش بیان اور عالم و فقیہ تھے۔ قرآن مجید پر گہری نظر رکھتے تھے، مفسرِ قرآن تھے اور نہایت عمدہ و موثر انداز سے تفسیر بیان کرتے تھے۔ آیاتِ قرآنی کے ذریعے تذکیر و معظمت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں کے عہد کے عالم تھے اور ہمایوں، ان کی بدرجہ غایت عدت و تکریم سجا لاتا اور ان سے انتہائی محبت رکھتا تھا۔ دین کے معاملے میں بہت صاف گو تھے اور سچ بات کہنے میں کسی کی پرہیز نہ کرتے تھے۔ اس سلسلے میں منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کا یہ عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ ہمایوں نے جب تسخیر ہند کا دوسری دفعہ ارادہ کیا اور وہ اس کے لیے ایران سے روانہ ہوا تو شیخ موصوف اس کے استقبال کے لیے کابل پہنچے۔ ہمایوں چوں کہ ان کا معتقد تھا، اس لیے بہت خوش ہوا۔ ایک دن شیخ نے اس سے کہا: ”تمہارا سارا لشکر رافضی معلوم ہوتا ہے۔“ ہمایوں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“ کہا۔ ”اب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سپاہیوں کے نام، یار علی، کفش علی اور حمید علی وغیرہ ہیں۔ دوسرے کسی صحابی یا خلیفہ کے نام کیسی سپاہی کا نام نہیں ہے۔“ ہمایوں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی، وہ طیش میں آ گیا۔

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۹۷۔ لطائف قدوسی ص ۸۔

اس وقت اس کے ہاتھ میں قلم تھا، غصے میں اس کو فرش پر پھینک ڈیا اور کہا:
 نام پدم من کلان خود عمر شیخ است، دیگر نمی دانم۔
 میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا، میرے دادا کا نام عمر شیخ تھا۔
 یہ کہہ کر جلدی سے محل سرا میں چلا گیا، لیکن تھوڑی دیر بعد باہر آیا اور نہایت
 نرمی اور عقیدت کے ساتھ اس نے شیخ کو اپنے عقیدہ سے آگاہ کیا۔
 شیخ حمید الدین سنجھلی نے ۷ محرم ۹۸۳ھ کو سنجھل میں وفات پائی ۱۵
 کہتے ہیں شیخ حمید الدین نے ہمایلوں سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ اس نے شاہ
 طہماسپ صفوی سے مدد لیتے وقت شیعہ عقائد کو قبول کرنے سے صاف لفظوں میں
 انکار نہیں کیا تھا اور صفویوں کا لشکر لے کر بدخشاں پر حملہ آور ہوا تھا، اس سے شیخ
 کو شبہ گزرا کہ اس نے شیعیت قبول کر لی ہے لیکن اس نے شیخ کے سامنے اپنا اصل
 مسلک ظاہر کر دیا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

خ

۹۱۔ شیخ خواجگی سہڑھوری

شیخ خواجگی بن علی بن خیر الدین بن نظام الدین انصاری سہڑھوری۔ ان کے
 جد امجد شیخ نظام الدین سہڑھوری ۸۲۰ھ میں وارد ہند ہوئے اور علاقہ اودھ کے
 ایک بڑے گاؤں سہڑھوی میں سکونت پذیر ہوئے۔
 شیخ خواجگی کی ولادت سہڑھوی میں ہوئی اور وہ وہیں پلے بڑھے، پھر حصول
 علم کے لیے جون پور گئے اور وہاں کے اساتذہ سے تحصیل کی۔ بعد ازاں شیخ تاج الحق
 جون پوری سے اخذِ طریقت کیا۔

۱۵ منتخب التعاریخ ۱۲۷۔ طبقات اکبری ۳۹۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۳۔

نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۹۸، ۹۹۔

شیخ خواجگی اپنے وقت کے نیک و صالح عالم دین اور عظیم فقیہ تھے۔ ساتھ ہی ان کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہوتا تھا۔ ان کے علم و مشیخت اور رفعتِ منزلت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی ان کو اپنے رسائل و مکاتیب میں شیخ الاسلام کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں۔ ان کے چار بیٹے تھے اور چاروں اس دُور کے علمائے دین میں سے تھے ۱۵

دسویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ نہ ان کی ولادت و وفات کی تاریخ کا پتہ چل سکا ہے۔

د

۹۲۔ شیخ داؤد بن فتح اللہ کرمانی

شیخ داؤد کے والد فتح اللہ اپنے اس بیٹے کی ولادت سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے، اور ابھی صغر سنی کے عالم میں تھے کہ والدہ بھی فوت ہو گئی تھیں۔ ان کی تربیت بڑے بھائی رحمت اللہ کے ہاں ہوئی۔ پہلے قرآن مجید پڑھا، پھر حصول علم میں مشغول ہو گئے اور اس دُور کے بعض علما سے فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دارِ ولہور ہوئے اور شیخ اسماعیل بن عبداللہ اچھی سے اخذِ طریقت کیا۔ نہایت نیک ہمتی، عارف باللہ، نقیبِ وقت اور عالم دین تھے۔ تمام اطراف سے قطعِ علائق کر کے پنجاب کے ایک قصبے شیر گڑھ میں (جو اب ضلع ساہیوال میں شامل ہے) سکونت اختیار کر لی تھی اور کلبتہٴ زہد و عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ نہایت سخی اور جودتِ طبع کے مالک تھے۔ سال میں ایک یا دو مرتبہ گھر کا تمام مال و اسبابِ مستحقین میں صدقہ کر دیتے۔ کوئی شئی اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ ان کی وفات ۹۸۲ھ کو شیر گڑھ میں ہوئی۔ ۱۶

۱۵ لطائف قدوسی ص ۷۔ نزہۃ الخواص ج ۲ ص ۱۰۷

۱۶ اذکار ابرارہ ص ۲۰۷۔ اخبار الانبیاء ص ۲۰۸، ۲۰۷۔ منتخب التواریخ ۲۰۹، ۲۰۸۔

نزہۃ الخواص ج ۲ ص ۱۰۸۔

۹۳۔ قاضی داؤد فتح پوری سندھی

قاضی داؤد حنفی سندھی، دراصل فتح پور کے رہنے والے تھے جو اس زمانے میں علاقہ سندھ میں موضع سیلوی کے قریب ایک فریہ تھا۔ شیخ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ سندھ کے حکمران سلطان محمود شاہ کے عہد میں بھکر منتقل ہو گئے تھے۔ سلطان مذکور نے ان کی علمی و فقہی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں بھکر کا قاضی مقرر کر دیا تھا اور ان کا شمار لائق اور مشاہیر قضات میں ہوتا تھا۔ طویل عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے۔ سلسلہ قضا میں نہایت بلند اور بہترین کردار کے حامل تھے۔ انھیں ۸ ماہ شوال ۹۸۱ھ کو محبوس کر کے زہر دے دیا گیا تھا، جس سے ان کی موت واقع ہو گئی تھی۔ علیہ

۹۴۔ قاضی دتہ سیوستانی

قاضی دتہ بن شرف الدین سیوستانی، شیخ اور عالم و فقیہ تھے، حنفی المسلك تھے، نیک اور صالح علمائے دین میں سے تھے۔ فقہ اور دیگر علوم عقلیہ کی تحصیل اپنے والد شیخ شرف الدین، شیخ محمود اور شیخ عبدالعزیز ہروی سے کی۔ تفسیر و حدیث کے لیے شیخ بلال تلہتی کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کیا۔ بعد ازاں کبار مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت و ملازمت اختیار کی۔ حتیٰ کہ تفسیر، حدیث، فقہ، ہیئت، جفر، اور دیگر تمام علوم میں ماہر ہو گئے۔ تصوف و طریقت کے بھی اونچے مرتبے کو پہنچے۔ مسائل و معانی پر دقیق نظر رکھتے تھے۔ بڑے باصلاحیت بزرگ تھے۔ حافظ اس درجہ تیز تھا کہ علوم و فنون کی اکثر کتابیں زبانی یاد تھیں۔ قرآن مجید کی اٹھارہ تفسیروں کا مطالعہ اور ان کے معانی و دقائق پر عبور حاصل کیا۔

۱۷ ماہ ترجمیج ۲ ص ۳۳۶۔ تاریخ معصومی ص ۳۲۹۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶

تحفۃ الکرام ص ۲۳۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۰۹۔

ان کے تلامذہ میں حکمران سندھ سلطان حسین بن شاہی بیگ شامل ہیں۔
شیخ عثمان سندھی، ان کو اسناد کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔

۹۵۔ مولانا درویش محمد دہلوی

یہ مولانا درویش محمد واعظ تھے جو اصلاً ماہر النہر کے باشندے تھے۔ وہاں سے
ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔ شیخ وقت اور عالم فقہ تھے۔ دہلی سے
حرمین شریفین گئے۔ وہاں کئی سال مقیم رہے۔ پھر ۹۵۵ھ میں ہندوستان آئے۔
بہت سے مشائخ و صوفیا کی صحبت میں رہے اور ان سے اخذ فیض کے بعد دوبارہ دہلی
میں اقامت گزین ہو گئے۔

عبادت گزار، حسن اخلاق کے حامل اور جادۂ صلاح و تقویٰ پر کام زن تھے۔
۹۹۷ھ کو فوت ہوئے۔

۳

۹۶۔ شیخ راجح بن داؤد گجراتی

شیخ راجح کا سلسلہ نسب یہ ہے: راجح بن داؤد بن محمد بن عیسیٰ بن احمد۔
سرزمین ہند کے خطہ گجرات کے رہنے والے تھے۔ حنفی المسلك تھے۔ حدیث و فقہ
اور تمام علوم پر عبور رکھتے تھے۔ ۹ صفر ۸۷۱ھ کو علاقہ گجرات کے مشہور شہر احمد آباد
میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر کے عالم محمود بن مجیر مقری حنفی سے صرف و نحو، منطق اور
عروض وغیرہ کا علم حاصل کیا۔ مخدوم بن برہان الدین سے معانی و بیان کی تحصیل کی۔

۱۱۔ تحفۃ الکرام ص ۴۳۳۔ تاریخ معصومی ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۱۰

تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۵۔

۱۲۔ اخبار الاخبار ص ۲۸۶، ۲۸۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۱۰۔

محمد بن تاج الدین جنفی سے علم ہدیت اور علم کلام کی تکمیل کی۔ یہاں تک کہ تمام مروجہ علوم و فنون اور شعر و شاعری میں درجہ کمال کو پہنچے۔ فہم رسا اور جودتِ طبع کے مالک تھے۔ مکہ مکرمہ میں ۸۹۴ھ کو صاحب الفضل اللامع علامہ سنّاوی سے ملے تو الفیۃ الحدیث کی سند و اجازہ ان سے حاصل کی۔ بعد ازاں ہندوستان واپس آئے اور ۹۰۴ھ میں حجت کو سدھارے۔

۹۷۔ شیخ رحمت اللہ سندھی

شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ بن ابراہیم عمری سندھی، علاقہ سندھ کے موضع دریلہ میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور عوام و خواص کی نگاہ میں فضیلت و عظمت کے حامل ہوئے۔ بعد ازاں اپنے والد شیخ عبداللہ کے ہمراہ گجرات تشریف لے گئے۔ پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور وہاں صاحب ترمذیہ الشریعہ شیخ علی بن محمد بن غزنی خطیب مدنی اور دیگر ائمہ حدیث سے علم حدیث حاصل کیا۔ پھر شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندھی کی معیت میں مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور گجرات میں اقامت اختیار کی۔ چوں کہ حرمین شریفین جانے سے قبل یہ گجرات میں مقیم تھے اور طویل عرصہ تک وہاں رہے تھے، لہذا اس شہر کو ان کے اصل وطن کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہاں سا لہا سال درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ تقویٰ و عزیمت کے حامل تھے۔ قیامِ حجاز کے دوران میں باوجود شدید ضرورت اور تنگ دستی کے کسی سے تحفہ یا نذر قبول نہ کرتے۔ صاحب کبر العمال شیخ علی متقی ملتانی بھی ان دنوں حجاز میں مقیم تھے۔ شیخ رحمت اللہ اور شیخ عبداللہ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ شیخ رحمت اللہ کو عثمانی حکومت کی طرف سے مستحقین اور اصحابِ احتیاج میں تقسیم کرنے کے لیے بہت سامان و اسباب اور نقدی

۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۲۔ طرب الامثال تراجم الافاضل ص ۱۹۶، ۱۹۷۔

۲۔ ذبہ الخواطر، ج ۴، ص ۱۱۱۔ یاد ایام ص ۶۱، ۶۲۔

ارسال کی جاتی، ان میں سے اپنی ذات کے لیے کوئی چیز قبول نہ فرماتے۔
 شیخ رحمۃ اللہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک کا نام کتاب
 المناسک ہے، جس کا آغاز الحمد للہ اکمل الحمد علی ماہدانا لاسلام الخ
 کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ مشہور عالم ملا علی قاری ہروی نے ۱۰۱۲ھ میں للمسک المتوسط
 فی المنسک المتوسط کے نام سے اس کی شرح لکھی۔

ان کی ایک اور تصنیف منسک الصغیر ہے، اس کی شرح بھی ۱۰۱۰ھ میں
 شیخ ملا علی قاری نے سپر قلم کی اور اس کو نہایت المسالک فی نہایت المسالک کے نام سے مہتمم
 کیا۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

شیخ رحمۃ اللہ کے اتنا شیخ علی بن محمد خطیب کی تصنیف کا نام تنزیہ الشریعة
 عن الاحادیث الموضوعۃ ہے۔ انھوں نے اپنے شیخ کی اس کتاب کی تلخیص کی۔
 شیخ رحمۃ اللہ دسویں صدی ہجری کے ارض ہند کے وہ بزرگ تھے جو علم و فضل
 اور تقویٰ و صالحیت کے زیور سے آراستہ تھے۔ شیخ رحمۃ اللہ سندھی اور شیخ عبداللہ
 سندھی کو اپنے علم و تقویٰ کی وجہ سے زمین شرفین میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا
 اور دونوں کو شیخین کہا جاتا تھا۔ شیخ رحمۃ اللہ درج ذیل کتابوں کے مصنف ہیں:

- ۱- المناسک الصغیر: اس کتاب کا قلمی نسخہ برلن لائبریری میں موجود ہے۔
- ۲- بیاب المناسک و عباب المسالک: اس کے قلمی نسخے بانگی پور لائبریری
 اور حیدرآباد (دکن) کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔
- ۳- مجمع المناسک و نفع المناسک: اس کے قلمی نسخے قاہرہ اور ترکی
 کے کتب خانہ سلیمانہ میں موجود ہیں۔

- ۴- المناسک الاوسط: اس کا قلمی نسخہ پشاور یونیورسٹی میں موجود ہے۔
- ۵- رسالۃ فی اقتداء بالشافعیۃ و الخلافہ بذلک: یہ رسالہ قاہرہ
 یونیورسٹی میں موجود ہے۔

ان کا انتقال ایک روایت کے مطابق ۸ محرم ۹۹۴ھ کو، اور ایک روایت

کے مطابق ۱۲ محرم ۹۹۳ھ کو مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اپنے دور کے شیخ، عالم و فاضل اور محدث و فقیہ تھے۔

۹۸۔ شیخ رحمت اللہ گجراتی

شیخ رحمت اللہ بن عزیز اللہ عمری گجراتی، عالم دین اور متوکل علی اللہ تھے۔ مدد علم میں پیدا ہوئے اور معرفت و تصوف کی گود میں پرورش پائی۔ اپنے والد مکرم شیخ عزیز اللہ گجراتی سے علم فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کی، ان ہی سے اخذ فیض کیا، اور اس میں اتنا آگے بڑھے کہ ان کا شمار دیار ہند کے باعمل علما، کبار مشائخ اور اللہ کے صالح بندوں میں ہونے لگا۔ صلاح و تقویٰ، زہد و عبادت، ورع و استقامت اور عفت و توکل میں اونچے مرتبہ پر فائز تھے۔ والد کی وفات کے بعد مشیخت پر متمکن ہوئے، اور ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ و استفادہ کیا۔ اس عالم و فقیہ اور شیخ کبیر نے ۱۹ جمادی الاخریٰ ۹۶۷ھ کو وفات پائی۔

۹۹۔ شیخ رفیع الدین محدث شیرازی

شیخ رفیع الدین بن مرشد الدین حسینی صفوی شیرازی ثم ہندی اکبر آبادی، بہت بڑے عالم دین اور محدث تھے اور ہندوستان کے نامور اور جید علما میں سے تھے۔ علم و عمل کے ساتھ ساتھ جودت و سخا اور لطف و کرم کی دولت سے بھی بہرہ ور تھے۔ علامہ جلال الدین محمد بن اسعد صدیقی دوانی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حج و زیارت کا شرف بھی حاصل

۱۲ اذکار ابرار ص ۵۰۴۔ اخبار الاخیار ص ۲۸۱، ۲۸۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص

۱۱۳، ۱۱۲۔ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۳۱۔ طرب الامثال تراجم الافاضل ص ۱۹۷۔

ابجی العلوم ص۔ ہدیتہ العارفین ج ۱ ص ۳۶۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۲، ۶۵۔ تحفۃ الکرام ص ۴۴۴، ۴۴۳

۱۳ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۱۳، ۱۱۴۔ اذکار ابرار ص ۲۰۷، ۲۰۵۔

فقہائے ہند جلد سوم

کیا۔ سرزمین حجاز میں صاحب الضور اللامع شیخ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی مصری سے علم حدیث کی تحصیل کی اور خدمت تک ان کی خدمت میں رہے۔ بعد ازاں واروہند ہوئے اور سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت میں آگرہ کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ سکندر لودھی ان سے انتہائی تکریم سے پیش آتا اور انھیں حضرت عالی قدر کے الفاظ سے مخاطب کرتا تھا۔ اس جلیل القدر عالم حدیث نے ۹۵۴ھ کو آگرہ میں وفات پائی۔

۱۰۰۔ شیخ رکن الدین بیانوی

شیخ رکن الدین بن محمود بیانوی، شہر بیانہ میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور وہیں اپنے عہد کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ بعد کو بیانہ سے مانڈو چلے گئے تھے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ صالح اور عالم باعمل تھے۔ فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ گھر ہی میں سلسلہ تدریس جاری کر رکھا تھا۔ نماز کے علاوہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ ۱۴ جمادی الاولیٰ ۹۹۲ھ کو فوت ہوئے۔

۱۰۱۔ شیخ رکن الدین سندھی

شیخ رکن الدین سندھی حنفی المساک تھے۔ شیخ بلال محدث تلمیذی کے شاگرد تھے۔ متوک عرف سے معروف تھے۔ اپنے عصر کے فاضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے جید و ممتاز علما میں سے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں شرح الاربعین، شرح خلاصہ کبیرانی اور کچھ اور رسائل شامل ہیں۔ ۹۴۹ھ کو ٹھٹھہ میں

۱۵ اخبار الاخیرہ ص ۲۵۱، ۲۵۲۔ مفتاح التواریخ ص ۱۵۶۔ تذکرۃ علمائے ہند

ص ۶۵۔ نزہتہ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۵۔

۱۵ اذکار ابرار ص ۳۷۰۔ نزہتہ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۵، ۱۱۶۔

ز

۱۰۲۔ شیخ زین الدین بن عبدالعزیز مالاباری

شیخ زین الدین بن عبدالعزیز بن زین الدین بن علی مالاباری ہندوستان کے علاقہ مالابا میں فروکش تھے اور اس نواح میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ شافعی المسلک تھے اور اپنے دور کے مشہور اور نامور فقیہ تھے۔ تمام علوم مروجہ کے ماہر تھے۔ مکہ مکرمہ میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر بیہقی کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کیا۔ فقہ شافعی میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ اس موضوع سے متعلق قرۃ العین فی مہمات الدین کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ۹۸۲ھ میں ایک مختصر رسالے کی بسط و مفصل شرح سپریم کی، جس کو فتح المعین شرح قرۃ العین کے نام سے موسوم کیا۔ ارشاد العباد الی سبیل الرشاد کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو نصیحت و موعظت سے متعلق ہے۔ ان کی ایک تصنیف تحفۃ المجاہدین ہے۔ ایک اور رسالہ بھی ہے، جو موعظت کے بارے میں احادیث و آثار کو محیط ہے۔ اس عظیم المرتبت شافعی عالم و فقیہ کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔ انھوں نے ۹۹۱ھ کو وفات پائی۔ شافعی فقہ کے متعلق مالابار کے علاقے میں ان کی تصنیفات بہت مقبول ہیں۔

۱۰۳۔ شیخ زین الدین بن علی مالاباری

شیخ زین الدین بن علی بن احمد مالاباری طلوع آفتاب کے بعد حجرات کے روز ۱۲ شعبان ۸۷۱ھ یا ۸۷۲ھ کو علاقہ مالابار کے ایک شہر کش میں پیدا ہوئے۔ ابھی

۱۰۲ تا ۱۰۳ ہجری معصومی ص ۲۷۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۱۶۔

۱۰۳ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۱۷، ۱۱۸۔ عربی ادبیات میں پاک ہند کا حصہ ص ۹۸۔

فقہائے ہند جلد سوم

کم عمر ہی تھے کہ ان کے عم محترم قاضی زین الدین بن احمد مالاباری جب فنان کے قاضی مقرر ہوئے تو انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ وہیں قرآن مجید پڑھا، حفظ کیا اور مختلف علما و شیوخ سے صرف و نحو اور فقہ وغیرہ علوم کی مختلف کتابیں پڑھیں۔

مشہور عالم شیخ شہاب الدین احمد بن عثمان بن ابوالحسین سے حدیث اور فقہ کی تکمیل کی۔ علم فرائض کی کتاب الکافی بھی ان سے پڑھی۔

شیخ ابوبکر فخر الدین بن قاضی رمضان شالباقی مالاباری کے سامنے فقہ اور اصول کے لیے زانوئے تلمذتہ کیا۔ شیخ موصوف نے شیخ شمس الدین جوہری شیخ زکریا انصاری اور شیخ کمال الدین محمد بن ابوشریف وغیرہ علمائے دین سے اخذِ علم کیا۔

طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور شیخ قطب الدین بن فرید الدین بن عزالدین جو دہنی سے طریقہ چشتیہ کے مطابق اخذ فیض کیا تھا۔

شیخ زین الدین مالاباری شافعی مسلک کے حامل تھے۔ امام وقت، علامہ ہر اور شیخ عصر تھے۔ عالم باعمل اور محقق تھے۔ ناشر علم و معرفت اور کثیر الاذکار و الاشغال تھے۔ تمام وقت نیکی و خیر کی اشاعت اور تلقینِ نصیحت و موعظت میں مصروف رہتے بدعات و منکرات کی مخالفت، سنت کی ترویج، مظلوم کی حمایت اور اسلام کی تبلیغ ان کا اصل کام تھا۔ ان کی وجہ سے نواح مالابار میں بہت سی بدعات ختم ہوئیں، سنت کی اشاعت کے مواقع پیدا ہوئے، علم دین پھیلا اور بے شمار غیر مسلم دائرۃ اسلام میں داخل ہوئے۔ شیخ ممدوح متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں سے چند یہ ہیں:

مرشد الطلاب الی الکویہ الوہاب : یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔

سراج القلوب : یہ ان کی متوسط اور جامع تصنیف ہے۔

المسعد فی ذکر الموت : یہ کتاب ذکرِ موت کے موضوع سے متعلق ہے۔

شمس الہدیٰ : یہ تذکرہ موعظت پر مشتمل ہے۔

تحفة الاحیاء و حرافة الالباء : یہ اربعہ ماثورہ سے متعلق ہے۔

ارشاد القاصدین فی اختصار منهاج الدین : یہ امام غزالی کی تصنیف کا

اختصار ہے۔

- ابھی کی شعب الایمان کا عربی میں ترجمہ کیا۔
 کفایۃ الفرائض: یہ الکافی کا اختصار ہے جو فرائض کے موضوع سے متعلق ہے۔
 الصفا من الشفا: قاضی عیاض کی الشفا کا اختصار ہے۔
 تسہیل الکافیہ: شرح کافیه ابن حاجب۔ علم نحو کے بارے میں ہے۔
 کفایۃ الطالب فی حل کافیه ابن الحاجب: یہ کافیه پر حاشیہ ہے۔
 الفیہ ابن مالک پر مختصر حاشیہ۔ یہ علم نحو میں ہے۔
 ابن الوردی کی التحفہ پر دو حاشیے سپرد قلم کیے۔
 ابن مقرئ کی الارشاد پر حاشیہ۔
 قصص و اخبار انبیاء کے بارے میں ایک تصنیف۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب۔
 ہدایۃ الاذکیاء الی طریقۃ الاولیاء۔
 سلوک و تصوف کے موضوع پر ایک تصدیقہ۔

تحریریں اہل الایمان علی جہاد عبدۃ الصلبان: یہ کتاب اس زمانے میں تصنیف کی، جب پرتگالی مالا بار پر حملہ آور ہوئے تھے، اس میں انھوں نے غلبہ حاصل کر کے فتنہ و فساد پھیلا دیا تھا، اور بہت سے علاقوں کو نذر آتش کر دیا تھا۔
 نظم و نثر پر مشتمل اور بہت سے رسائل و مکاتیب ہیں جو انھوں نے ملوک امرا کے نام تحریر کیے۔

مالا بار کے اس شافعی المسک عالم و فقیہ اور مصنف و محقق نے جمعہ کی رات نصف شب کے بعد ۱۰ شعبان ۹۲۸ھ کو فنان میں وفات پائی۔

۱۵ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۱۸، ۱۱۹ — عربی ادبیات میں پاک و بہند کا حصہ۔

ص ۳۱۸، ۳۱۹۔

س

۱۰۴۔ شیخ سالار بن ہبۃ الدین کوروی

شیخ سالار بن ہبۃ الدین کوروی ارض ہند کے ایک منقام کوڑہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ صغر سنی ہی میں اپنے شہر کے اساتذہ سے حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے بعد ازاں دوسرے شہروں میں گئے اور علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ یاب ہوئے، جن حضرات سے اخذ علم اور کسب فیض کیا، ان میں شیخ یعقوب لوسمی، شیخ شمس الدین جون پوری، شیخ نظام الدین فتح پوری اور شیخ بہار الدین جون پوری خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے شہر واپس آئے اور علوم و معارف کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔

شیخ سالار حنفی المسلك تھے اور اپنے عصر کے عالم و فقیہ، زاہد و عابد، عقیف و منفی، پیکر دیانت و متانت اور کثیر التعمیر بزرگ تھے۔ ان کے اعتقاد و اخلاف میں بہت سے علما پیدا ہوئے۔ انھوں نے بدھ کے روز ۲۷ ربیع الثانی کا ایک روایت کے مطابق، ۸ ربیع الاول ۵۲۶ھ کو وفات پائی۔

خطہ ہند کے اس جید عالم اور صاحبِ طرفت فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ معلوم ہوتا ہے، ان کا شمار ان فقہائے ہند میں ہوتا تھا، جو کسی کتاب کے مصنف نہ تھے۔

۱۰۵۔ شیخ سعد الدین لاری

شیخ سعد الدین لاری ثم ہندی ماندوی، عالم وقت اور عظیم محدث تھے اور برصغیر پاک و ہند کے ان ذی مرتبت حضرات میں سے تھے جو تفسیر و حدیث میں عبور

رکھتے تھے۔ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۹۰۲ھ کو شہرمانڈو میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات پر لوگوں نے انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا۔ ۱۰

۱۰۶۔ مولانا سعد اللہ لاہوری

مولانا سعد اللہ بن ابراہیم بن فوج اللہ ملتانی لاہوری ۹۲۴ھ کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ بعض کتب درسیہ اپنے والد شیخ ابراہیم سے پڑھیں اور ۹۳۲ھ تک ان سے اسلاک و وابستگی اختیار کیے رکھی۔ والد کی وفات بھی ۹۳۲ھ میں ہوئی۔ اسی سال یا اس سے کچھ عرصہ بعد ملتان سے لاہور آگئے، وہاں شیخ عبدالرحمن بن عزیز اللہ کے حلقہ مدرس میں شامل ہوئے۔ بختاوردنیاں کی روایت کے مطابق علم حاصل کرنے کے بعد شیخ بایزید دیپال پوری کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ اپنے عہد کے شیخ اور فاضل عالم دین بن گئے اور کثرتِ درس و افادہ میں ان کا شمار اس زمانے کے مشہور علما میں ہونے لگا۔ ان کا سلسلہ درس لاہور میں جاری تھا اور علوم کے مختلف گوشوں کی تدریس میں خاص شہرت کے حامل تھے۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا، جن میں خطہ لاہور کے معروف عالم شیخ منور بن عبدالمجید بھی شامل ہیں۔

انھوں نے اٹھتر سال عمر پا کر ۹۹۹ھ میں وفات پائی۔ ۱۱

۱۰۷۔ شیخ سعد اللہ بیانوی

شیخ سعد اللہ بیانوی، بڑے فاضل آدمی تھے، اور صلح علمائے دین میں سے تھے۔ علمِ نحو پر بہت عبور رکھتے تھے، اس لیے نحوی مشہور ہوئے۔ مشرقی ہند

۱۰۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۲۲

۱۰۸۔ اذکار ابرار، ص ۴۷۴۔ طبقات اکبری، ص ۳۹۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۲۳۔

کے باشندے تھے۔ اپنے عصر کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ تصوف و طریقت سے بھی تعلق تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہندوستان کے معروف شہر بیانہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اسی شہر کو درس و افادہ کا مرکز ٹھہرا لیا تھا۔ یہاں تک کہ تمام اصنافِ علوم کے حصول کے لیے لوگ ان ہی کی طرف رجوع کرنے لگے۔

ذکاوت و فطانت میں اپنے دور کے فقید المثال عالم تھے۔ نحو میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے اور اس سلسلے میں درجہ اجتناب پر فائز تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں ملا عبدالقادر بدایونی بھی شامل ہیں، جو سلیم شاہ سوری کے عہد کے آخری دنوں میں اپنے نانا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور ان سے کافی پڑھا تھا۔ تاریخ وفات ۹۸۹ھ ہے۔

۱۰۸۔ مولانا سعد اللہ سندھی

مولانا سعد اللہ سندھی، حنفی المسک تھے، علم و فضل میں یگانہ تھے اور ارض ہند کے اجل اور مجتہد علماء میں سے تھے۔ کثرتِ معلومات کا یہ حال تھا کہ حصولِ علم کے لیے دور دراز سے لوگ ان کی خدمت میں آتے تھے۔ ان کے لڑکے کا نام عبداللہ تھا، جنھوں نے قاضی عبداللہ بن ابراہیم سندھی کے ساتھ مکہ مکرمہ کو ہجرت کر لی تھی۔ ۱۰۰۰ھ میں ہجری کے بھغیر پاک و ہند کے اس عالم و محقق کے حالات کا اس سے زیادہ علم نہیں ہو سکا۔

۱۰۹۔ شیخ سعید حبشی

شیخ سعید بن ابوسعید حبشی، صالح عالم دین تھے اور کبار علمائے عصر میں سے گزرنے

۱۰۸۔ منتخب التواریخ ص ۳۱۵۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۷۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۲۳

۱۰۹۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۲۴، ۱۲۵۔

جاتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس درجہ متعصب مقلد تھے کہ اکثر اوقات ان کی حمایت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تفتیش پر اتر آتے تھے۔ اپنے دور کے فقیہ اور بہت سے علوم کے ماہر تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ عام طور پر تلاوت قرآن میں مصروف رہتے۔ حبشی امران کو بے حد لائق تنظیم قرار دیتے اور ان کی مالی امداد کرتے تھے۔ حصول علم کا شوق ہمیشہ دامن گیر رہا۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے تو وہاں شیخ ابن حجر ہیثمی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ۹۹۱ھ کو احمد آباد میں وفات پائی۔
ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۱۱۰۔ شیخ سلیمان بن عفان مانڈوی

شیخ سلیمان بن عفان دہلوی مانڈوی، بہت بڑے عالم و فقیہ بھی تھے اور صاحبِ طریقت و تصوف اور عارف باللہ بھی۔ وعظ و ارشاد اور لوگوں کی دینی تلقین و ترویج میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اشاعتِ علم و دین میں مختلف بلاد و امصار میں گھومے پھرے اور بہت سے علما و مشائخ سے ملاقات کی۔ دیگر علوم کے علاوہ تجوید و قرأت کے بھی ماہر تھے۔ مولانا عبد القدوس حنفی گنگوہی نے ان سے اخذ فیض کیا، تجوید سیکھی۔ وہ عرصہ دراز تک ان کی خانقاہ میں مقیم رہے۔
شیخ سلیمان پہلے دہلی میں اقامت گزین تھے۔ حملہ تیمور کے زمانے میں دہلی سے مانڈو گئے اور کچھ مدت وہاں مقیم رہنے کے بعد گجرات چلے گئے۔ گجرات سے عازم حرمین شریفین ہوئے اور پورے سچاس سال وہاں اقامت اختیار کیے گئے۔ واپس ہندوستان آئے تو مانڈو کو اپنا مسکن قرار دیا۔
اس عالم و فقیہ نے ۱۴ محرم ۹۴۴ ہجری کو دہلی میں وفات پائی اور وہیں

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۲۵ بحوالہ النور السافر۔

دفعہ کیے گئے یہ

۱۱۱۔ شیخ سہار الدین ملتانی

شیخ سہار الدین بن فخر الدین ملتانی دہلوی، ۸۰۸ھ کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ حصول علم کی طرف صغر سنی ہی میں راغب ہو گئے تھے، چنانچہ میر سید شریف جرجانی کے تلمیذ مولانا ثناء الدین ملتانی کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور ان سے ظاہر کی علوم کی تکمیل کی۔ تصوف و طریقت میں شیخ کبیر الدین حسینی بخاری سے استفادہ کیا۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر، فنون رسمیہ و ظاہریہ میں کامل، ورع و تقویٰ میں یکتا اور عفت و قناعت میں بے مثل تھے۔ عرصہ تک ملتان میں مسند تدریس چھائے رکھی اور بے شمار تشنگانِ علوم کو مختلف علوم کی تعلیم دی۔ بعض واقعات کی بنا پر ملتان سے رنتھنبور اور وہاں سے بیانہ چلے گئے تھے۔ پھر دہلی آ گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سلطان بہلول لودھی کے عہد کے عالم دین تھے۔ آخر عمر میں بھارت زائل ہو گئی تھی اور پھر بغیر کسی دوا و علاج کے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے خود بخود آسکھیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔

نہایت باوقار، بارعیب، عظیم المرتبت، متورع اور بلند کردار عالم دین تھے۔ دنیا سے کوئی شغف و تعلق نہ تھا۔ ہمیشہ درس و افتادہ میں مصروف رہتے اور دین کی تبلیغ کرتے۔

کنبوہ، برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ کہتے ہیں، یہ کنب کی طرف منسوب ہے، جو غزنی کے قریب ایک آبادی کا نام ہے۔ اس میں واؤ نسبتی ہے۔ یعنی باشندگان کنب کو کنبو کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غزنی سے وارد ہند ہوئے اور یہاں آ کر کنبو کہلائے۔

۱۔ اخبار الاحیاء، ص ۲۲۱۔ اذکار ابرار، ص ۳۴۳، ۳۴۴۔ نزیۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۲۹۔

دوسری روایت یہ ہے کہ یہ دراصل فارسی لفظ ”انبوہ“ کا مخفف ہے۔ یعنی چھوٹا گر وہ۔ یہ ایک ایسی جماعت تھی جو بہت کم افراد پر مشتمل تھی اور اس نے ایسے لوگوں پر غلبہ حاصل کیا تھا جو تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھے، پھر آہستہ آہستہ ایک برادری کی شکل اختیار کر گئے اور کثرت استعمال سے ان کو کم انبوہ کے بجائے کنبوہ کیا جانے لگا۔

شیخ سہار الدین ملتانی مصنف و محشی بھی تھے۔ انھوں نے شیخ فخر الدین عراقی کی لمعات پر حواشی تحریر کیے، جو اس کے حل مطالب و معانی میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسالہ مفتاح الاسرار ان کی تصنیف ہے۔ انھوں نے ۱۷ جمادی الاولیٰ ۹۰۱ھ کو دہلی میں وفات پائی ۷۵۵ھ

ش

۱۱۲۔ شاہی بیگ قندھاری ارغون

شاہی بیگ بن ذی النون ارغون قندھاری، قندھار کا بادشاہ تھا جو اپنے باپ ذی النون کی وفات کے بعد دارش تخت بنا۔ یہ فاضل اور عالم بادشاہ تھا۔ ایک مدت تک قندھار کے تخت حکومت پر متمکن رہا۔ پھر مغل حکمران ظہیر الدین بابر نے اس سے حکومت چھین کر ملک پر قبضہ کر لیا اور یہ سندھ میں آ گیا اور سندھ کو فتح کر کے اس پورے علاقے پر اپنا پرچم اقتدار لہرا دیا۔

شاہی بیگ، معقولات و منقولات کا جید عالم تھا اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا۔ جن میں ایک علم نجوم کی منتهی کتاب کافیہ ابن حاجب کی شرح ہے۔ دوسری کتاب

۵۵ اخبار الاخبار، ص ۲۱۱، ۲۱۲ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۰، ۸۱ —

تحریرہ الخواطر، ج ۲، ص ۱۳۰، ۱۳۱ — مفتاح التواریخ، ص ۱۳۸ — حقائق الحقیقہ ص ۳۵۵، ۳۵۶ — اذکار ابرار، ص ۲۰۹، ۱۱۰ — المشاہیر، ص ۲۷، ۲۸ —

شرح المطالع پر تعلیقات ہیں۔ علم قرآن و میراث کے بارے میں سید شریف کی مشہور شرح السراجیہ پر بھی شاہی بیگ نے تعلیقات سپرد قلم کیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کتب و رسائل پر تعلیقات و حواشی لکھے۔

شاہی بیگ بڑا متدین بادشاہ تھا اور قرآن سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ زندگی کی آخری منزل میں داخل ہوا تو حافظ محمد شریف کو طلب کیا اور سورہ یس پڑھنے کو کہا۔ انھوں نے سورہ یس شروع کی اور وَمَا لِيَ لَا اَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَمَا لِيَ لِذِيْكَ تُرْجَعُونَ ہمک پہنچے تو بادشاہ نے کہا تو گفت اے قاری اعادہ کن۔

قاری دوبارہ پڑھو۔

چوں بایہ قال یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۗ بِمَا عَفَوْنِیْ رَجِیْ، رسید جان بحق تسلیم کرد۔

یعنی جب قاری آیت: قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۗ بِمَا عَفَوْنِیْ رَجِیْ پر پہنچا تو جان اللہ کے حوالے کر دی۔

شاہی بیگ نے ۲ شعبان ۹۲۸ھ کو وفات پائی اور سندھ کے شہر بھکر میں دفن کیے گئے۔ بعد ازاں ان کی نعش کو مکہ مکرمہ میں منتقل کر دیا گیا اور قبرستانِ معلیٰ میں سپرد خاک کیا گیا۔

۱۷ یس: ۲۲۔ ترجمہ: اور میرے پاس کون سا عند ہے کہ میں اس (معبود) کی عبادت نہ کروں، جس نے مجھ کو پیدا کیا اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

۱۸ یس: ۲۶، ۲۷۔ ترجمہ: کہنے لگا کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا۔

۱۹ تفصیل کے لیے دیکھیے: مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۲۸۴ تا ۲۹۶۔ تاریخ فرشتہ، ج ۲ ص ۵۱۳، ۵۱۴۔ تحفۃ الکرام، ص ۷۵ تا ۲۰۸۔ تاریخ مصمومی بسلسلہ ارغون حکومت ہند اور اس سے آگے۔

۱۱۳- شیخ شرف الدین شیرازی

شیخ شرف الدین شیرازی فاضل آدمی تھے اور اپنے عصر کے مشہور علما میں سے تھے۔ شیرازی پیدا ہوئے اور وہیں ترتیب و تعلیم کی منزلیں طے کیں۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد واردِ ہند ہوئے اور شیخ محمد غوث گوالیاری سے اخذِ طریقت کیا۔ ایک مدت تک احمد آباد میں ان سے منسلک رہے۔ پھر بیجا پور تشریف لے گئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے تفسیر نبیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔ ۹۳۴ھ میں فوت ہوئے۔

۱۱۴- مولانا شعیب واعظ دہلوی

مولانا شعیب بن مفتی منہاج دہلوی دراصل لاہور کے باشندے تھے اور صغر ہی میں طلبِ علم کی غرض سے لاہور سے دہلی چلے گئے تھے اور پھر وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے دہلوی کہلائے۔ دہلی میں سکونت و اقامت کی ایک وجہ یہ تھی کہ سلطان سکندر لودھی کے عہد میں شہر دہلی کے مفتی مقرر ہو گئے تھے۔ شیخ وقت اور صالح عالم دین تھے۔ مسلکی اعتبار سے حنفی تھے۔ بہت بڑے واعظ اور مذکورہ وقت تھے۔ اپنے والد سے کسبِ علم کیا اور بلند مرتبہ کو پہنچے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے جس سے سیرت اور حسن صورت کے مالک تھے۔ علم و عمل اور تذکرہ و موعظت میں بے مثال تھے۔ نہایت موثر و عظیم کلمے تھے۔ ان کی مجالس و عظ میں علما بھی حاضر فرماتے تھے اور بہت متاثر ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو کی اثر انگیزیوں کا یہ عالم تھا کہ سہرات سننے والے کے دل میں اُترتی چلی جاتی تھی۔ ناممکن تھا کہ ان کی مجالس و عظ کے قریب سے کوئی گزرے اور بغیر سنے چلا جائے۔ وعظ میں قرآن مجید کی آیات

فقہائے ہند عربیہ

پڑھتے اور نصیحت آموز واقعات بیان کرتے۔

اس عالم باعمل اور مشہور واعظ نے ۱۳۶۹ھ کو وفات پائی اور دہلی میں حوض
شمسی کے قریب مدفون ہوئے یہ

۱۱۵۔ شیخ شکر گجراتی

شیخ شکر ناطلی گجراتی، علاقہ گجرات کے نامور عالم و فقیہ تھے اور اللہ کے نیک
اور متقی بندوں میں سے تھے۔ ان کی جائے پیدائش موضع بھیمڑی ہے۔ یہ موضع اس
زمانے میں شہراحمدنگر سے تین دن کی مسافت پر واقع تھا۔ اپنے عصر کے اساتذہ
سے علم حاصل کیا اور درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ مدت مدید تک خدمت
تدریس انجام دیتے رہے۔ پھر سبقت و اشتغال کو ترک کر کے زہد و عبادت کو اپنا
مشغلہ قرار دے لیا۔ ان کا انتقال ۱۰۷۹ھ کے قریب ہوا۔
علاقہ گجرات کے اس جید عالم و فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

۱۱۶۔ قاضی شکر اللہ سندھی

قاضی شکر اللہ کا نسب نامہ یہ ہے۔ شکر اللہ بن وجہ الدین بن نعمت اللہ
بن عرب شاہ بن میرک شاہ بن جمال الدین محدث حسنی و شکی شیرازی، شیخ وقت
اور عالم کبیر تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اصلاً ہرات کے رہنے
والے تھے۔ ۹۰۶ھ میں ہرات سے قندھار منتقل ہو گئے۔ اکیس سال قندھار میں
مقیم رہے اور ۹۲۷ھ کو علاقہ سندھ میں داخل ہوئے اور ٹھٹھہ میں سکونت اختیار

۵۵ لطائف قدوسی ص ۶۱ — اخبار الاخبار، ص ۲۲۵، ۲۲۶ — نزہۃ الخواطر ج ۳

ص ۸۵ — تذکرہ علمائے ہند ص ۸۵

۶۷ اذکار ابرار ص ۳۰۷ — نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۳۸

کی۔ اس زمانے میں سلطان شاہی بیگ ارغون سندھ کے اورنگ سلطنت پر متمکن تھا۔ یہ حکمران خود بھی عالم تھا اور علم و علما کا بھی قدر دان تھا۔ نیکی اور دینداری سے بھی بہرہ ور تھا۔ اس سے شیخ شکر اللہ کی ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل، حدیث فقہ پر عبور، امور دینی میں مہارت، معاملات شرعی میں انہماک، حسن سیرت اور بلندی کردار سے بہت متاثر ہوا، اور ان کو ٹھٹھہ کے منصب قضا پر فائز کر دیا، جس پر وہ کئی سال تک متمکن رہے۔

شاہی بیگ کی وفات کے بعد ۹۲۸ھ میں اس کا بیٹا حسین، تخت سندھ کا مالک بنا۔ یہ عادل و منصف، عالم و کریم، محب اہل علم اور نیک بادشاہ تھا۔ قاضی شکر اللہ اس کے عہد میں بھی بدستور مسند قضا پر متمکن رہے۔ یہ بھی ان کے فہم و فراست علم و قضاہت اور عدالت گستری سے متاثر تھا اور اسی بنا پر ان کی قدر کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اہم منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے نہایت وقار و احترام اور دہریہ و لٹنہ کے ساتھ انجام دیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلطان حسین نے بعض تاجروں سے چند گھوڑے خرید کیے اور ان کی قیمت ادا کرنے سے تباہل و تاخیر سے کام لیا۔ تاجروں نے بادشاہ کے روئیے سے تنگ اور مایوس ہو کر قاضی شکر اللہ سے رجوع کیا اور ان کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہوئے۔ قاضی موصوف نے مدعا علیہ کی حیثیت سے بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ عدالت میں حاضر ہوا تو اسے مدعی تاجروں کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ دعویٰ پیش ہوا تو قاضی کے سوال کرنے پر مدعا علیہ بادشاہ نے تاجروں کے موقف کی تصدیق کی اور قیمت ادا نہ کرنے کا اقرار کیا۔ قاضی نے فریقین کے بیان سن کر اور بادشاہ کے اقرار کرنے پر، تاجروں کے حق میں فیصلہ دیا اور سلطان نے تاجروں کو قیمت ادا کر دی۔ فیصلہ سنانے کے بعد قاضی شکر اللہ اپنی جگہ سے اٹھے، قاعدہ کے مطابق آداب سلطانی بجالاتے اور سلطان کو اپنے پاس بٹھایا۔ اب بادشاہ نے تلوار نکالی جو اس نے قبا میں چھپا رکھی تھی اور اسے قاضی کے سامنے رکھتے

ہوئے کہا:

”یہ تلوار میں نے آپ کے لیے رکھی تھی۔ اگر آپ صحیح فیصلہ نہ کرتے اور میرے آداب و لحاظ میں اپنے منصب و مقام کی بلندی کا خیال نہ رکھتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اُڑا دیتا۔“

قاضی شکر اللہ نے بھی بادشاہ کی یہ بات سن کر مستز کے نیچے سے برہنہ تلوار نکال کر دکھائی اور کہا۔ ”میں نے کبھی یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ مبادا بادشاہ خلاف شریعت قدم اُٹھائے اور کوئی شخص اس کو ٹوکنے کی جرأت نہ کرے تو میں خود اس تلوار سے سیاستِ شرعی بجا لاؤں گا۔“

اس کے بعد سلطان اس فیصلے پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے عدالت سے باہر نکل گیا۔ اس نے تاجروں کو صرف اس لیے قیمت ادا کرنے میں تساہل سے کام لیا تھا کہ وہ قاضی شکر اللہ کو اپنے بارے میں آزمانا چاہتا تھا اور اسے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ بادشاہ کے خلاف اس مقدمہ کے سلسلے میں قاضی صحیح فیصلہ کرتا ہے یا نہیں؟ اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد قاضی شکر اللہ منصبِ قضا سے الگ ہو گئے تھے اور لوگوں سے منقطع ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی یہ۔

قاضی شکر اللہ کا خاندان، ٹھٹھہ میں ساداتِ شکر اللہی شیرازی کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ خانوادہ علم و فضل اور دینی مرتبے کی بنا پر دوسروں سے ممتاز رہا ہے۔ یہ خاندان اب بھی اپنے قدیم محلے میں آباد ہے یہ۔

۱۱۷۔ مولانا شمس الحق جون پوری

مولانا شمس الحق جون پوری حنفی، شیخِ کامل اور صالح عالم دین تھے۔ علم و معرفت

کے تحفۃ الکرام، ص ۵۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۸، ۱۳۹

۱۵ ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ۔ بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء۔ مضمون ”فتاویٰ عالم گیری کے دوسندھی مؤلفین اور ان کے اجداد“

میں یگانہ تھے اور اس ضمن میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے تھے۔ ان کا سلسلہ درس جاری تھا۔ جس سے بے شمار علما و طلبا استفادہ کرتے تھے۔ کلمۂ حق کہنے میں بے باک تھے اور بغیر کسی خوف اور ملامت کے ہر ایک کے سامنے حق بات کہتے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا پیشہ تھا۔ علوم متداولہ میں ماہر تھے۔ حق گوئی کی وجہ سے لوگوں میں مولانا شمس الحق جون پوری حقانی مشہور تھے۔ ۱۲۸ محرم ۹۵۰ھ کو جون پور میں فوت ہوئے۔ ۹۹

۱۱۸۔ علامہ شمس الحق گیلانی

علامہ شمس الحق گیلانی، جلال الدین اکبر کے حمد کے عالم و فاضل تھے۔ فقہ و اصول، علم نحو اور منطق و فلسفہ میں عظیم النظیر تھے۔ بہت بڑے طبیب بھی تھے، اور حکیم الملک کے عرف سے معروف تھے۔ ہمیشہ درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار لوگوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ سخی، کریم النفس، راسخ العقیدہ، صادق القول اور حق پرست عالم دین تھے۔ طلبا سے بدرجہ غایت تعلق خاطر اور ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے تمام اخراجات خود ادا کرتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔ صرف اس بنا پر کسی مجلس میں نہ جاتے کہ درس کا وقت ضائع ہوگا اور طلبا پریشان ہوں گے۔ تمام علوم میں یکساں عبور رکھتے تھے۔

شاہ ہند جلال الدین اکبر ان کی بے حد قدر کرتا تھا اور اس کے تمام امداد مہاجرین ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ضرورت مندوں کی سفارش اور ان کی امداد میں کسی قسم کی بھجک محسوس نہ کرتے۔ احکام شریعت کی پابندی اور دین میں ریسوخ کا یہ عالم تھا کہ جب اکبر کے خیالات میں فسق و فجور نے غلبہ پایا اور علمائے

۹۹ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۳ بحوالہ گنج ارشدی۔

سوئے اس کی تائید کرنا شروع کی تو علامہ شمس الحق نے کھل کر ان کی مخالفت کی اور علمائے سو کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس باب میں نہ کسی سے کبھی خوف زدہ ہوئے اور نہ کسی مروت میں آئے۔ ہمیشہ کلمہ حق بلند کیا اور بلا خوف و خطر کیا۔

* ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کے علم و فضل اور تدبیر و تقویٰ کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ یوں تو تمام علوم کے ماہر تھے مگر طب میں تو جالینوس، زہاں اور مسیح دوران تھے۔ ابو عی سینا اور جالینوس وغیر حکما کے بے حد مداح تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک دن شیخ سلیم چشتی کی مجلس میں بیٹھے فقہ، نصاب مدارس اور فقہا کے واقعات بیان کر رہے تھے، ساتھ ہی اطباء کی تعریف و توصیف اور شیخ ابو علی سینا کی خوبیاں اور اوصاف کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب دورِ اکبر کے علماء و حکما ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں لڑنے جھگڑنے میں مصروف تھے۔ وہ کہتے ہیں، میں ابھی نیا نیا دربارِ اکبری میں گیا تھا، کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ شیخ سلیم چشتی اور علامہ شمس الحق گیلانی کے درمیان کیا مسئلہ موضوع بحث ہے۔ تاہم میں نے ان کی چند باتیں سن کر شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ اشعار پڑھ دیے:

و کہ قلت للقوم انتم علی شفا حفرة من کتاب الشفا

فلما استھانوا بتو بیختنا فرغنا الی اللہ حسبی کف

فما تو اعلیٰ دین اسطاطلیس وعشنا علی ملۃ المصطفا

مزید تائید کے لیے مولانا جامی کا یہ شعر جو تحفہ الاحرار میں ہے، سنا دیا:

نور دل از سینہ سینا مجوی روشنی از چشم نابینا مجوی

یہ اشعار سن کر حکیم الملک سخت غصے میں آگئے اور بُری طرح بگڑے شیخ سلیم

نے کہا۔ یہاں تو پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، تم نے اسے اور بھڑکا دیا۔ بہر حال یہ دینِ اکبری کے حامیوں کے شدید مخالف تھے اور تاحد امکان ان کی خوب خبر لیتے

تھے۔ جب مذہبی حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تو بادشاہ سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی اور ۹۸۸ھ یا ۹۸۹ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی **ﷺ**

۱۱۹۔ شیخ شمس الدین ملتانی

شیخ شمس الدین بن صدر الدین بن شہر اشہر ملتانی لاہوری، شیخ بہار الدین زکریا ملتانی کی اولاد سے تھے اور عالم و فقیہ تھے۔ اپنے والد سے علم حاصل کیا، پھر لاہور آگئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ ۲۶ ربیع الاول ۹۸۸ھ کو فوت ہوئے **ﷺ** افسوس ہے اس سے زیادہ نہ ان کے حالات کا علم ہو سکا اور نہ کسی تصنیف کا پتا چل سکا ہے۔

۱۲۰۔ شیخ شمس الدین بیجاپوری

شیخ شمس الدین بیجاپوری وقت کے علامہ اور فاضل بزرگ تھے۔ شیراز میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور وہیں کے اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ مختلف علوم کے ماہر تھے۔ شیراز میں انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔ بعد ازاں وارد ہند ہوئے اور شیخ محمد غوث گوالیاری سے فیض حاصل کیا۔ پھر بیجاپور تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ نہایت قانع، مستغنی، عقیف اور متوکل علی اللہ تھے۔ زندہ دل نخلص کرتے تھے۔

ماہِ رجب ۹۸۶ھ میں وفات پائی **ﷺ**

ﷺ منتخب التواریخ، ص ۳۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۱۴۰۔

ﷺ اخبار الاصفیاء — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۰۔

ﷺ اذکار ابرار، ص ۳۵۴، ۳۵۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۰۔

۱۲۱۔ مولانا شمس الدین کشمیری

مولانا شمس الدین کشمیری، شیخ اور فاضل بزرگ تھے، حنفی المسک تھے۔ کشمیر کے باشندے تھے اور شمس الدین پال کے نام سے معروف تھے۔ فقہ و کلام میں ماہر اور شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ حریتِ فکر، آزادیِ ضمیر اور صدقِ مقال میں اپنے دور میں لاثانی تھے۔ بڑے فصیح البیان اور بلیغ اللسان تھے مختلف علمی و فقہی مسائل میں علما سے مباحثہ و مناظرہ میں بہت تیز تھے اور اکثر ان پر غالب رہتے تھے رحمۃ اللہ علیہ

دسویں صدی ہجری کے اس عالمِ فقہ کی تاریخ و فوات کا علم نہیں ہو سکا اور نہ کسی تصنیف کا پتہ چل سکا ہے۔

۱۲۲۔ ملا شنگرف کنائی

ملا شنگرف کنائی کشمیری، شیخ اور فاضل آدمی تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے شہر کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ پھر حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ وہیں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر دمشقی شافعی مکی سے حدیث پڑھی۔ پھر واپس کشمیر آئے اور مسند تدریس بچھائی، ان سے بے شمار لوگوں نے نفع حاصل کیا۔ ان کے پاس شیخ ابن حجر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی حاریث کی سند موجود تھی۔ علاقہ کشمیر کے نام ورمحدث و فقیہ اور جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ ملا فیروز مفتی ان کے بزرگوار تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۳۔ سید شیخ بن عبداللہ حضرمی احمد آبادی

سید شیخ بن عبداللہ عیدروس حسینی حضرمی، شیخ کبیر اور عالم و فاضل تھے۔

رحمۃ اللہ علیہ حدائق الحنفیہ، ص ۳۹۱، ۳۹۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۴۳

رحمۃ اللہ علیہ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۴۴۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۹۔

یہ احمد آباد کے وہ صاحب علم بزرگ تھے، جن کا فیض بڑا عام ہوا اور اس نواح کے بلاد و امصار کے تمام لوگ ان سے مستفیض ہوئے۔ ۹۱۹ھ کو ترمیم میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو قرآن مجید حفظ کیا اور حصول علم میں مصروف ہو گئے۔ اپنے والد مکرم، امام شہاب الدین بن عبدالرحمن اور شیخ عبداللہ بن محمد باقشیر سے تحصیل کی۔ پھر یمن گئے اور وہاں شیخ محمد بن عمر باقضا و وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ بعد ازاں ۹۳۸ھ میں اپنے والد کے ہمراہ عازم حجاز ہوئے اور حج کی سعادت حاصل کی۔ مکہ مکرمہ میں شیخ ابوالحسن بکری سے طے اور ان سے سماع علم کیا۔ حج سے فراغت کے بعد اپنے والد کے ساتھ مدینہ طیبہ کا قصد کیا۔ پھر واپس ترمیم گئے۔ کچھ عرصہ بعد ۹۶۱ھ میں دوبارہ عازم حج ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے والد زندہ تھے۔ اب کی بار تین سال مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کی اور طلب علم اور اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر سنہی، علامہ عبداللہ بن احمد فاکھی، ان کے بھائی عبدالقادر، علامہ عبدالرؤف بن یحییٰ اور علامہ محمد بن خطاب مالکی سے اخذ علم کیا۔ مکہ مکرمہ کے ان علما سے انھوں نے بہت استفادہ کیا اور تفسیر، حدیث، فقہ، اصول حدیث، اصول فقہ، علوم عربیہ، تصوف، فرائض و میراث اور حساب میں مہارت پیدا کی۔ مکہ مکرمہ کے دوران قیام میں جہاں وہ مختلف علوم و فنون کے حصول میں مشغول رہے، وہاں طواف اور عمرے بھی کثرت سے کیے۔ مکہ مکرمہ سے عازم زبید ہوئے اور وہاں کے علما و اساتذہ سے استفادہ کیا۔ پھر ترمیم واپس گئے اور تقریباً تیرہ سال وہاں مقیم رہے۔

اب یہ عالم دین ۹۵۸ھ کو ارض ہند میں آئے اور احمد آباد میں وزیر عماد الملک کے ہاں اقامت اختیار کی۔ احمد آباد میں انھوں نے اپنے آپ کو درس و تدریس اور افادہ عام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس نواح میں ان سے بے شمار حضرات نے استفادہ کیا اور علم و فضل کی نعمت سے مستیغ ہوئے، جن میں خود ان کے لڑکے عبدالقادر، نواسے محمد بن عبداللہ سورتی، سید بن علی، شیخ احمد بن علی بکری، عبداللہ بن احمد فلارح، محمد بن

احمد فاکھی اور شیخ حمید بن عبد اللہ سندھی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔
سید شیخ بن عبد اللہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں العقد النبوی السرا
المصطفوی کتاب الفوز والبشری اور اپنے قصیدہ تحفة المرید کی دو شرحیں لکھیں، جن میں
ایک بڑی ہے اور ایک چھوٹی۔ بڑی کا نام حقائق التوحید ہے اور چھوٹی کا سراج التوحید
ایک رسالہ معراج نبوی سے متعلق ہے اور ایک عدل کے موضوع پر ہے تصوف کے
بارے میں بھی ان کی ایک تصنیف ہے۔ سید شیخ شاعر بھی تھے اور ان کا ایک دیوان
بھی ہے، جس میں سے چند اشعار یہ ہیں:

لنا بالرسول المصطفى خیر نسبتہ	مسلسلة تعلقوا علی کل ذنبہ
اثمة علم الله جوہر سرہ	زواہر حلم قدوة للطریقة
شموس نجلت والبدور طوالع	نجوم لنا بالسعد منه استمدت
شموس بدت فی عالم الغیب اثرت	بدو بدت ابدال اوتار صفوة

بعض علمائے کرام نے جن میں شیخ حمید بن عبد اللہ سندھی اور شیخ احمد بن علی
بسکری مکی شامل ہیں، شیخ بن عبد اللہ کے حالات و سوانح قلم بند کیے ہیں۔ شیخ احمد
بن علی بسکری مکی نے جو رسالہ لکھا اس کا نام نزہة الاخوان والنفوس فی مناقب
شیخ بن عبد اللہ العبد دوس رکھا۔ ان کے لڑکے شیخ عبد القادر نے بھی ان کے حالات
قلم بند کیے ہیں۔

حضرت شیخ بتیس سال احمد آباد میں قیام فرما رہے اور ہفتہ کی رات ۲۵ رمضان
۹۹۰ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے ۱۰۱۰ھ

ص

۱۲۴۔ قاضی صدر الدین جالندھری لاہوری

قاضی صدر الدین قریشی عباسی لاہوری، بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے دور کے

۱۰۱۰ھ تا ۱۰۱۱ھ، ص ۳۷۹ تا ۳۸۰ — نزہة الخواطر، ج ۴، ص ۱۴۶ تا ۱۴۸

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ فقہ و اصول، کلام اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ بعض کتب درسیہ مخدوم الملک عبد اللہ سے اور بعض دیگر علما و اساتذہ سے پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جلال الدین اکبر سے ملے تو وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور ان کو علاقہ گجرات کے شہر بھڑوچ کا قاضی مقرر کر دیا۔ نہایت دیانت دار، عالم باعمل اور پرہیزگار تھے۔ فرائض قضا عمدگی سے انجام دیتے تھے۔ تحقیق علوم اور ان کے منطوق و مفہوم میں اپنے استاذ شیخ عبد اللہ سے زیادہ لائق اور فاضل تھے۔ حلو منطوق، عذوبت بیان، ملاحت لسان اور کثرت مطالعہ میں اس دور کا کوئی عالم ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ تمام علوم و فنون اور اقسام ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بحث و اشتغال میں منہمک رہتے اور عمدہ طریق سے گفتگو کرتے۔ وسیع المشرب کھلے دل کے مالک اور فراخ حوصلہ تھے۔ جس شخص کو بھی عابد و زاہد اور امور دنیا سے منقطع سمجھتے، اس سے حسن ظن قائم کر لیتے اور اس کے تقویٰ و ولایت کا دم بھرنے لگتے۔ اگرچہ وہ درحقیقت کتنا ہی مبتدع، غلط کردار اور عامل خلاف شریعت ہوتا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک دن مجذوبوں کی ہیئت میں ایک بدعتی شخص کو آتے دیکھا، تعظیم و احترام میں، بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے اس انداز سے کھڑے ہو گئے جس انداز سے نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، ان کو دیکھ کر اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت خضر میرے ساتھ رہتے ہیں آپ کو ان سے ملا سکتا ہوں۔ یہ الفاظ سنتے ہی اس کے قدموں میں گر گئے اور عرض کناں ہونے کہ مجھے حضرت خضر کی زیارت کرا دو۔ وہ مکار کہنے لگا ان سے ملاقات تو کرا دوں گا مگر آج کل سخت متفکر ہوں۔ میری ایک بیٹی جوان ہے، اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن سامان تیار کرنے کے لیے سات سو تنکے (سکے رائج الوقت) کی ضرورت ہے، وہ کہیں سے مل جائے تو اس فکر سے سبکدوش ہو کر خضر کی زیارت کرا سکوں گا۔ انھوں نے فوراً سات سو تنکے دیا اور اس فکر سے اس کو آزاد کر دیا۔

اب وہ ”مجذوب“ ان کو ”خضر سے ملانے“ کے لیے دریا پار لے گیا اور ہاتھ پکڑ

کردیا میں داخل ہو گیا۔ مجذوب طویل قامت تھا اور قاضی کو تباہ قد تھے۔ جب دونوں گہرے پانی میں گئے تو پانی قاضی کی گردن سے اوپر چلا گیا، وہ وہیں رک گئے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ”مجذوب“ نے کہا میں تو آپ کو خضر سے ملانا چاہتا تھا مگر آپ تو خود ہی نہیں ملنا چاہتے، پانی سے ڈر گئے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

قاضی صدر الدین لاہوری بلند کردار شخص تھے۔ ہر وقت اللہ کا خوف دل پر طاری رہتا۔ خشیتِ الہی سے بہت روتے اور آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ علم ظاہری کے علاوہ تصوف و طریقت سے بھی بہرہ ور تھے اور اس ضمن میں شیخ موسیٰ حداد کے فیض یافتہ تھے، جن کا شمار مجاذیب کی جماعت میں ہوتا تھا۔ طویل عرصہ تک بھڑوچ کے عمدہ قضا پر متعین رہے اور وہیں ۱۵ رمضان ۹۹۰ھ کو وفات پائی۔

۱۲۵۔ شیخ صدر الدین سندھی

شیخ صدر الدین سندھی اقلیم سندھ کے نامور علما میں سے تھے اور سلطان سندھ جام نظام الدین کے عہد میں علم و فقہ میں بہت ماہر تھے۔ تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ علما و فضلا کی بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا اور ہزاروں افراد نے ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ ابتدا میں مدعی ہمدویت سید محمد جون پوری کے شدید مخالف تھے، لیکن جب وہ سندھ میں آئے اور شیخ نے ان سے ملاقات کی اور دونوں کی آپس میں گفتگو ہوئی تو وہ سید محمد کے عقیدت مندوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔

لے منتخب التواریخ، ص ۳۰۷۔ طبقات اکبری، ص ۳۹۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۲، ۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۵۷، ۱۵۸۔ اذکار ابرار، ص ۲۱۰، ۲۱۱۔
لے تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۵۸

۱۲۶۔ سید صدر الدین فنوجی

سید صدر الدین سنہی فنوجی شیخ وقت اور فاضل کبیر تھے اور اپنے عصر کے جید علماء میں سے تھے۔ سلطان سکندر لودھی ان کی بہت تکریم کرتا تھا اور ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اس نے ان کو اپنے ندیموں میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے بھائی سید حسن اور سید امام تھے، وہ بھی وقت کے علماء میں سے تھے۔

۱۲۷۔ سید صفائی ترمذی

سید صفائی بن مرتضیٰ حسینی ترمذی، شیخ وقت اور عالم و فقیہ تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے جید علماء میں سے تھے۔ سلطان محمود شاہ والی سندھ ان کا بہت قدر دان تھا اور اس نے قطب الدین شاہ کی وفات کے بعد ان کو شہر بھکر کی مسند قضا اور مسند شیخ الاسلامی پر متعین کر دیا تھا۔ بھکر کی جامع مسجد ان ہی کی کوشش سے تعمیر کی گئی۔ اللہ نے ان کو اولادِ صالح عطا فرمائی، جن میں محمد معصوم مصنف تاریخ سندھ خاص طور سے مشہور ہیں۔ علم فقہ کے اس عظیم عالم نے ذی القعدہ ۹۹۱ھ کو وفات پائی۔

۱۲۸۔ قاضی صلاح الدین جون پوری

قاضی صلاح الدین خلیل جون پوری حنفی المسدک تھے۔ ارض ہند کے معروف شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ قاضی نظام الدین مصنف فتاویٰ ابراہیم شاہیہ کے نواسے

۱۲۷۔ اجماع العلوم، ص ۹۳۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۵۸، ۱۵۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷۔

۱۲۸۔ آثار رحیمی، ج ۲، ص ۳۳۶۔ تحفۃ الکلام، ص ۳۹۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷۔

نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۵۹۔ تاریخ معصومی، ص ۳۲۷، ۳۲۸۔

فقہائے ہند جلد سوم

تھے۔ اپنے محترم ناناک کی گود میں پرورش پائی اور ان ہی سے اخذِ علم کیا۔ ان کی وفات کے بعد مسندِ قضا پر متمکن ہوئے اور بین سال اس منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ حسنِ اخلاق کے مالک، شیریں کلام، فصیح البیان اور بلند مرتبہ کے حامل عالم دین تھے۔ مروجہ اصنافِ علم میں ہمارت رکھتے تھے۔ مسائل کی جزئیات پر کامل اتحفا تھا اور اس سلسلے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شارح صحیح بخاری سید عبدالاول بن علاء الدین حسینی جون پوری کا اہم ترین خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ شرح الاشباہ والنظائر فی الفروع، ان کی تصنیف ہے۔ دسویں صدی ہجری کے اس عالمِ فقہ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

ض

۱۲۹۔ مولانا ضیا الدین مدنی

مولانا ضیا الدین حسینی مدنی، شیخ و عالم اور محدث تھے۔ ان کا شمار حدیث، لغت اور نحو کے متبحر علما میں ہوتا تھا۔ ہندوستان آئے تو دارالسلطنت دہلی میں ٹھہرے، وہاں دو سال مقیم رہے۔ وہاں سے اودھ گئے اور لکھنؤ کے قریب ایک قریہ میں اقامت گزین ہوئے، جس کا نام کاکوری تھا۔ کاکوری میں پانچ سال چار مہینے رہے اور درس و تدریس کو اپنا مشغلہ قرار دے رکھا۔ اس اثنا میں ان سے شیخ نظام الدین بن سیف الدین علوی کاکوری نے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ صحیح بخاری اور جامع الاصول کا بھی باقاعدہ درس لیا۔ کاکوری میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۵۰ تاریخ شیرازہ ہند جن پور، ص ۷۱، ۷۱۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۶۱۔

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۱۶۲، ۱۶۳۔ بحوالہ کشف المتواری۔

ط

۱۳۰۔ مولانا طیب سندھی

مولانا طیب بن ابوالطیب ٹھٹھوی سندھی، فحول علمائے سندھی سے تھے، شیخ عصر عالم اجل اور اپنے دور کے محدث تھے۔ شیخ ہارون کی اولاد سے تھے۔ ارض سندھ میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی۔ مولانا مفتی یونس سندھی سے علم حاصل کیا اور عرصہ تک ان سے وابستہ رہے۔ پھر علاقہ برار کی طرف متوجہ ہوئے اور شہر ایلیچ پور میں سکونت اختیار کی۔ خاصہ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر شیخ طاہر بن یوسف سندھی کے ساتھ برار پور میں داخل ہوئے۔

درس و افادہ ان کا اصل کام تھا، ساری زندگی اسی خدمت میں صرف کردی۔ متعدد حضرات نے ان سے علم حاصل کیا، شیخ عیسیٰ بن اسم سندھی بھی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ انھوں نے ان سے اصول و کلام کی بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک تو رسالہ غوثیہ کی شرح ہے۔ دوسرے مشکوٰۃ پر نہایت مفید تعلیقات و حواشی ہیں۔

مولانا طیب سندھی نے ۹۹۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

ع

۱۳۱۔ مولانا عباس سندھی

مولانا عباس بن جلال پاتری سندھی اپنے دور میں سرزمین سندھ کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ علاقہ سندھ کے ایک قریہ پاتری میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ۹۴۷ھ کے اوائل میں پاتری سے ہیکور چلے گئے جو اعمال بھکر میں ایک گاؤں

۱۷ اذکار ابراہ، ص ۳۷۷، ۳۷۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۶۵۔

تھا۔ عالم کبیر، قانع و عقیف اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے ماہر تھے۔ اس نور میں اپنے فضل و کمال میں بہت مشہور تھے۔ ہیکور میں سکونت اختیار کی اور ہر طرف سے منقطع ہو کر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے اور بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ ان کے تلامذہ میں قاضی عبدالسلام سندھی اور خلق کثیر شامل ہے۔ چھیا نوے سال کی عمر پا کر ۹۹۸ھ میں فوت ہوئے۔

دسویں صدی ہجری کے سدھ کے اس عظیم المرتبت عالم دین اور فقیہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہو سکا اور نہ اس سے زیادہ ان کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔

۱۳۳۔ میر سید عبدالاول جون پوری

سید عبدالاول بن علامہ الدین حسینی جون پوری اصلاً اعمال جون پور کے ایک مقام زید پور کے باشندے تھے۔ ان کے آبا و اجداد میں سے کوئی بزرگ ارض دکن میں چلے گئے تھے۔ یہ وہیں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی اور شیخ علامہ الدین سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ اپنے علاقے کے شیخ و عالم اور محدث تھے اور ان کا شمار کبار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ دکن سے گجرات تشریف لے گئے اور عرصہ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ پھر عازم حمین تشریف لے ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں سے ہند کی طرف مراجعت کی اور احمد آباد میں اقامت گزین ہوئے۔ وہاں مدت تک درس و تدریس میں مصروف رہے اور بے شمار تشنگان علوم کو علم کی نعمت سے متمتع کیا۔ ان کے اس دور کے بہت سے تلامذہ میں شیخ طاہر بن یوسف سندھی شامل ہیں۔ احمد آباد سے دہلی کا قصد کیا اور دو سال وہاں قیام کیا۔

شیخ عبدالاول بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے ایک کتاب کا

۱۳۳۔ تاریخ معصومی ص ۳۳۶، ۳۳۷۔ گلزار ابرار ص ۳۶

نزهة الخواطر، ج ۲، ص ۱۶۷

نام فیض الباری ہے جو صحیح بخاری کی شرح ہے۔ پھر میراث و فرائض کی مشہور کتاب سراجی کو نظم کیا اور اس کی بسیدہ و مفصل شرح قلم بند کی۔ ایک تصنیف تحقیق نفس کے موضوع میں ہے۔ ایک سفر السعاده کی تلخیص ہے۔ اسی طرح تصوف کی کتاب فتوحات مکیہ اور علم معانی و بیان کی معروف کتاب مطول پر تعلیقات و حواشی سپرد قلم کیے۔ علاوہ ازیں اور بھی کتب و رسائل کے مصنف ہیں۔ اس محدث و فقیہ اور عالم و مصنف نے ۹۶۸ھ کو دہلی میں وفات پائی ۱۰۱۷ھ

۱۳۳۔ شیخ عبد الجلیل جون پوری

شیخ عبد الجلیل بن طہ انصاری جون پوری نے فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور فاضل و عالم آدمی تھے۔ مشہور بزرگ شیخ عبداللہ ہروی کی اولاد سے تھے۔ حدیث فقہ اور دیگر علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور شیخ عبدالعزیز بن حسن عباسی دہلوی کے فیض یافتہ تھے۔ حج کے لیے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے تو دہلی میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ یہ حادثہ ۹۹۰ھ کو پیش آیا ۱۰۱۷ھ

۱۳۴۔ شیخ عبد الحکیم برہان پوری

شیخ عبد الحکیم بن بہار الدین بن معز الدین برہان پوری نے علم و معرفت کی گود میں پرورش پائی اور تصوف و طریقت کی آغوش میں پہلے بڑھے۔ شیخ صالح اوقیفیہ نام ور تھے۔ اپنے والد شیخ بہار الدین سے اخذ فیض کیا اور طویل عرصہ تک ان سے وابستہ رہے۔ امور دنیا سے منقطع ہو کر اپنے آپ کو زہد و عبادت میں مشغول

۱۰۱۷ھ اخبار الاخیار، ص ۲۵۳ تا ۲۵۷۔ خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۲۷، ۴۲۸۔ محلی نور مج ۲

ص ۴۲، ۴۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۶۷، ۱۶۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۶۔ اذکار ابرار، ص ۲۷۵، ۲۷۶۔

۱۰۱۷ھ اذکار ابرار، ص ۳۵۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۶۹۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

کر لیا تھا ۱۷

۱۳۵۔ شیخ عبدالحکیم سنہلی

شیخ عبدالحکیم بن حاتم سنہلی، شہر سنہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ طویل عرصہ تک ان سے اخذِ علم کرتے رہے۔ اور مرتبہ بلند کو پہنچے۔ صالح عالم دین اور کبار علمائے وقت سے تھے۔ ان کے والد بھی مسندِ تدریس پر فائز تھے۔ یہ بھی تمام عمر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ فتاویٰ توکل اور صلاحِ ظاہری سے آراستہ تھے۔ ۹۸۹ھ کو وفات پائی ۱۷

۱۳۶۔ مولانا عبدالحی دہلوی

مولانا عبدالحی بن جلال بن فضل حنفی دہلوی، اپنے عصر کے شاہیر افاضل میں سے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور وہیں اپنے دور کے اساتذہ سے اخذِ علم کیا۔ اپنے والد سے کسبِ فیض کیا۔ نہایت فاضل، کریم النفس، حسنِ اخلاق کے حامل، متواضع اور انتہائی محسن بزرگ تھے۔ ۹۵۹ھ کو فوت ہوئے ۱۷

۱۳۷۔ مولانا عبدالرحمن لاہوری

مولانا عبدالرحمن بن احمد بن عبدالملک لاہوری، صالح عالم دین اور اپنے وقت کے مشہور فضلا میں سے تھے۔ اپنے باپ کی جگہ مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور ہمیشہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بے شمار علمائے ان سے اخذِ علم کیا۔ ۹۷۰ھ کو فوت ہوئے ۱۷

۱۷ نذرۃ النواظر، ج ۴، ص ۱۶۹

۱۷ ایضاً

۱۷ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۷ نذرۃ النواظر، ج ۴، ص ۱۷۱، بحوالہ اخبار الاصفیاء

۱۳۸۔ مولانا عبدالرحمن ملتانی

مولانا عبدالرحمن بن عزیز اللہ ملتانی شیوخ وقت اور اکابر فضلاء عصر میں سے تھے۔ ملتان میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی، اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ اور پھر خدمت تدریس میں مصروف ہو گئے۔ طویل عرصہ تک لاہور میں مدرسہ و تدریس بچھائے رکھی۔ ان سے شیخ سعد اللہ بن ابراہیم ملتانی اور خلق کثیر نے علمی استفادہ کیا یہ

۱۳۹۔ شیخ عبدالرحمن لاہر پوری

شیخ عبدالرحمن بن علاء الدین بن عطار اللہ بن ظہیر الدین عباسی لاہر پوری، خلیفہ ہارون الرشید عباسی کی اولاد سے تھے۔ علاقہ اودھ کے ایک گاؤں لاہر پور میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور اپنے والد شیخ علاء الدین سے علم حاصل کیا۔ ان کی وفات کے بعد دہلی گئے۔ وہاں شیخ عبداللہ بن اللہ داد عثمانی تلمیذ کی سند تدریس بھی ہوئی تھی، ان کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور اخذ علم کیا۔ طویل عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے، یہاں تک کہ علم میں ماہر ہو گئے اور اپنے اندر فتویٰ نویسی اور تدریس کی اہلیت پیدا کر لی۔ شیخ وقت اور فاضل کبیر تھے۔

اس زمانے میں تخت ہند پر سلطان سکندر لودھی متمکن تھا۔ یہ اپنی گونا گوں صلاحیتوں کی بنا پر اس کے مقربین و مصاحبین میں داخل ہو گئے۔ بارہ سال اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر عازم جون پور ہوئے، جون پور میں ایک بزرگ اور صوفی شیخ عبدالسلام کا چشمہ فیض جاری تھا، تمام علائق دنیوی سے منقطع ہو کر ان سے وابستہ ہو گئے اور زہد و عبادت کی زندگی اختیار کر لی۔ اللہ نے لمبی عمر

۵۵ اذکار ابرار ص ۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۱۔ بحوالہ اخبار الاصفیاء۔

عطا فرمائی تھی۔ ۱۲ ذی الحجہ ۹۷۶ھ کو اپنے وطن لاہر پور میں وفات پائی۔

۱۲۰۔ میرک عبدالرحمن ٹھٹھوی

میرک عبدالرحمن بن محمود بن ابوسید خنقی ٹھٹھوی، ارض سندھ کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے اور اپنے دور کے فحول علما میں سے تھے۔ مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اور تاجر عالم تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہے اور خلق کثیر کو علمی فائدہ پہنچایا۔ ۹۹۱ھ کو فوت ہوئے۔

۱۲۱۔ مولانا عبدالرحمن ٹھٹھوی

مولانا عبدالرحمن ٹھٹھوی سندھی علاقہ سندھ میں مرزا علی سی ترخان اور اس کے بیٹے مرزا باقی کے دور حکومت میں شیخ و فاضل کبیر تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مشہورہ میں بے نظیر تھے۔ علمائے عصر کی بہت بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔

۱۲۲۔ قاضی عبدالرحیم سہارن پوری

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرزاق بن خواجہ سالار انصاری سہارن پوری شیخ زمان اور معروف عالم و فقیہ تھے اور اپنے عہد کے اکابر علما میں سے تھے۔ سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ تمام عمر درس اور افادہ عام میں صرف کردی۔

۹۹۰ نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۷۲ بحوالہ اصول المقصود

۱۰۰۰ مآثر رحیمی ج ۲ ص ۳۲۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۷۲

۱۰۰۰ مآثر رحیمی ج ۳ ص ۳۲۷۔ تاریخ معصومی ص ۲۹۸۔ تذکرہ علمائے ہند

۱۰۰۰ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۷۲۔

وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: کہ وہ ۹۶۶ھ میں ہندوستان آئے تو انھوں نے دیکھا کہ اس پورے خطہٴ ارض میں (جس کو اب برصغیر پاک و ہند سے تعبیر کیا جاتا ہے) مولانا عبد السلام لاہوری واحد عالم دین تھے جو گونا گوں علمی کمالات میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ۹۸۳ھ کو لاہور میں انتقال کیا۔ ۱۱ھ

۱۲۵۔ قاضی عبد السمیع اندخانی

قاضی عبد السمیع حنفی اندخانی، صاحبِ ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کی اولاد سے تھے۔ شیخ و عالم تھے۔ علومِ حکمیہ میں بالخصوص ان کا شمار مشاہیرِ علمائے ہند میں ہوتا تھا، مولانا احمد جند کے شاگرد تھے۔ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آئے اور منصبِ قضا پر فائز کر دیے گئے۔ شرح المواقف، شرح المطالع اور ان کے حواشی کی تدریس میں بے مثال تھے۔ ۱۱ھ

۱۲۶۔ قاضی عبد الشکور سہسوانی

قاضی عبد الشکور بن اسماعیل بن عطاء اللہ حسینی مودودی امرہوی ثم

حلقہ درس میں بھی داخل ہے۔ وارد ہند ہونے کے بعد نعل حکمران جلال الدین اکبر سے ملاقات ہوئی تو اس کو ان کی مصاحبت پسند آئی۔ ان پر درویشی اور انکساری کا غلبہ تھا مگر اس کے باوجود بہت خوش مزاج اور ذہین تھے۔ عالم اتنے اونچے درجے کے تھے کہ اس زمانے میں ان کے سے معلومات کا حامل شاید ہی کوئی دیکھتا تھا۔ شاگردوں پر بڑی شدت و مہربانی فرماتے تھے۔ دانش گاہوں کو کرتے تھے۔ بہت بڑا حلقہ درس تھا۔ شاگردوں پر بڑی شدت و مہربانی فرماتے تھے۔ ارض ہند سے کابل گئے اور ۹۰۰ھ میں انتقال کر گئے (منتخب التواریخ)

۱۱ھ گارڈ ابراہار، ص ۶۶ تا ۶۸ - نرہنہ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۹ -

۱۱ھ نرہنہ الخواطر، ج ۴ ص ۱۷۹ - ہفت اقلیم ج ۳، ص ۴۴۳، ۴۴۴ -

سہسوانی، اپنے دور کے دیار ہند کے معروف علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد مکرم (اسماعیل) اور جد امجد (عطا اللہ) اس عصر کے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ سلاطین دہلی کے دربار میں اس خاندان کے بزرگوں کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے آباء اجداد میں ایک بزرگ خواجہ سید محمد خطیر گزرے ہیں جو قاضی عبدالشکور کی اٹھویں پشت یعنی ۶۸۷ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن کے ولی عہد شہزادہ محمد شہید کے اتالیق اور ملکی و فوجی امور میں اس کے معتمد خاص تھے۔ ملتان اور پنجاب کے علاقوں کے منتظم تھے اور اس سلسلے میں عمدہ شہرت کے مالک!

جنگِ ناتار میں محمد شاہ نے شہادت پائی اور خواجہ محمد خطیر سخت زخمی ہوئے۔ پھر غیاث الدین نے ان کو منصبِ وزارت عطا کیا۔ کینخسرو بن محمد شاہ شہید کو خواجہ محمد خطیر ہی کی کوشش سے ولی عہد مقرر کیا گیا تھا مگر غیاث الدین کی وفات کے بعد امرائے سلطنت نے معز الدین کی قیادت کو تختِ نشین کیا اور ولی عہد کو قتل کر دیا گیا، اور ساتھ ہی دہلی میں خواجہ صاحب کے داخلے کی ممانعت کے احکام جاری ہو گئے۔ پھر جب سلطان جلال الدین خلجی بادشاہ ہند ہوا تو اس نے ۶۸۸ھ میں خواجہ محمد خطیر کو دوبارہ عمدہ وزارت پر متمکن کر دیا۔ بعد ازاں علاء الدین خلجی سربراہی سلطنت ہوا تو اس نے بھی خلعتِ وزارت پیش کیا۔ اس ضمن میں تاریخ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

چنانچہ حضرت خواجہ سید خطیر را کہ بہ نیکی ذات و پسندیدگی صفات و اصابت رائے و بہ نظام ملکی و فوجی اشتهار بہ کمال داشت بعدہ وزارت ممتاز گردانید و ہمات و قوام سلطنت برائے مواب دید آنحضرت و انرا داشت کیلہ بہر حال قاضی عبدالشکور کے اسلاف کو سلاطین دہلی کے ہاں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور ان کے دادا خواجہ عطا اللہ کو دربار سلاطین لودھی سے

کالہ تاریخ فرشتہ ج ۱، حالات سلطان علاء الدین خلجی

عالم العلماء کا خطاب ملا تھا۔ ۱۹۷۷ء کو سکندر لودھی کے عہد میں ان کے والد مکرم قاضی اسماعیل کو منصب قضا عطا ہوا۔ یہ خاندان کئی پشتوں سے سہوان میں مقیم تھا اور ورع و تقویٰ، تقدس و نجابت، مکارم اخلاق اور پابندی شرع میں ممتاز۔ ان کے بزرگ مختلف سلاطین ہند کے دور سے عمدہ قضا پر متعین چلے آ رہے تھے۔ قاضی اسماعیل کی وفات کے بعد ان کے بیٹے قاضی عبدالشکور سہوان اور اس کے مضافات کے قاضی القضاة مقرر ہوئے۔ یہ شیخ وقت، عالم و فقیہ اور نہایت نیک آدمی تھے۔ امر وہ نہیں پیدا ہونے اور وہیں پرورش پائی۔ محل حکمران نصیر الدین بھائیوں کے عہد حکومت میں سہوان اور اس کے گرد و نواح کے قاضی مقرر کیے گئے۔ اس علاقے میں قاضی عبدالشکور اور ان کے والد قاضی اسماعیل نے بے حد دینی خدمات انجام دیں۔ ان کی تبلیغی مساعی سے بے شمار لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، ہزاروں ہندوؤں نے مسلمان ہونے کا شرف حاصل کیا، بہت سے مسلمان متبع شریعت ہوئے، متعدد افراد نے علم و فضل کی دولت حاصل کی اور بہت بڑی تعداد ان کی کوشش سے نوری ہدایت سے مستنیر ہوئی۔

منصب قضا پر متعین کرنے کے بعد بھائیوں نے سرزمین سہوان کی وہ جاگیریں جو اس سے قبل قاضی عبدالشکور کے خسر کے بیٹوں۔ محمد حسن اور طاہر۔ کے پاس تھیں قاضی عبدالشکور کو دے دیں۔ لیکن قاضی مدوح نے وہ جاگیریں اپنے پاس نہیں رکھیں بلکہ اپنے خسر کے مندرجہ بالا بیٹوں ہی کے نام منتقل کر دیں اور خود عدل و انصاف اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ تقریباً تیس سال تک وہ وسادہ قضا پر متمکن رہے اور اس طویل مدت میں اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں حتی الامکان کچھ دانستہ طور پر کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ان کے خسر کے بیٹوں کے دل میں اس غلط اندیشے نے گھونٹ لی کہ یہ جاگیریں وہ ان سے کہیں دوبارہ واپس نہ لیں۔ چنانچہ اس موہوم خطرے کے پیش نظر انھوں نے ان کو قسٹ کرا دیا۔

ایک روایت کے مطابق یہ حادثہ ۲۰ ربیع الاول ۹۴۲ھ کو وقوع پذیر ہوا۔^{۱۸} لیکن دوسری روایت کے مطابق جمعہ کے روز ۱۰ محرم ۹۴۲ھ کو مسجد قاضی محلہ چوک (سسوان) میں انھیں اس وقت شہید کیا گیا جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ان کا مادہ تاریخ ”بے شبہ شہید شد“ ہے۔ انھیں ضرب تیغ سے شہید کیا گیا اور ان کے خون کے قطرے قرآن مجید کے اوراق پر گرے۔ وہ قرآن مجید اب تک ان کے درنا کے پاس موجود ہے۔ انھیں مسجد چوک میں دفن کیا گیا۔

جس سال انھیں شہید کیا گیا، اسی سال سلطنت ہند ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہوئی۔ یعنی مغل فرماں روا نصیر الدین ہمایوں، جس نے ان کو منصب قضا عطا کیا تھا اور ۹۳۷ھ سے سرزمین ہند پر داؤد حکمرانی دے رہا تھا، ماہ رجب ۹۴۷ھ کو دس سال کی بادشاہت کے بعد شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران بھاگ گیا اور اس طرح ہند پر اس کا پہلا دور حکمرانی ختم ہوا اور تخت حکومت شیر شاہ سوری کے لیے خالی کیا۔ پھر اس نے ۹۶۳ھ میں ہندوستان پر چڑھائی کی اور فتح یاب ہوا۔ دوسری مرتبہ وہ چند ماہ حکومت کرنے کے بعد وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین اکبر اور ننگ سلطنت پر متمکن ہوا۔

قاضی عبدالشکور کی شہادت کے بعد، ان کے عم محترم خواجہ سید عبداللہ معروف بہ شاہ پنجمین، دادخواہ کی حیثیت سے حاکم سنبھل کے پاس گئے اور اپنے نامور بھتیجے کے قاتلوں کے خلاف نالیش کی۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے اور قاتلوں کو سزا دی گئی۔

قاضی مدوح کے پانچ بیٹے تھے۔ قاضی محمد صالح، مفتی محمد فاضل، خواجہ صدر الدین محمد حاکم الملقب بہ شاہ ولایت بندرگی، مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد اسم۔

۱۸۔ نہرہ افواج، ص ۱۸۰ بحوالہ نخبہ تواریخ - ۱۹ حیوۃ العلماء ص ۱۲

۱۹۔ مولانا محمد باسم بڑے عالم دین اور فقیر تھے۔ کتابستان فقیر ابواللیث سمرقند

یہ پانچوں حضرات علم و فضل اور نیکی و صالحیت کی دولت سے بہرہ ور تھے۔ والد کی وفات کے بعد انھیں حکیم سلطانی قضا و افتا کے مناصب جلیلہ برتتے تھے۔ کہا گیا اور تولیتِ اوقاف دی گئی۔ نیز انعاماتِ سلطانی، خلعت اور جاگیریں عطا کی گئیں۔

۱۲۷۔ شیخ عبدالصمد ردولوی

شیخ عبدالصمد بن اسماعیل بن صفی الدین بن نصیر الدین صفوی ردولوی، ردولی میں پیدا ہوئے اور وہیں تشوونما پائی۔ اپنے والد شیخ اسماعیل بن صفی الدین سے علم حاصل کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ یہاں تک کہ علوم و فنون پر نظر و استحضار میں اپنے تمام اقران و معاصرین پر سلطنت لے گئے جنفی المسلك تھے اور فقہ و کلام اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار۔

شیخ عبدالصمد ردولوی شیخ اسماعیل ردولوی کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ فہم و ذکاوت، علم و ادراک اور ذہانت و فراست میں اپنے دور کے عظیم المثل بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقدوس ردولوی گنگوہی ان کے چھوٹے بھائی تھے جو علم و فضل، تصوف و طریقت اور زہد و عبادت میں بے مثل تھے، وہ ان کو اپنے مراسلات و مکتوبات میں نہایت عزت و احترام کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کے لیے صدر العلماء، بدرالفضل، محقق المعانی، بین الفرقانی اور نیران الثانی جیسے اونچے القاب استعمال

کا ایک نسخہ ان کے ہاتھ آ لایا ہوا، ہندوستان میں اب وہ ہے جو بوسیدہ و کرم خوردہ اور ناتمام ہے۔ اس نسخے پر جابجا ان کے محققانہ حواشی ہیں۔ آخری ورق پر ۹۹۲ مرقوم ہے۔ عبارتِ خانمہ مع نام و نسبِ کاتب اور مہر و دعائے ختم مندرج ہے (ملاحظہ ہو حاشیہ حیوۃ العلماء ص ۱۲)

تفصیل کے لیے دیکھیے حیوۃ العلماء ص ۱۵۰۔ نیز دیکھیے نرہنہ الخیاط

فرماتے ہیں ^{۲۲}

۱۲۸۔ شیخ عبدالصمد سرہندی

شیخ عبدالصمد حسینی سرہندی اپنے عصر کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں ماہر کامل تھے۔ اس زمانے میں جون پور کو علم و تصوف کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور شیخ قوام الدین جون پوری کا چہنمہ فیض جاری تھا، چنانچہ شیخ عبدالصمد نے وہاں کا قصد کیا اور ان سے مستفیض ہوئے ^{۲۳}۔ افسوس ہے کہ دسویں ہجری کے اس سرہندی عالم و فقیہ کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ یہ کب پیدا ہوئے، کہاں علم حاصل کیا، کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ اور خود ان سے کون کون حضرات مستفید ہوئے، اور کب اور کہاں وفات پائی۔

۱۲۹۔ شیخ عبدالعزیز دہلوی

شیخ عبدالعزیز بن حسن بن طاہر عباسی دہلوی جون پوری ۸۹۸ھ کو جون پور میں پیدا ہوئے۔ ابھی عالم طفولیت ہی میں تھے کہ والد مکرم شیخ حسن وفات پا گئے والد کی وفات کے بعد تربیت تعلیم کی ذمہ داری والدہ پر آ پڑی۔ نیک نجات ماں نے بڑی محنت سے تربیت کی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے ہوئیں تو شیخ محمد بن عبدالوہاب حسینی بخاری دہلوی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ ان سے اور شیخ ابراہیم بن حسین الدین حسینی ارجچی سے علم حاصل کیا۔ علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ پھر عازم ظفر آباد ہوئے، وہاں قاضی خاں بن یوسف

^{۲۲} نزہۃ الخواص ج ۲ ص ۱۸۰

^{۲۳} ایضاً ص ۱۸۳۔ بحوالہ عاشقہ۔

فقہائے ہند بلسوم

ناصحی کا سلسلہ فیض جاری تھا اور وہ تصوف میں ان کے والد کے کبار فیض یافتہ حضرات میں سے تھے، تین سال ان کی خدمت میں رہے۔

شیخ عبدالعزیز دہلوی جہاں اپنے دور کے جلیل القدر عالم دین تھے، وہاں کثیر العبادت، اللہ کی یاد میں مصروف رہنے والے، منکسر المزاج، طیب النفس، خوش طبع اور مستغنی عن الناس تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ امر اور حکام سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور ہر وقت یادِ الہی میں مصروف رہتے تھے۔ تاہم لوگوں کے کام کرنے میں ہر آن متوجہ نظر آتے، اور اس کے لیے خود اپنے معمولات چھوڑ کر اور روزمرہ کے وظائف ترک کر کے بھی امر اور حکام کے پاس جلتے اور زہد و عبادت میں مشغول رہنے کے باوجود اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے، جب تک سفارش قبول نہ کر لی جاتی اور ضرورت مند کا کام پائیہ تکمیل کو نہ پہنچ جاتا۔ بعض اوقات صبح سے شام تک یہی سلسلہ جاری رہتا اور تمام وقت اصحابِ اختیار کے دروازوں پر دستک دینے میں صرف ہو جاتا، کیوں کہ لوگوں کے کام آنا اور جائز امور میں ان کی سفارش کرنا ان کے نزدیک بہت بڑی نیکی سے تعبیر تھا۔

اکبر کے ابتدائی عہد میں شیخ عبدالعزیز کو بڑی قبولیت حاصل ہوتی۔ ہرم خاں ان کا معتقد تھا، دوسرے امرائے اکبری بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ فیض کرتے تھے۔

ان کا سلسلہ تدریس بھی جاری تھا اور سلسلہ تصنیف بھی تفسیر اور تصوف کے ماہر تھے اور اس موضوع سے متعلق کتابوں کا باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ان کا تصنیفی ذوق بڑا بلند تھا اور وہ بائیس کتابوں کے مصنف یا شارح تھے۔ علم فقہ میں بھی وہ عبور رکھتے تھے۔ اس موضوع کے بارے میں ان کی ایک تصنیف بھی ہے جس کا نام عمدۃ الاسلام ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور فقہ حنفی پر مشتمل ہے اس کے علاوہ علم سلوک کے متعلق آداب السلوک ان کی ایک تصنیف ہے۔ شیخ ابان اللہ

پانی پتی کے رسالہ غیر یہ کے جواب میں رسالہ عینہ تحریر کیا۔
 اس فقیر منش عالم دین نے پیر کے روز ۶ جمادی الاخریٰ ۹۷۵ھ کو دہلی میں
 وفات پائی۔ اپنے مکتوبات میں اپنے نام سے پہلے اپنے آپ کو ”ذرة ناپسبز“ لکھتے
 تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وفات کے بعد جب ان کا مادہ تاریخ نکالا گیا تو معلوم ہوا
 کہ یہی لفظ ان کا مادہ تاریخ وفات ہے۔
 ان کے شاگردوں میں ملا عبد القادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ)
 شامل ہیں۔

۱۵۰۔ شیخ عبدالعزیز گجراتی

شیخ عبدالعزیز گجراتی کا سلسلہ نسب یہ ہے: ابوالقاسم عبدالعزیز بن محمد
 بن محمد بن محمد بن شاہو بن تلو در بن جام نندہ سندھی گجراتی۔ یہ سلطنت گجرات
 میں وزیر اعظم تھے جنھیں سندھی عالی کہا جاتا تھا، حکومت کی طرف سے آصف خان کا
 لقب عطا ہوا تھا۔

ابوالقاسم عبدالعزیز جمعرات ۲ ربیع الاول ۹۰۷ھ (ایک روایت کے مطابق
 ۹۰۹ھ) کو جانا پناہ میں پیدا ہوئے، اور اپنے والد (محمد) کی گود میں تربیت پائی۔
 ابتدائے عمر ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ پہلے صرف دُخو اور رعانی و
 بیان کی تعلیم حاصل کی۔ پھر علوم شرعیہ کی طرف توجہ مبذول کی اور فاضل برہان الدین
 نروالہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث اور اس سے متعلقہ علوم کی
 تحصیل کی۔ بعد ازاں خطیب ابوالفضل گاندرونی اور سید ابوالفضل استرآبادی

۲۷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۸۳، ۱۸۴۔
 مفتاح التواریخ ص ۱۷۶۔ روڈ کوثر، ص ۷۰، ۷۱۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۶۷، ۶۸۔
 ۶۷۔ اخبار الاخبار، ص ۲۸۲۔ مثنویات، شاہ عبدالعزیز، ص ۹۰۔

کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے منطق و فلسفہ، اصول اور طب کی کتابیں پڑھیں۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ایلڈرنے ان کے لیے اقبال و کامیابی کے دروازے کھول دیے اور سلطان بہادر شاہ والی گجرات نے (جو یکم شوال ۹۳۲ھ کو تخت گجرات پر متمکن ہوا اور رمضان المبارک ۹۳۳ھ کو اسے پرتگالیوں نے دریا میں غرق کر دیا) ان کو اپنا ندیم و مصاحب مقرر کر لیا۔ وزارت، کا منصب عطا کیا اور حبیب الملک کا خطاب دیا۔ اس زمانے میں بہادر شاہ کا وزیر اعظم محمد الدین محمد بن محمد ابجدی تھا، جو بڑی عمر کو پہنچ گیا تھا اور بہت کمزور ہو گیا تھا۔ وہ وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ ہوا تو سلطان نے اس کی جگہ ابو القاسم عبدالعزیز کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب عطا کیا اور ان کو مسندِ عالی آصف خاں کے لقب سے ملقب کیا۔ اسی اثنا میں مہالیوں نے گجرات پر غلبہ حاصل کر لیا تو ان کو ۹۳۲ھ میں مکہ مکرمہ بھیج دیا گیا۔ وہاں یہ سکہ راج الوقت کے سات سو: مرق لے کر گئے اور بے شمار دولت مستحقین میں تقسیم کی۔ ۹۳۷ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔

والی مکہ ابونمی بن برکات حسینی سے ملاقات ہوئی تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔ بعد ازاں مکہ مکرمہ سے مصر پہنچے، اس وقت ان کے ذکیں سراج الدین عمر نہروالا اور والی مکہ کے راجب ان کے ساتھ تھے۔ حاکم مصر خسرو پاشا کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ جب دونوں کی آپس میں گفتگو ہوئی تو حاکم مصر ان کے اسلوبِ کلام اور علم و فضل سے انتہائی متاثر ہوا اور کہا۔ وہ ملک کیوں کسی حادثے سے دوچار ہو سکتا ہے، جس کے ارکان حکومت میں آپ جیسے ذہن و فکر کے حامل افراد موجود ہوں۔ انھوں نے جواب دیا، کسی ملک کو فتح تو تلوار کے زور سے کیا جاتا ہے، مگر اس کے تحفظ کے لیے رائے و تدبیر سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے دو مثالیں دیں۔ ایک بنو امیہ کے حکمران مروان کی کہ وہ بڑے شجاع اور بہادر نکران تھا اور ساتھ ہی انتہائی صابر بھی تھا، یہاں تک کہ مصائب و آلام پر صبر کی وجہ سے لوگوں نے اسے حمار کا لقب دے

رکھا تھا اور وہ مروان الحمار کے نام سے معروف تھا، مگر رائے و تدبیر کی نعمت سے محروم تھا، لہذا ناکام رہا۔

دوسری مثال انھوں نے عبدالحمید کاتب کی دی جو منصور عباسی کے دور کا بہت بڑا ادیب تھا۔ جب منصور نے اس کے قتل کا حکم دیا تو اس نے منصور سے زندہ رہنے کی التجا کی اور کہا، مجھے قتل نہ کرو اور مکتوبات و رسائل اور دستاویزیاں معرض کتابت میں لانے کی خدمت پر مامور کرو۔ منصور نے کہا۔ ہمارے لیے تمھاری تحریر سے بڑھ کر اور کوئی شئی نقصان دہ نہیں ہو سکتی۔ تمھارا قلم تلوار سے زیادہ ہلک ہے۔ تمھیں زندہ رہنے دینا، اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے کہا، حکومت و فرماں روائی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب تک اسے کسی سلطنت کو باقی رکھنا منظور ہوتا ہے، وہ اس کے ارباب اقتدار کو عقل و فراست اور رائے و تدبیر کی دولت سے نوازتا رہتا ہے اور جب اس کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو وہ ان سے اس عظیم نعمت کو چھین لیتا ہے۔

شیخ عبدالعزیز لچھ عرصہ منہ میں رہے پھر مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے واپس مکہ مکرمہ پہنچے۔ ۹۵۵ھ تک وہاں قیام پذیر رہے۔ اس سلسلے کے واقعات بہت طویل ہیں اور ہمارے موضوع سے تعلق بھی نہیں رکھتے، اس لیے ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں ہے۔ سلطان محمود شاہ غزنوی نے گجرات پر تمکن ہوا تو اس نے ان کو واپس ہندوستان بلا لیا اور وزارت کا منصب عطا کیا۔

مکہ مکرمہ میں یہ تقریباً دس سال مقیم رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے کوئی فرض نماز بلا عذر شرعی گھر میں ادا نہیں کی۔ بلاناغہ بیت اللہ میں باجماعت نماز پڑھتے۔ تمام وقت تلاوتِ قرآن، مطالعہ حدیث اور مطالعہ فقہ میں صرف ہوتا، وہاں کے علماء و فقہاء سے علمی مجالسیں رہتیں اور دقیق اور اہم فقہی مسائل زیر بحث آتے۔ تفسیر میں زیادہ ترمذی و سیوطی و کشاف کا مطالعہ کرتے، احادیث میں صحیح بخاری صحیح مسلم، صحاح ستہ اور ان کے شروح و حواشی خود پڑھتے، دوسروں کو بھی پڑھاتے۔ کتب

فقہ میں سے ہدایہ، اس کی شروح، کنز اور اسی قسم کی دیگر کتابوں سے لچسپی رکھتے، اصولِ فقہ میں تلویح، شرح مواقف اور ان کے حواشی کو سامنے رکھتے۔ غرض ہر وقت علمی و فقہی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہتے اور مکہ مکرمہ کے علمائے کرام سے دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

تہجد کے پابند تھے، نماز خشوع و خضوع سے پڑھتے، قرآن مجید سے انتہائی شغف تھا، ان کا معمول تھا، سفر میں ہوں یا حضر میں، ہر رات نماز تہجد میں کم و بیش دس پارے کا مل غور و فکر سے پڑھتے۔ ہر رمضان میں بیت اللہ میں عکافت کرنے اور ہمہ وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہنے۔

فقر و مساکین، علما و فقہا، زہاد و صالحا اور اولیاء و مشائخ سے خاص تعلق خاطر رکھتے، ان کی مجالسوں میں بیٹھتے، ان کی مالی امداد کرنے اور ان سے مل کر خوشی اور مسرت کا اظہار فرماتے۔

علمائے مکہ میں ایک عالم دین شیخ ابوالحسن بکری شافعی تھے، جو علوم میں اجتہاد و امامت کے مرتبے پر فائز تھے، ان کی عادت تھی کہ کبھی کسی کے گھر نہ جاتے اور کسی سے کوئی رابطہ نہ رکھتے تھے، خود دار اور صاحبِ عظمت عالم تھے۔ ان کی ملاقات شیخ عبدالعزیز گجراتی سے ہوئی تو ان کے ظلم و فضل، فقہا بہت اور وسعتِ مطالعہ سے بہت متاثر ہوئے اور بلا تکلف ان کے ہاں آنے جانے لگے۔

شیخ عبدالعزیز نے مکہ مکرمہ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جس کی مسند تدریس پر شیخ عبدالعزیز زمری اور شیخ شہاب الدین احمد بن حجر کی فائز تھے۔ تختِ گجرات پر سلطان محمود شاہ متمکن ہوا تو اس نے ان کو مکہ مکرمہ سے ہندوستان واپس بلالیا اور عمدہ وزارت پر متعین کیا۔ سلطان مذکورہ معاملے میں ان سے مشورہ لیتا اور وہ اس کے نزدیک ہر اعتبار سے قابلِ اعتماد تھے۔ افسوس ہے اس عالم دین رکنِ حکومت کو وائل ربیع الاول ۹۶۱ھ میں ایک اور رکنِ حکومت برہان الدین نے قتل کر دیا۔ ان کی شہادت پر ایک کرام بپا ہو گیا اور مختلف حضرات نے ان پر کئی

مرتبہ کے ساتھ

شیخ عبدالعزیز گجراتی کے حالات میں شیخ ابن حجر مکی نے ایک رسالہ تحریر کیا تھا۔

۱۵۱۔ مولانا عبدالعزیز ابہری کا ہانی

مولانا عبدالعزیز ابہری کا ہانی جو شیخ عماد الدین کا ہانی سندھی کے لقب سے ملقب تھے، اپنے دور کے محدث و فقیہ تھے اور ان کا شمار حدیث و فقہ کے اکابر علماء میں ہوتا تھا۔ عرصہ تک مدرسہ شاہ رخ مرزا (یا مدرسہ سلطانیہ) اور ہرات کی خانقاہ اخلاسیہ میں درس دیتے اور تلامذگان علوم کو اپنے فیوض علمیہ سے سیراب کرتے رہے۔ دراصل یہ ایران کے شہر ہرات کے رہنے والے تھے۔ جب بلاد ایران فسادات کی لپیٹ میں آئے اور وہاں شاہ اسماعیل صفوی نے خروج کیا تو یہ ۹۲۸ھ کے لگ بھگ ہرات سے نکلے اور ارض سندھ میں آ کر مقیم ہو گئے۔ ان کے دو بیٹے، مولانا اثیر الدین اور مولانا یار محمد بھی ساتھ تھے، جو جلیل القدر علمائے دین تھے سندھ میں ان دنوں جام فیروز کی حکومت تھی۔ انھوں نے کاہان کو اپنا مسکن ٹھہرایا جو اعمال سیوستان میں ایک معروف قریہ تھا۔ بہت جلد ان کی شہرت گرد و نواح میں پھیل گئی اور طلبائے علم و وسیع تعداد میں حصول علم کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان سے بے شمار علمائے اخذ علم کیا اور ان کے شاگردوں نے لوگوں کو فیض پہنچایا۔

تدریس کے علاوہ ان کا تصنیفی ذوق بھی بہت بلند تھا، جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ انھوں نے نظام الدین علی شیر کے لیے مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھی، اور بجز مختلف درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیں۔

ملا عبدالباقی نہاوندی نے والی سندھ جام فیروز کے عہد کے واقعات بیان کرتے

۱۵۱۔ نزہۃ الخواصر ج ۲ ص ۱۰۵ تا ۱۹۳۔ نیز دیکھیے تاریخ فرستہ ج ۲ ص ۲۵۰، ۲۵۱۔

ہوئے آثارِ رحیمی میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ مشکوٰۃ کی شرح یہ مکمل نہیں کیے گئے تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

۲۲۶
و در آن وقت مخدوم عبدالعزیز ابہری محوّر فی و مولانا اشیر الدین و مولانا محمد پسران او کہ ہر ایک، عالمے متبحر بودند، بکاہان رفتہ، چند سنین بنشر و افادہ علوم پرداختند و آمدن ایشان از ہرات بسند، بسبب خروج شاہ اسمعیل بود، در ایران بتاریخ مشہور ثمان و عشرين و تسعمائة و شرح مشکوٰۃ نوشته اند اما تا تمام نہ رسیدہ۔ و جامع علوم عقلی و نقلی بودہ، و در کاہان بجوار رحمت اینزدی پیوستہ، در بقعہ کاہان بر آسودہ اند۔

یعنی جام فیروز کے عہدِ حکومت میں مخدوم عبدالعزیز ابہری محدث اور ان کے بیٹے مولانا اشیر الدین اور مولانا محمد، جو کہ متبحر عالم تھے، کاہان تشریف لائے اور کئی سال نشرِ علوم اور افادہ طلباء میں مصروف رہے۔ یہ حضرات، شاہ اسماعیل صفوی کے خروج کی وجہ سے، جو کہ ۹۲۸ھ کے زمانے میں ایران میں ہوا تھا، ہرات سے سندھ آئے۔ انھوں نے مشکوٰۃ کی شرح سپردِ قلم کی لیکن وہ نامتوم رہی۔ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ خطہ کاہان میں، اللہ کے جوارِ رحمت میں آسودہ ہیں۔

کشف الظنون میں حاجی خلیفہ نے ان کی شرح مشکوٰۃ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

عبدالعزیز بن محمد بن عبدالعزیز ابہری المتوفی (فی حدود) سنۃ ۱۰۰۰ مس تسعین و ثمانمائه لزامیو علی شید و سماہ منہاج المشکوٰۃ ۲۲۹

۲۲۶ دیگر تذکروں میں مولانا یا محمد مرقوم ہے۔

۲۲۷ آثارِ رحیمی ج ۲، ص ۲۷۵۔

۲۲۸ تاریخ معصومی میں ۹۱۸ھ لکھا ہے۔ دیکھیے ص ۱۰۶۔

۲۲۹ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۰۔

یعنی عبدالعزیز بن محمد بن عبدالعزیز ابہری نے جو ۸۹۵ھ کے گگ بھگ فوت ہوئے، امیر علی شیر کے لیے (مشکوٰۃ کی شرح لکھی) اور اس کو منہاج المشکوٰۃ کے نام سے موسوم کیا۔

بہر حال مولانا عبدالعزیز ابہری دسویں صدی ہجری کے دیار ہند کے ایک عالم و فقیہ اور محدث بزرگ تھے۔ انہوں نے تدریس اور تصنیف دونوں طریق سے اہل علم کو مستفید فرمایا۔ ان کا تذکرہ اگرچہ مختصر الفاظ میں ہے تاہم برصغیر کی اسلامی اور علمی تاریخ کی متعدد کتابوں میں کیا گیا ہے ۳۱

۳۱ حاجی خلیفہ سے ان کے سن وفات کے بارے میں سہو ہو گیا ہے۔ بلاشبہ ان کی صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، تاہم بحقیقت ہے کہ وہ تاریخ معصومی کی روایت کے مطابق ۹۱۸ھ میں اور ماثر جمی کے مطابق ۹۲۸ھ میں سندھ آئے۔ سندھ میں چھ تک تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے۔ لہذا ۸۹۵ھ کو کسی صورت میں ان کا سن وفات قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہاں صاحب نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی سے بھی کشف الظنون کے حوالے کے سلسلے میں سبقت قلم ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وذكره الفاضل الجليلي في كشف الظنون، وقال انه مات سنة ثمان وعشرين وتسع مائة ولا يصح فانه خرج من هرات في تلك السنة ومات بكاهان - (نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۹۴)

یعنی کشف الظنون میں حاجی خلیفہ چلیبی نے ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے ۹۲۸ھ میں وفات پائی، صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس سال تو وہ ہرات سے نکلے تھے۔ ان کی وفات کا ہاں میں ہوئی۔ نزہۃ الخواطر کے الفاظ نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ حاجی خلیفہ نے ان کا سال وفات ۹۲۸ھ نہیں لکھا بلکہ ۸۹۵ھ لکھا ہے لفظوں میں بھی اور ہندسوں میں بھی۔

اسے ملاحظہ ہو۔ ماثر جمی ج ۲ ص ۲۷۵۔ تاریخ معصومی ص ۱۰۶۔ تحفۃ الکلام ص ۴۴۲۔

تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۹، ۲۷۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

۱۵۲۔ قاضی عبدالغفور پانی پتی

قاضی عبدالغفور پانی پتی، بھولا کے خوف سے معروف تھے۔ شیخ وقت اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اپنے عصر کے مشاہیر فقہاء میں ہوتا تھا۔ حنفی المسک تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے معاصر تھے۔ یہ مدت الوجود کے مسئلہ سے متعلق انہوں نے شیخ سے مناظرہ و مباحثہ بھی کیا تھا۔ شیخ کے بیٹے شیخ رکن الدین محمد بن عبدالقدوس نے لطائف قدوسی میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مناظرہ خاصی دیر جاری رہا۔ بالآخر قاضی ممدوح خاموش ہو گئے تھے اور شیخ کی گفتگو کا جواب نہیں دے سکے تھے۔ ۳۲

۱۵۳۔ مفتی عبدالغفور امر وہوی

مفتی عبدالغفور بن عبدالملک بن محمود حسینی امر وہوی، شیخ عالم باعمل فقیہ اور اللہ کے نیک بندے تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالملک امر وہی کی مسند افتاء پر فائز تھے۔ باپ کی وفات کے بعد ۵۰ھ میں مفتی عبدالغفور نے مسند سنبھالی اور علم و افتاء کے سلسلے میں باپ کے صحیح جانشین ہوئے۔ تادم زندگی اس منصب پر متمکن رہے۔ ۹۰ھ میں یا اس کے لگ بھگ وفات پائی۔ ۹۰ھ میں یہ مسند ان کے بیٹے مفتی عبدالقدوس کے سپرد ہوئی۔ ۳۳

۱۵۴۔ شیخ عبدالغفور اعظم پوری

شیخ عبدالغفور اعظم پوری، اعظم پور کے رہنے والے تھے، جو ہندوستان کے

۳۲ لطائف قدوسی ص ۵۵، ۵۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹۵

۳۳ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹۵ بحوالہ نخبة التواریخ

صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ صالح عالم دین اور فقیہ وقت تھے۔ مسلک حنفی تھے۔
 کتب درسیہ شیخ نظام الدین کا کوروی سے پڑھیں اور طویل مدت تک ان سے وابستہ
 رہے۔ تصوف و طریقت سے دلچسپی پیدا ہوئی تو شیخ عبدالقادر س گنگوہی کی خدمت
 میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ اللہ نے صورت و سیرت دونوں سے توازن
 رکھا۔ علمائے ربانی میں سے تھے۔ علوم شرعیہ کا درس دیتے اور طلباء کو مستفید فرماتے تھے۔
 جمعہ کے روز باقاعدہ وعظ کتے تھے۔ بیعت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بیعت لینے والوں
 کو امور خیر پر قائم رہنے کی تلقین کرتے اور برائی کے ارتکاب سے روکتے۔ عوام کے علاوہ
 علما و مشائخ نے بھی ان سے استفادہ اور استفادہ کیا۔
 دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین نے بیستمی سال کی عمر پاکر ۹۸۵ھ
 میں وفات پائی۔

۱۵۵۔ شیخ عبدالغنی فتح پوری

شیخ عبدالغنی بن حسام الدین صدیقی فتح پوری، ایک فاضل بزرگ تھے،
 اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ فتح پور میں پیدا ہوئے جو اعمال لکھنؤ
 میں واقع ہے، وہیں نشوونما پائی اور عمر کی کچھ منسلک لیں طے کیں۔ حصول علم کے
 لیے جون پور کا قصد کیا اور وہاں شیخ معروف بن عبدالواسع جون پوری اور
 دیگر علما سے کسب علم کیا۔ شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی بھی ان کے شریک درس
 تھے اور ان کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ مدت تک شیخ معروف کی خدمت میں رہے۔
 علم طریقت بھی ان سے حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن فتح پور
 واپس آئے اور درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔

۳۲۷ منتخب التواریخ ص ۲۹۲۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۵۔ طبقات

اکبری ص ۳۹۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۹۵، ۱۹۶

نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۱۹۶ بحوالہ تحقیق الانساب

۱۵۶۔ علامہ عبدالقادر سرہندی

علامہ عبدالقادر حنفی سرہندی (جنھیں گلزار ابرار میں مولانا عبدالقادر صابونی لکھا گیا ہے) شیخ عصر اور قاضی بزرگ تھے۔ علم و تحقیق کی وسعتوں کی بنا پر دسویں صدی ہجری میں انھیں دیارِ ہند کے مشہور اساتذہ میں گروانا جاتا تھا۔ شیخ الحداد (اللہ داد) بن صالح سرہندی سے تحصیل علم کی اور بہت عرصہ تک ان سے وابستگی و مصاحبت اختیار کیے رکھی۔ پھر دہلی میں مسند تدریس پر فائز ہوئے اور تمام عمر درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اپنے عصر و شہر میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری اور بہت سے لوگوں نے ان سے کسبِ علم کیا۔

علوم و فنون پر علامہ عبدالقادر سرہندی کے عبور و مہارت کا یہ علم تھا کہ شیخ الحداد جون پوری (اللہ داد جون پوری) نے علمِ نحو کی مشہور کتاب کافہ کی جو شرح لکھی، اس پر انھوں نے حواشی و تعلیقات لکھیں جس کی علامہ عصام الدین اسفرائینی نے اس درجہ تحسین کی کہ انھیں اپنی کتاب الاطول تحفہ کے طور پر بھیجی۔ ان کی شہرت علمی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ علمِ بیان کی معروف کتاب طویل کے محشی شیخ حسن چلبی ہندوستان آئے تو ان کی زیارت و ملاقات کے لیے سرہند گئے، ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور ان کے فضل و کمال کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا۔

۱۵۷۔ قاضی عبداللہ سندھی

قاضی عبداللہ بن ابراہیم عمری سندھی، دیارِ سندھ کے ایک شہر و وسیلہ

۱۱۱۱ھ اذکار ابرار (دریا شیخ اللہ داؤدین صالح) ص ۴۹۴ — مرآة العالم بختا و رخاں —

نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۱۹۸

میں پیدا ہوئے اور شارح مشکوٰۃ شیخ عبدالعزیز ابہری سے اخذِ علم کیا۔ اپنے زمانے کے شیخ، عالم و فقیہ، متقی اور پرمیزگار تھے، مگر مزاج میں سختی اور تیزی کا عنصر غالب تھا۔ ابتدا میں اپنے اصل وطن درہیلہ میں رہتے تھے اور وہاں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن جب شاہی بیگ نے سندھ فتح کیا تو باغبان اور راوت چلے گئے تھے، پھر کچھ عرصہ ہی بعد ۹۳۴ھ میں سندھ سے عازمِ گجرات ہوئے، وہاں سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی۔

قاضی عبداللہ کے تین خلیفے اور شاگرد تھے اور وہ تھے، شیخ صالح شیخ رحمت اللہ اور شیخ حمید۔ شیخ رحمت اللہ اور شیخ حمید قاضی محمد فرح کے فرزند تھے۔ پہلے تو یہ دونوں ہندوستان رہے، بعد کو حرمین شریفین چلے گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے عمر کا زیادہ حصہ وہیں گزارا اور خدمتِ دین میں مصروف رہے۔

قاضی عبداللہ کے بیٹے شیخ رحمت اللہ اپنے عہد کے یگانہ عالم دین تھے۔ احکام حج کے بارے میں انھوں نے تین رسالے تصنیف کیے، جن میں ایک کا نام «المنسک الحج» ہے۔ ملا علی قاری نے اس کو بالخصوص اہمیت دی اور اس کی شرح لکھی۔ ان کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا۔

دوسرے فرزند شیخ حمید بھی علم و فضل کے زیور سے آراستہ اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ تفسیر و حدیث میں خصوصیت سے درک حاصل تھا۔ تاریخ معصومی کے مصنف میر محمد معصوم بھکری کے استاد تھے۔ میر معصوم نے ان سے مشکوٰۃ اور دیگر کتب احادیث کا باقاعدہ درس لیا اور سند و اجازہ سے سرفراز ہوئے۔ حرمین شریفین گئے اور پھر مکہ شریف ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں درس حدیث میں مشغول ہو گئے اور مکہ مکرمہ کے علما میں قدر و منزلت کے حامل قرار پائے۔

قاضی عبداللہ سندھی مکہ مکرمہ کس طرح پہنچے؟ اور زادراہ کہاں سے ملا؟ بات یہ ہے کہ ان کے قیامِ گجرات کے زمانے میں ایک عالم شیخ علی متقی بھی گجرات میں

موجود تھے، جن کے زہد و اتقا کی بڑی شہرت تھی اور اسی وجہ سے بلا و گجرات میں بہت ہی قبولیت و عظمت کے حامل تھے۔ دالی گجرات بہادر شاہ ان کے فضل و کمال کا انتہائی معترف تھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کا خواہاں تھا، مگر شیخ منقہی اس پر رضامند نہ ہوتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کی مجلس میں آئے۔ ایک روز اس نے قاضی عبداللہ سندھی سے بات کی اور ملتھی ہوا کہ شیخ اسے اپنی مجلس میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ قاضی موصوف نے شیخ سے بادشاہ کی اس خواہش کا اظہار کیا، اور ان کی مجلس میں آنے کے لیے اس کی سفارش کی تو نہایت خفا ہوئے اور فرمایا، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ میرے پاس اپنی تمام منکرات اور خلاف شرع امور کے ساتھ آئے اور میں اسے نیکی برعینہ پیرا ہونے کا اور بُرائی سے رکنے کا حکم نہ دوں۔ میں لازماً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجالاؤں گا۔ اگر اسے یہ منظور ہے تو آنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ قاضی نے بادشاہ سے بات کی تو اس نے عرض کیا کہ وہ جس انداز سے چاہیں امر بالمعروف کریں اور جس صورت میں مناسب سمجھیں نہی عن المنکر فرمائیں۔ مجھے سب منظور ہے اب شیخ نے حاضر مجلس ہونے کی اجازت دی تو وہ انتہائی احترام کے ساتھ اندر آیا، شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا، وہاں کچھ دیر بیٹھا اور چلا گیا۔ پھر اس نے ایک لاکھ ننانکھ جو سکہ رائج الوقت تھا، شیخ کی خدمت میں بھیجا، وہ پوری رقم شیخ نے قاضی عبداللہ کو دے دی جو حرمین شریفین جانے کے لیے ان کا زادراہ ہوئی۔

۱۵۸۔ مولانا عبداللہ تلنبی

مولانا عبداللہ بن اللہ داد عثمانی تلنبی، شیخ عصر، علامہ دہراور فاضل وقت

۳۷ تاریخ معصومی ص ۲۷۸، ۲۷۹۔ تحفۃ الکریم ص ۲۴۲، ۲۴۳۔ اخبار الاخیار ص ۲۸۰، ۲۸۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ اذکار اہرار ص ۵۰۴۔

تھے۔ علاؤدلتان کے مشہور مقام، تلنبہ کے رہنے والے تھے۔ تلنبہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور پھر اسی شہر اور اس کے گرد و نواح کے علما سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یعنی خط، حساب اور علوم عربیہ کی چند کتابیں پڑھیں۔ مزید حصول علم کا شوق دامن گیر ہوا تو دیار ہند سے نکلے اور عراق عجم کی راہ لی وہاں علامہ عبداللہ ریزوی کا سلسلہ تدریس جاری تھا، ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوئے اور ان سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کی۔ طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا، یہاں تک کہ آغازِ عمر اور عنفوانِ شباب ہی میں علوم نقلیہ و عقلیہ پر اس درجہ عبور حاصل کر لیا کہ سب سے سبقت لے گئے۔ اب وہ علوم مروّجہ میں ماہر تھے اور اس ضمن میں اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے۔ فرطِ ذکاوت، تیز ذہن، قوتِ حافظہ اور سرعتِ ادراک میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

فارسِ التحصیل ہو کر وطن واپس آئے تو ان کا شمار ملک کے اکابرِ علم میں ہونے لگا۔ اپنے شہر تلنبہ میں مسند تدریس آرا سننے کی اور کئی سال درس و افادہ میں مصروف رہے۔ پھر ملتان اور اس کے گرد و نواح فتنہ و فساد کی زد میں آئے، تو تلنبہ کی سکونت ترک کر کے دہلی چلے گئے۔ (اس سفر میں مولانا عزیز اللہ تلنبی بھی ان کے ساتھ تھے، جن کے حالات آگے بیان ہوں گے) سخت دہلی پران دنوں سلطان سکندر لودھی متمکن تھا۔ وہ علما کا بہت قدر دان تھا۔ اس کو مولانا عبداللہ کی دہلی میں آمد کی اطلاع ہوئی تو بے حد خوش ہوا، ان کی تشریف آوری کو مغنم جانا اور ان کے علم و فضل کی فراوانیوں سے متاثر ہو کر انھیں ملک العلماء کا خطاب عطا کیا۔

سکندر لودھی کی طرف سے انھیں دہلی کی مسند تدریس پیش کی گئی۔ ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا اور انھوں نے منطق و حکمت کی مشکل و دقیق کتابوں کو نہایت تحقیق سے پڑھانا شروع کیا۔ ان کے دہلی کے درس سے دیار ہند کے پائیس متبحر اور عظیم عالم دین فارس ہو کر نکلے۔ انھوں نے مروّجہ نصاب میں بڑی تبدیلی کی،

نہتائے ہند جلد سوم

اور اس زمانے کے حالات کے مطابق اس میں نئی نئی کتابیں داخل کیں، مثلاً ان سے پہلے ہندوستان کے مدارس میں منطق کی شرح شمسہ اور علم کلام کی شرح الصفا اور دیگر چند رسائل پڑھائے جاتے تھے، انھوں نے ان کو وسعت دی اور نصاب میں بہت سی دیگر کتابوں کو شامل کیا۔

شاہ ہند سکندر لودھی ان سے انتہائی تکریم کے ساتھ پیش آتا تھا، وہ ان کے درس میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتا لیکن دے پاؤں آتا اور ادب سے ایک گوشے میں آکر بیٹھ جاتا تاکہ بادشاہ کی آمد کی وجہ سے طلباء کے سبق میں خلل واقع نہ ہو۔ درس کے بعد وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کو سلام کرتا اور دیر تک مودب ہو کر ان کی صحبت میں بیٹھتا۔ اس ضمن میں ملا عبدالقادر بدایونی کے یہ الفاظ قابل مطالعہ ہیں :

ومی گویند کہ سلطان سکندر در وقت درس شیخ عبداللہ می آید و بتقریب اینکه مباداخلل در سبق طلبہ افتد پنہاں در گوشہ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیک گفتہ، بایک دیگر صحبت می داشتند

سکندر لودھی علم اور اہل علم کا قدردان تھا۔ علما کی مجلس میں باقاعدہ حاضری دیتا اور ان کے خیالات سے استفادہ کرتا۔ وہ کبھی کبھی علما کے اجتماع بھی منعقد کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مختلف اقطاع ہند کے علمائے کرام کو جمع کیا، جس میں بعض مسائل زیر بحث لائے گئے۔ اس نے علما کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک فریق مولانا عبداللہ تلمیبی اور مولانا عزیز اللہ تلمیبی پر مشتمل تھا، اور دوسرا شیخ الہمداد (الشاہ) جون پوری اور ان کے بیٹے شیخ بھکاری پر۔ بحث و مناظرہ کا آغاز ہوا، تو دونوں فریقوں نے خوب خوب داد و تحقیق دی۔ بحث تحریری اور تقریری دونوں صورتوں میں ہوئی۔ سلطان خود بھی ذمی علم تھا اور مسائل کی باریکیوں کو خوب سمجھتا تھا۔

اس نے فیصلہ دیا کہ فریق اولِ حُسنِ تقریب میں فریقِ ثانی سے بازی لے گیا ہے اور فریقِ ثانی حُسنِ تحریر میں فریقِ اول سے بڑھ گیا ہے۔

مولانا عبداللہ تلمبئی علمِ فقہ سے بھی نعلق رکھتے تھے اور ان کا شمار اپنے دور کے نامور فقہاء میں ہوتا تھا۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں سے چالیس سے زائد جلیل القدر علمائے دین نے خاص طور سے شہرت حاصل کی۔ ان میں مفتی جلال الدین، ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالغفور بن نصیر الدین دہلوی، میاں شیخ گوالبیاری اور میراں جلال الدین بدایونی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر عالم ان کی فیضِ صحبت سے نابغہ روزگار ہوئے اور اپنے عصر کے مشاہیر اساتذہ میں سے گردانے گئے۔ وہ اعلیٰ درجے کا تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے۔

وہ پہلے ہندی عالم ہیں جنہوں نے ہندوستان میں فلسفے کے مطالعے کو فروغ دیا، اور پہلے ہندی مصنف ہیں جنہوں نے فلسفے کے موضوع پر کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے بدیع المینران کے نام سے منطق کی مشہور کتاب میزان المنطق کی شرح لکھی، جو اس موضوع پر ایک ہندی عالم کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ شرح اور اصل متن اب بھی مقبول ہیں اور پاک و ہند میں منطق کے طلباء ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس کتاب کے قلمی نسخے انڈیا آفس لائبریری لندن، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن، بانکی پور، رام پور، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دہلی کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مولانا عبداللہ تلمبئی نے ۹۲۲ھ کو دہلی میں وفات پائی، قرآن کے الفاظ: **اُولَئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ** سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے **۹۲۲ھ**

۱۵۹۔ مولانا عبداللہ حجون پوری

مولانا عبداللہ بن اللہ داد حجون پوری، حنفی المساک تھے اور اپنے عصر کے شیخ و

۱۳۹۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۱۔ اجماع العلوم ص ۸۹۴۔ آثار الکرام ج ۱ ص ۱۷۶، ۱۷۵۔ سبحة المرجان ص ۴۲۔ نزہۃ الخواصر ج ۲ ص ۲۰۷، ۲۰۵۔ منتخب التواریخ ص ۸۶۔ حدائق الحنفیہ ص ۲۶۲، ۲۶۳۔

فاضل بزرگ تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور بچپن ہی میں اپنے والد مکرم شیخ اللہ داد جون پوری سے تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ علوم عربیہ میں ممتاز درجے تک پہنچے اور اپنے معاصرین و اقران سے فوقیت لے گئے۔ یہ وہی عالم دین ہیں جنہیں مصنف منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی شیخ بہکاری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ برصغیر میں یہ رواج ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اصل ناموں کے علاوہ پیارے سے دوسرے ناموں سے بھی پکارتے ہیں اور پھر یہ نام آخر تک بطور عرف ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ معاذم ہوتا ہے مولانا عبداللہ کے نام کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ان کا اصل نام عبداللہ تھا، انھیں بچپن میں بہکاری کے نام سے پکارا جاتا تھا، جس کا آخر تک ان پر اطلاق ہوتا رہا۔

تذکرہ علمائے ہند میں شیخ بہکاری جون پوری ابن شیخ اللہ داد جون پوری کے عنوان سے ان کا تذکرہ موجود ہے اور انھیں سلطان سکندر لودھی کے عہد کے فحول علما میں سے شمار کیا گیا ہے۔ یہ وہی شیخ بہکاری ہیں اور ان کے والد شیخ اللہ داد جون پوری بھی وہی بزرگ ہیں، جو سلطان سکندر لودھی کے دربار کے ایک مناظر میں مولانا عبداللہ تلمیبی اور مولانا عزیز اللہ تلمیبی سے تحریر میں سبقت لے گئے تھے۔

۱۶۰۔ شیخ عبداللہ متقی سندھی

شیخ عبداللہ بن سعد اللہ متقی سندھی، سرزمین سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ سندھ سے ہجرت چلے گئے تھے۔ گجرات میں سندھ کے ایک اور عالم و فقیہ قاضی عبداللہ بن ابراہیم سندھی مقیم تھے۔ ۹۴۷ھ میں ان سے ملاقی ہوئے۔

۱۶۰۔ تذکرہ المناظر، ج ۴ ص ۲۰۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۳۔ نیز ملاحظہ

ہو منتخب التواریخ ص ۸۶۔

پھر حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں کے علمائے کرام اور صاحب کسب الرجال شیخ علی منقنی برہان پوری سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ مدینہ منورہ میں طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ یہاں تک کہ شیخ عبداللہ ماجیر مدنی کے نام سے معروف ہوئے۔ تفسیر اور حدیث کے حلیل عالم تھے، ان کے زمانے میں علم و فضل کے میدان میں کوئی ان کی ٹکر کا نہ تھا۔

مدینہ منورہ میں کئی سال کی اقامت کے بعد ۷۷۷ھ کو شیخ رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سندھی کی معیت میں مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور کئی سال گجرات میں مقیم رہے۔ وہاں درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا اور بہت سے علما ان کے حلقہ درس سے فایز ہو کر نکلے۔ گجرات سے پھر عازم مکہ مکرمہ ہوئے۔

شیخ عبداللہ، جہان زیور علم و فضل سے آراستہ تھے، وہاں درس و تقویٰ اور زہد و عبادت میں بھی عظیم المثال تھے اور اسی بنا پر لوگوں میں عبداللہ منقنی کے نام سے معروف تھے۔

تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ جمع المناسک و نفع المناسک ان کی تصنیفات میں سے ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۷۵۰ھ میں تصنیف کی۔ اس کے علاوہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف پر حواشی تحریر کیے۔ دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے اس نامور مفسر اور شہرہ آفاق محدث نے ماہ ذی الحج ۷۸۴ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

النور السافر میں ان کے بارے میں جو الفاظ مرقوم ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:
شیخ علامہ بہت سے فنون کے ماہر تھے۔ عبداللہ بن سعد الدین مدنی سندھی نے ۷۸۴ھ کے ماہ ذی الحج میں مکہ شریف میں وفات پائی۔ یہ ایک زبردست عالم اور خیر

۱۲۷ تحفۃ الکرام ص ۲۲۳۔ تاریخ معصومی ص ۲۸۱۔ ہدیۃ العارفین ج ۱ ص ۴۲۲،

۲۷۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۸، ۱۰۲۔ نذہتہ الخواطر، ج ۱ ص ۲۰۵، ۲۰۶۔

متبحر امام تھے۔ ان کی کتنی ہی تصانیف ہیں، جن میں سے ایک سہروردی کی عوارف
المعارف پر حاشیہ ہے ۱۲۶

۱۶۱۔ شیخ عبداللہ انصاری سلطان پوری

شیخ عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری، عالم کبیر اور شیخ عصر تھے۔
مخدوم الملک کے خطاب سے مشہور تھے۔ اصلاً علاقہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ کے رہنے
والے تھے۔ ان کے دادا، ٹھٹھہ سے مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر چلے گئے تھے۔ شیخ
عبداللہ اسی علاقے کے ایک مقام سلطان پور میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں
حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں سرہند میں علامہ عبداللہ سرہندی (متوفی ۱۰۰۰ھ)
کی مسند تدریس کھچی ہوئی تھی۔ یہ وہاں پہنچے اور ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔
سرہند سے دہلی گئے، وہاں شیخ ابراہیم بن معین الدین حسینی ابرجی کے حلقہ درس
میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے
کے بعد واپس اپنے شہر آگئے اور تدریس و تصنیف اور تذکرہ و معظمت میں مشغول
ہو گئے۔ وسعت علم اور عمل و تقویٰ میں خاص شہرت کے حامل تھے اور اس سلسلے
میں ان کو اللہ نے بڑی قبولیت اور عظمت سے نوازا تھا۔ ۱۲۷

مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں ان سے بے حد عقیدت رکھتا تھا، اس
نے ان کو شیخ الاسلام کا منصب عطا کیا اور جب تک وہ حکمران رہا، یہ اس منصب
پر فائز رہے۔

شیخ عبداللہ سلطان پوری نے ہندوستان کے چار عظیم الشان بادشاہوں
— ہمایوں، شہر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور جلال الدین اکبر — کا زمانہ پایا، یہ

۱۲۲۲ النور السافر، ص ۳۵۷۔

۱۲۲۳ منتخب اللباب ج ۱، ص ۲۳۰، ۲۲۱۔

چاروں بادشاہ ان سے نہایت عزت و احترام سے پیش آتے تھے اور ان کے امرا و وزرا بھی ان کی بدرجہ غایت تکریم کرتے تھے۔ ہمایوں نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں بھی ان کو پورے ملک ہند کا شیخ الاسلام مقرر کیا اور پھر جب وہ ایران سے واپس آکر دوبارہ سر یہ آرائے سلطنت ہند ہوا تو بھی اس نے ان کو اسی منصبِ جلیلہ پر فائز کیا۔ شہر شاہ سوری نے ان کو صدر الاسلام کے لقب سے ملقب کیا۔ اس کا بیٹا سلیم شاہ سوری تو ان کا اس درجہ معتقد تھا کہ ان کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا اور پیش بہا نذر لے پیش کرتا تھا۔

ہمایوں کے بعد ہندوستان کے اورنگِ حکومت پر جلال الدین اکبر متمکن ہوا، تو اس نے ان کو مخدوم الملک کے خطاب سے نوازا اور ایک لاکھ دام ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ کئی سال تک اکبر ان سے انتہائی اکرام کے ساتھ پیش آتا رہا، لیکن جب اس کے دربار میں ملا مبارک کا عمل دخل ہوا اور اس نے اس کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ تو خود مجتہد فی المنہب ہے، اس کے لیے مذہبی معاملات میں حدود و قضاة کی بات ماننا اور ان کی رائے پر عمل کرنا ضروری نہیں، تو اس نے ان کو دیارِ ہند سے نکل جانے اور حرمین شریفین چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ۹۸۷ھ میں انھوں نے اس ملک سے رخصت سفر باندھا اور مکہ مکرمہ جا پہنچے۔ وہاں کے اکابر علماء کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

اس ننانے میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی وہاں مقیم تھے، وہ ان سے انتہائی اجلل و تعظیم سے پیش آئے اور ان کی تشریف آوری کو علم اور اہل علم کے لیے نیک شگون قرار دیا۔ وہ خاصا عرصہ وہاں اقامت گزین رہے اور اس اثنا میں طلباء علم نے ان سے بہت استفادہ کیا۔ بعد ازاں واپس ہندوستان آگئے اور حرمین میں مقیم ہو گئے، جہاں انھیں زہر دے کر مار دیا گیا۔

وہ علامہ زمان اور بیگانہ دوراں تھے۔ حدیث، فقہ، اصول اور باقی علوم عربیہ اور تاریخ میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا، تمام مروجہ نقلی اور عقلی علوم میں

ماہر کامل تھے۔ اہل بدعت اور اہل ہوا کے شدید مخالف تھے اور ان سے متعلق بر ملا اظہارِ عداوت کرتے تھے۔ دین کی ترویج اور شریعت کی تنفیذ میں ہر آن کو شاں رہتے اور اس سلسلے میں کسی سے کوئی رعایت نہ برتتے۔

ان کا تصنیفی ذوق بھی بلند تھا اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں کشف الغمۃ، منہاج الدین، عصمتہ الانبیاء، شرح شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم شرح عقیدہ حنفیہ اور بہت سے رسائل شامل ہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شیخ عبداللہ سلطان پوری کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، شیخ موصوف منعصب سُنی تھے، ماورِ شیعہ کے شدید مخالف تھے۔ اس ضمن میں ملا عبدالقادر اور شیخ عبداللہ کے درمیان مکالمہ بھی ہوا، جس کی تفصیل ملا موصوف نے بیان کی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ عبداللہ کو اس پر اصرار تھا کہ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر امیر جمال الدین محدث کا تصنیف کردہ نہیں ہے۔ جس سال گجرات فتح ہوا تھا اور وہ شیخ عبداللہ سلطان پوری) شاہی دیوان خانے کے وکیل تھے، اور یہ زمانہ ان کے جہاد و جلال کا زمانہ تھا، میں (ملا عبدالقادر بدایونی) پنجاب کے سفر سے واپس آیا اور شیخ ابو الفضل (جو ابھی شاہی ملازم نہیں ہوا تھا) اور حاجی سلطان غفائی سری کے ساتھ مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری سے ملاقات کے لیے گیا۔ ہم نے دیکھا، وہ روضۃ الاحباب کے تیسرے دفتر کو کھولے بیٹھے تھے۔ اور کہہ رہے تھے ”دیکھو ایرانی علمائے دین میں کتنی خرابی پیدا کر دی ہے“ پھر انھوں نے وہ شعر دکھایا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف میں کہا گیا تھا:

ہمیں بس بود حق نمائی او کہ کردند شک در خدائی او
کہنے لگے، ”اس نے تو رفض سے آگے بڑھ کر حلولِ خداوندی تک معاملہ پہنچا دیا ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اس جلد کو شیعوں کے سامنے جلاطیوں“
اس سے آگے ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:

میں اس وقت نہایت گم نام اور غیر معروف تھا، اور یہ ان سے پہلی ملاقات تھی، پھر بھی جرات کر کے میں نے کہا۔ یہ شعر تو ان اشعار کا ترجمہ ہے جو امام شافعی سے منسوب ہیں:

لوان المرتضیٰ ابدی محلہ لصاد الناس طر اسجد الہ
کفی فی فضل مولانا علی وقوع الشک فیہ انہ اللہ
یہ اشعار سن کر عبداللہ سلطان پوری نے مجھے کھو کر دیکھا اور کہا۔ ”یہ کس

کتاب میں ہیں؟“

میں نے کہا، ”مترجم دیوان امیر میں“! کہا، ”اس دیوان کا شایع قاضی میر حسین مینبندی ہے، اور وہ بھی رفض سے متہم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ”الک سجش“ ہے۔“ ابوالفضل اور حاجی سلطان اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر برابر مجھے خاموش ہو جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

پھر میں نے کہا۔ ”بعض معتبر لوگوں سے میں نے سنا ہے کہ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر میر جمال الدین محدث کا نہیں ہے ان کے بیٹے میرک شاہ یا کسی اور کا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اسلوب تحریر پہلے دو دفتروں کے اسلوب تحریر سے ہم آہنگ نہیں ہے اس کا اسلوب شاعرانہ ہے اور پہلے دو ذروں کا محدثانہ۔“

مخدوم الملک نے جواب دیا۔ ”اے بابا۔! میں نے تو دوسرے دفتر میں بھی ایسی باتیں دیکھی ہیں جو صریحاً بدعت اور فاسد عقیدہ پر دال ہیں۔ میں نے ان مقامات پر حواشی لکھ رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت طلحہؓ نے جب سب سے پہلے حضرت امیر المؤمنین (علیؓ) سے بیعت کی تو آپ نے فرمایا: ید سئلاد و بیعة سئلاد (یعنی ہاتھ بھی شل اور بیعت بھی شل!) غور کرو! جو ہاتھ جنگِ احد کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ بنا ہوا تھا اور جس پر گیارہ زخم آئے تھے، اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑا شگون کہیں، جو شرعاً ممنوع ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اسے جھوٹ سمجھتا ہوں۔“

فہمائے ہند جلد سوم

میں نے کہا، ”تفاوت اور شگون میں بڑا فرق ہے۔“ اس وقت ابو الفضل نے چپکے سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر گرگڑا اور آگے بات کرنے سے روک دیا۔

مخدوم الملک نے میرے بارے میں پوچھا، ”ان کی تعریف کیا ہے۔“ ”ساقتھیوں نے میرے متعلق ان کو کچھ باتیں بتائیں، اور یہ ملاقات بھی بہت ختم ہو گئی۔“ اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

جب ہم وہاں سے نکلے تو دوستوں نے کہا۔ خیریت گزری کہ انھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اگر پھنس جاتے تو کون چھڑانے والا تھا۔ مزید لکھتے ہیں:

اول اول جب مخدوم الملک نے شیخ ابو الفضل کو دیکھا تو اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ ”اس شخص سے دین میں بہت خلل واقع ہوگا۔“

پوٹیفیش بدیدم نمودم اہل دیں را

کہ نشو و بلائے جانہا بہ شہما سپردم دیں را

مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری نے ۹۹۰ھ میں مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد گجرات میں وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ کہا گیا:

رفت مخدوم ملک و با خود برد رحمتہ اللہ نشان پیشانی

جستہ اول چو سال تاریخش گفت بشمار صدہ نہ ثانی

انھیں گجرات میں جلال الدین اکبر کے حکم سے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ یہ

۹۹۰ھ یا ۹۹۱ھ کا واقعہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں اکبر کی طرف سے ہر وقت

جان کا خطرہ رہتا تھا، وہ اسی خطرے اور خوف سے جان بحق ہو گئے۔ ان کی موت تو گجرات میں واقع ہوئی مگر پوشیدہ طور پر ان کی میت کو جالندھر لاکر دفن کیا گیا۔

مخدوم الملک اس قدر مال دار تھے کہ ان کی موت کے بعد تین کروڑ روپے

ان کے خزانے سے برآمد ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق ان کی وفات اس طرح ہوئی کہ جب اکبر نے دین الہی

ایجاد کیا تو انھوں نے نہ صرف اس کو ماننے سے انکار کیا بلکہ اس کے مقابلے پر اتر آئے۔ اس پر اکبر نے ان کو اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ ایک مسجد میں معتکف ہو گئے۔ اکبر نے کہا کہ یہ مسجد بھی میرے ملک کی زمین میں واقع ہے، آپ اس سے بھی نکل جائیں۔ چنانچہ وہ حرمین شریفین چلے گئے۔ حج سے واپس آئے تو حجرات میں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں اکبر کے حکم سے کھانے میں زہر ملا کہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔^{۱۲۷}

مولوی فقیر محمد جہلمی نے ان کا ذکر کیا دسویں صدی ہجری کے فقہاء و علما میں کیا ہے اور ان کی تاریخ وفات ۱۰۰۶ھ تحریر کی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ دسویں صدی ہجری کے عالم و فقیہ ہیں اور ان کا سن وفات ۹۹۰ھ یا ۹۹۱ھ ہجری ہے۔

مخدوم الملک کی زندگی کا ایک اور پہلو

صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے مآثر الامرا میں مخدوم الملک عبداللہ انصاری کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں، جن سے ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ ذیل میں مآثر الامرا کی پوری عبارت کا اردو ترجمہ دیا جاتا ہے:

مخدوم الملک عبداللہ انصاری، شیخ شمس الدین سلطان پوری کا لڑکا ہے۔ اس کے بزرگوں نے طنتان سے سلطان پور آکر سکونت اختیار کی۔ ملا عبداللہ نے مولانا عبدالقادر سرہندی سے تحصیل علوم کی اور شرعی علوم میں ماہر کامل ہوئے۔ اس کی فضیلت کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ شرح ملا جامی پر حاشیہ لکھا اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں منہاج الدین تصنیف کی۔ سلاطین وقت اس کا بے حد

^{۱۲۷} منتخب التواریخ ص ۳۰۲، ۳۰۳۔ مآثر الامرا، ج ۳، ص ۳۱۵ تا ۳۱۹۔ تذکرہ

علمائے ہند ص ۱۰۳۔ نزهة الخواطر، ج ۴ ص ۲۰۶ تا ۲۰۸۔ رود کوثر، ص ۹۲ تا ۱۰۷۔

حدائق الحنفیہ ص ۳۹۷۔

احترام کرتے تھے۔ ہمایوں بادشاہ اس کی طرف بہت ہی عنانِ توجہ مبذول رکھتا تھا۔

جب شیرشاہ سوری بادشاہ ہوا تو اس نے اس کو صدر الاسلام کا خطاب دیا۔ کتنے ہیں، ایک دن اپنے زورِ حکومت میں سلیم شاہ سوری نے ملا عبداللہ کو اپنی طرف آئے دیکھ کر کہا تھا، بابر بادشاہ کے پانچ بیٹے تھے، چار چلے گئے، ایک باقی رہ گیا ہے۔ سرمست خاں نے کہا، ایسے فتنہ پرداز کو زندہ کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ جواب دیا، اس سے بہتر آدمی نہیں ملتا۔ جب ملا قریب آیا تو سلیم شاہ نے اسے تخت پر بٹھایا۔ مرورید کی تسلیج اس کو پیش کی، جس کی قیمت میں ہزار روپے تھی۔

ملا عبداللہ نہایت متعصب شخص تھا، اس تعصب کو وہ دین داری سے تعبیر کرتا تھا اور اس کے پردے میں مخالفوں کے خلاف اپنے غیظ و غضب کے اظہار کا اس کو خوب موقع ملتا تھا۔ شیخ علانی کا قتل بھی اس کے اسی تعصب اور مخالفت کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔

شیخ علانی، شیخ حسن کے لائق فرزند تھے، جن کا شمار بنگال کے کبار مشائخ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے علوم ظاہری و باطنی اپنے والد بزرگ وار سے حاصل کیے تھے۔ بیت اللہ سے واپس آنے کے بعد بیانہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کا اصل مشغلہ تھا۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ شیخ عبداللہ نیازی نے بھی بیانہ میں آکر اقامت اخلیا کر لی تھی۔ شیخ عبداللہ نیازی، شیخ سلیم چشتی کے خلفائے میں سے تھے اور سفر حجاز سے واپس آنے کے بعد میر سید محمد جون پوری سے فائز ہو گئے تھے، جو اپنے آپ کو مہدی کہتے تھے۔ شیخ علانی کو عبداللہ کا اسلوب حیات پسند آیا۔ وہ متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس ضمن میں یہاں تک آگے بڑھ گئے تھے کہ شب کو صبح کے لیے کوئی چیز گھر میں باقی نہ رہنے دیتے، سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے پانی کے مٹکے بھی خالی کر دیتے کہ کل اللہ تعالیٰ کوئی اور ذریعہ پیدا فرمادے گا۔

ملا عبداللہ سلطان پوری نے شیخ علانی پر بدعت و خروج کا الزام عائد کیا، اور

سلیم شاہ سوری کو جو اس وقت ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ اس بات پر آمادہ کیا، کہ شیخ علائی کو بیانہ سے طلب کیا جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے خیالات کے بارے میں علما سے مذاکرہ کرے۔ چنانچہ مباحثہ و مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا اور اس میں شیخ علائی غالب آئے اور حاضرین مجالس ان سے بہت متاثر ہوئے۔ خود سلطان سلیم شاہ شیخ علائی کی گفتگو اور انداز کلام سے اثر پذیر ہوا، اور آہستہ سے شیخ کے کان میں کہا، آپ مہدویت کا انکار کر دیں، میں آپ کو اپنی حکومت کا محتسب مقرر کر لوں گا۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے نکل جائیں علمائے آپ کے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے، چنانچہ شیخ و کن کے علاقہ میں چلے گئے۔

کچھ عرصہ بعد سلطان سلیم شاہ نیازوں کی شورش ختم کرنے کی غرض سے پنجاب کی طرف متوجہ ہوا۔ اب ملا عبداللہ کو موقع ملا، اس نے سلطان سے کہا شیخ عبداللہ نیازی، نیازی قبائل کا پیر ہے اور یہ تمام لوگ اس کے معتقد ہیں۔ بادشاہ نے ۹۵۵ھ میں شیخ عبداللہ نیازی کو دربار میں بلایا اور ان پر اتنے کوڑے، ڈنڈے اور لاتیں پڑیں کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔

منقول ہے کہ جب تک انھیں ہوش رہا، وہ رہنا اغفر لنا ذنوبنا پڑھتے رہے۔ کچھ افاقہ ہوا تو سیاحت پر روانہ ہو گئے اور مہدویت سے توبہ کر لی۔ ۹۹۳ھ میں جلال الدین اکبر سے ملے، جب کہ وہ بنارس اور اٹک کے نواح میں تھا، اس نے فقوڑی سی زمین مدد معاش کے لیے دی۔ شیخ عبداللہ نیازی نے نوے سال کی عمر میں ۱۰۰۰ھ کو وفات پائی۔

سلیم شاہ سوری نیازوں کی مہم سے واپس آیا تو عبداللہ انصاری نے پھر شیخ علائی کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دیے اور اس نے ان کو دربار میں طلب کیا۔ سلیم شاہ اب بھی ذاتی طور پر انھیں کوئی سزا دینے کے حق میں نہ تھا، اس نے ان سے پہلی ملاقات والی بات دہرائی اور مہدویت سے علیحدگی اختیار کرنے کی تلقین کی اور اپنی سلطنت کا محتسب مقرر ہونے کو کہا، مگر شیخ

نے کوئی توجہ نہ فرمائی۔ ادھر ملا عبداللہ نے ان کو سخت سزا دینے پر اصرار کیا۔ سلیم شاہ نے ملا سے کہا، تم جانو اور شیخ علانی جانے، ہمیں اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ ملا نے حکم دیا، شیخ کے کوڑے لگاتے جائیں۔ شیخ علانی پہلے ہی سے بیمار اور جسمانی طور پر کمزور تھے۔ تیسرے کوڑے میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اسی پر بس نہیں کیا۔ ان کی لاش کو ہاتھی کے پیر سے باندھ کر گھسیٹا گیا۔ کہتے ہیں اس روز اتنی سخت آندھی چلی کہ لوگوں کو قیامت کی آمد کا گمان ہونے لگا۔ شیخ علانی کی لاش پر اس قدر پھول پڑے کہ معلوم ہوتا تھا ان سے قبر تیار ہو گئی ہے۔ اس واقعہ کے بعد سلیم شاہ کی حکومت بھی دو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور ختم ہو گئی۔

جب ہمایوں نے ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا تو اس نے ملا عبداللہ کو شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔ ہمایوں کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین اکبر سربراہ آرائے سلطنت ہند ہوا تو ملا عبداللہ کو مخدوم الملک کا خطاب ملا۔ بیرام خاں نے ایک لاکھ روپے کی آمدنی کا پیرگنہ تانک والا اس کو دے کر اس کا مرتبہ تمام امرا و اکابر سے بڑھا دیا اور اس کو سلطنتِ ہند کا بڑا رکن بنا دیا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بعض واقعات کی بنا پر اکبر کا مزاج، علما کے بائے میں بدل گیا تو جلوسِ اکبری کے چوبیسویں سال ۹۸۷ھ میں مخدوم الملک ملا عبداللہ اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور کو ایک دوسرے کی رفاقت میں حجاز روانہ کر دیا۔ یہ اس لیے کہ یہ دونوں ایک مدت سے آپس میں متصادم و مخالف چلے آ رہے تھے۔ اور ان کا یہ باہمی تخالف و تضاد اس درجہ شدید تھا کہ ملک بدر ہو جانے کے باوجود بھی ان دونوں میں نہ راستے میں اتحاد و اتفاق ہو سکا اور نہ مقاماتِ مقدسہ میں پہنچ کر رفعِ کدورت کی کوئی صورت پیدا ہو سکی۔

مخدوم الملک ملا عبداللہ چونکہ افغانوں (یعنی شیرشاہی حکومت) کے زمانے سے لے کر اکبری دور تک تمام حکمرانوں کے نزدیک معزز و محترم رہا تھا، احتیاطاً،

تدبیراً حسن تدبیر، ملتے، تجربے اور مال داری سے متصف تھا، اور اس کی دانشمندی کی شہرت ہر جگہ پہنچ گئی تھی، اس لیے مفتی مکہ شیخ ابن حجر مکی اس کے استقبال کے لیے آئے اور اس کا بہت ہی احترام کیا، یہاں تک کہ غیر موسم حج میں بھی اس کے لیے کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولا گیا۔

اسی اثنا میں اکبر کے بھائی مرزا محمد حکیم نے اکبر کی مخالفت شروع کر دی۔ جب یہ بات مخدوم الملک ملا عبداللہ کے علم میں آئی تو اگرچہ ہندوستان میں کوئی اختلال واضمحلال واقع نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی غیر معمولی حادثہ رونما ہوا تھا، مگر مخدوم الملک نے یقین کر لیا کہ ملک میں تغیر کی لہر آئے گی اور وہ طبع امارت اور حجت جاہ کی بنا پر ہندوستان واپس آ گیا اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی محبت میں احمد آباد (گجرات) پہنچا۔ اب دونوں نے اندر ہی اندر بادشاہ کی مخالفت شروع کر دی۔

جب یہ بات جلال الدین اکبر کے علم میں آئی کہ دونوں اپنے مخصوص مفادات کی بنا پر مختلف محفلوں اور مجالسوں میں اس کے متعلق ناشائستہ باتیں کرتے ہیں تو اس نے معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے خفیہ طور پر کچھ لوگوں کو ان پر متعین کر دیا۔ خفیہ طور پر اس لیے کہ حرم کی بیگمات بادشاہ سے ان کی سفارش اور صفائی پیش کرتی تھیں۔ ۹۹۱ھ میں بادشاہ کے خوف کی وجہ سے مخدوم الملک عبداللہ وقتاً پا گیا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ کے اشارے سے اس کو زہر دے دیا گیا تھا۔ لوگوں نے خفیہ طور پر اس کو جان بچھڑانے میں لاکر دفن کیا۔

مخدوم الملک کی وفات کے بعد قاضی علی، اس کے اموال کی تلاشی اور ضبطی پر مقرر ہوا۔ لاہور میں بہت سے خزینے اور دھننے برآمد ہوئے۔ ان میں سے سونے کی اینٹوں کے کئی صندوق اس کے آبائی قبرستان کے حصے سے نکلے۔ ان قبروں کو اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ ان میں مڑے دفن کیے گئے ہیں۔ تحقیق اموال کی وجہ سے اس کے لڑکے بھی مبتلائے مصیبت میں رہے۔ اس کے گھر سے تین کروڑ روپیہ برآمد ہوا۔^{۱۵}

شیخ عبداللہ نیازی پر بے پناہ تشدد

اس دور کی تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبداللہ سلطان پوری کا دل احترامِ انسانیت سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ وہ بے شک عالم دین تھا مگر نہایت حاسد، کینہ پرور اور علما کا دشمن تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو قتل کرایا، جن میں شیخ عبداللہ نیازی بھی شامل ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ سلیم شاہ بہو اور نیازی پٹھانوں کی باہمی مخالفت کے زمانے میں سلیم شاہ ان سے جنگ کے لیے آگرہ سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تو مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری بھی اس کے ساتھ تھا۔ جب لشکرِ شاہی بیانہ کے قریب پہنچا تو حالات کو اپنی تائید میں پا کر سلیم شاہ سے کہا۔ شیخ علانی کا فتنہ تو معمولی نوعیت کا تھا، جس سے نجات مل گئی۔ سب سے بڑا فتنہ تو شیخ عبداللہ نیازی کا ہے، جو شیخ علانی کا مرشد اور نیازیوں کا پیر ہے، اور ہمیشہ تین چار ہو مسلح افراد کو اپنے ساتھ رکھتا ہے، جن سے بیانہ کے پہاڑی علاقے میں فتنہ و فساد کرتا رہتا ہے۔ سلیم شاہ جو پہلے سے نیازیوں کے خون کا پیاسا بہو رہا تھا۔ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اسی وقت حاکم بیانہ میاں بہوہ کے نام فرمان بھیجا کہ شیخ نیازی کو فوراً حاضر کیا جائے۔ میاں بہوہ، شیخ عبداللہ نیازی کا بہت عقیدت مند تھا، اس نے خفیہ طور پر شیخ سے درخواست کی کہ آپ کی زندگی خطرے میں ہے اور مصالحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ چند روز کے لیے یہاں سے کسی طرف چلے جائیں، میں بادشاہ کو آپ کے نہ ملنے کے بارے میں کوئی معقول وجہ لکھ کر بھیج دوں گا۔ اتنے میں بادشاہ کے دل سے آپ کا خیال نکل جائے گا۔ لیکن شیخ عبداللہ نیازی نے حاکم بیانہ کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا۔ بادشاہ کے دل سے میرے متعلق کوئی بات نہیں نکلے گی۔ مخدوم الملک میرے درپے آزاد ہے اور وہ ہمیشہ میری تاک میں رہتا ہے۔ میں اگر کسی دور دراز مقام میں چلا بھی جاؤں گا، بادشاہ پھر مجھے وہاں سے طلب کرے گا اور اس صورت میں مجھے طویل سفر کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ابھی اس سے مل لوں، جب کہ وہ سفر دس کوس کے فاصلے پر مقیم ہے۔ خدا کا جو فیصلہ ہے، وہ بہر حال پورا ہو کر رہے گا۔

غرض حاکم بیانہ میاں بہوہ کے روکنے کے باوجود شیخ عبداللہ نیازی، بیانہ سے چل کر راتوں رات شاہی لشکر میں پہنچ گئے اور صبح کے وقت جب کہ سلیم شاہ کوچ کی تیاری کر رہا تھا اور گھوڑے پر سوار ہونے کو تھا، اس کے سامنے آئے اور کہا: ”اسلام علیکم، میاں بہوہ بھی موجود تھا۔ اس نے زبردستی سے ان کی گردن سلیم شاہ کے حضور یہ کہتے ہوئے جھکا دی۔“ اے شیخ! بادشاہوں کو اس طرح سلام کرتے ہیں۔“ شیخ نے بہوہ کو غصے کی نظروں سے دیکھا اور کہا: ”جو سلام سنت ہے، اور جو رسول اللہ اپنے صحابہ کو اور صحابہ، رسول اللہ کو کرتے تھے، وہ وہی ہے، جو میں نے کیا، اور اس کا طریقہ بھی وہی ہے، اس کے سوا میں اور کسی سلام کو نہیں جانتا۔“

شیخ نیازی کو دیکھ کر اور ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

”علاقے کا پیر یہی ہے۔“ ملا عبداللہ سلطان پوری نے، جو گھات میں لگا ہوا تھا، اور اسی وقت کا منتظر تھا، جھٹ سے کہا: ”ہاں یہی ہے۔“

بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے ان کو مارنا پٹینا شروع کر دیا۔ شیخ کو جب تک ہوش رہا وہ آیت پڑھتے رہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَالصَّلَاةَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (ال عمران: آیت ۱۴۷)

(اے ہمارے پروردگار، ہمارے گناہ اور زیادتیاں جو ہم اپنے کاموں میں کرتے رہے ہیں، معاف فرما۔ اور ہم کو ثبات قدم رکھ، اور کافروں پر فتح عنایت فرما)

سلیم شاہ نے پوچھا: ”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“

ملا عبداللہ نے جواب دیا: ”مجھ کو اور آپ کو کافر کہہ رہا ہے۔“

سلیم شاہ کا پارا اور چڑھ گیا اور ان کو اور زیادہ اذیت پہنچائی۔ غرض بادشاہ ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ وہاں گھوڑے پر سوار کھڑا رہا، اور اس مظلوم کو جرم بے گناہی میں سزا دیتا رہا۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ ان کا دم نکل گیا ہے تو آگے بڑھ گیا۔

مگر شیخ میں ابھی زندگی کے آثار باقی تھے۔ سلیم کے کوچ کے فوراً بعد لوگوں نے ان کو چمڑے میں لپیٹ کر برابر ایک دن اور ایک رات آگ کی گرمی میں رکھا، تب ان کو کچھ ہوش آیا۔ یہ حادثہ ۹۵۵ھ میں پیش آیا تھا۔ شیخ عبداللہ نیازی نے آخری عمر میں عقیدہ مہدویت سے توبہ کر لی تھی۔ انھوں نے نوے سال کی عمر پا کر ۱۰۰۰ھ کو جلال اللہ اکبر کے عہد میں وفات پائی تھی۔

عمل و کردار کا ایک اور نمونہ

تذکرہ نویسوں نے مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کی زندگی کے مختلف واقعات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں اور اس کے عمل و کردار کے تمام گوشوں کی وضاحت کی ہے۔ منقول ہے کہ اس نے فتویٰ دیا تھا کہ اس دور میں حج کی فرضیت سافظ ہو چکی ہے، بلکہ حج پر جانا معصیت کی ذیل میں آتا ہے۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے اگر خشکی کے راستے جائیں تو یہ گجرات اور عراق کا راستہ ہے، جو شیعوں اور قزلباشوں کی ٹورط مار کی وجہ سے پرخطر ہے اور اگر سمندر کے راستے جائیں تو فرنگیوں سے پروا نہ راہ داری لینے کی ذلت برداشت کرنا پڑتی ہے، جس پر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویریں چسپاں ہوتی ہیں اور یہ بت پرستی کی ایک شکل ہے۔ اس لیے شرعی اعتبار سے یہ دونوں راستے حج کے لیے بند ہو گئے ہیں۔

یہ بھی منقول ہے کہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے بھی وہ یہ حیلہ کرتا تھا کہ سال کے اختتام پر بسا ما مال بیوی کے نام منتقل کر دیتا اور دوسرے سال کے اختتام پر یہی مال اپنے نام پر واپس لے لیتا۔

بدایونی لکھتے ہیں: غرض اس کی کجوسی و بخلت اور رذالت و خباثت کے

سے قصے مشہور ہیں۔ اس نے علما و مشائخ اور بالخصوص پنجاب کے مستحق لوگوں پر بہت زیادتیاں کی تھیں۔ یہ بڑا مال دار شخص تھا، مگر جب بادشاہ جلال الدین اکبر نے اس سے سوال کیا ”تم پر حج فرض ہے؟“ تو اس نے جواب دیا ”نہیں؟“ بلاشبہ اس نے لوگوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ بہت سے علما و امرا کو قتل کر دیا، کسی کو ہمدردیت کے الزام میں موت کے گھاٹ اتارا، کسی کو رفض و شیعیت کی طرف منسوب کر کے ختم کر ڈالا، اور کسی کو بادشاہ کا باغی اور مخالف ظاہر کر کے ہمیشہ کی نیند شلا دیا۔ اس کی زندگی کے واقعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رحم دلی اور انسانی ہمدردی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

دیگر تذکرہ نگاروں کے علاوہ بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کے اس قسم کے کردار کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔

شیخ داؤد جمہنی وال کو بھی جو ضلع لاہور میں قیام پذیر تھے، مخدوم الملک ملا عبداللہ نے پریشان کیا۔ سلیم شاہ سوری سے ان کی شکایت کی کہ ان کے مرید ”یا داؤد“ ”یا داؤد“ کا ورد کرتے ہیں۔ سلیم شاہ نے ان کو اپنے دارالخلافہ گوالیار میں طلب کیا۔ یہ وہاں پہنچے، تو سلیم شاہ نے گوالیار سے باہر نکل کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ ان سے ملاقات کی، اور وہ ان کے زہد و اتقا سے بہت متاثر ہوا۔ مخدوم الملک بھی بادشاہ کے ساتھ تھے۔ بادشاہ اور مخدوم الملک کچھ دیر ان سے گفتگو کرتے رہے۔ بدایونی نے اس کا ذکر کیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا کہ وجہ مخالفت اور سبب طلبی کیا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے:

بعد از حرف و حکایت پر سیدہ اندکہ تقریب طلب فقر منقطع چہ بود؟
مخدوم الملک گفتند کہ مریدان شمارا شنیدم کہ در وقت ذکر گفتن یا داؤد یا داؤد می گویند۔
جواب دادہ اند مگر اشتباہ در استماع رفتہ باشد۔ و الا ایں جماعت ظاہر آید و دود،

فقہائے بہن جلد سوم

یا درود می گفتہ باشند۔

یعنی گفت و شنید کے بعد شیخ نے دریافت کیا کہ ہم فقرا کو یہاں طلب کرنے کا آخر کیا مقصد ہے؟ مخدوم الملک نے کہا، ہم نے سنا ہے، درود کرتے وقت آپ کے رب یا داؤد یا داؤد کہتے ہیں۔ شیخ نے جواب دیا، سننے والے کو اشتباہ ہوا ہے۔ میرے رب تو یا درود یا درود کہتے ہیں۔

بعد ازاں سلیم شاہ نے شیخ کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ سلیم شاہ کے علاوہ مخدوم الملک نے بھی ان کی تکریم کی اور ان کے مواعظ و نصائح سے متاثر ہوا ان کی باتیں سن کر مخدوم الملک نے بادشاہ سے کہا:

ازیں روئے دروغ نیاید۔

جو جی چاہے پوچھو، یہ دروغ گوئی سے کام نہیں لیں گے۔

علمائے دنیا اور فقہائے سوہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے ”تذکرہ“ میں مخدوم الملک عبدالرشید سلطان پوری اور صدر الصدوق شیخ عبدالنبی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ان کی زندگی کے ظالمانہ اور متعصبانہ گوشوں کی بڑی وضاحت کی ہے۔ وہ انھیں ”علمائے دنیا اور فقہائے سوہ“ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علمائے حق اور مشائخ کرام پر ان کے ظلم و زیادتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک ایسے گروہ کو بھلا علمائے دنیا اور فقہائے سوہ کہیں سے بیٹھنے دے سکتے تھے؟ چوروں اور قاتلوں کو ان لوگوں سے امن مل سکتا ہے، مگر مصلحین امت اور عشاق حق کے لیے امن و انصاف کہاں؟

سلیم شاہ اور نیازی افغانوں کے درمیان باہمی جھپٹش چلی آرہی تھی۔ مخدوم الملک نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اسے سیاسیات کا رنگ دیا۔ چنانچہ اس نے شیخ علانی

تذکرہ ص ۷۸

اور عبداللہ بن ابی زبیر کے خلاف سلیم شاہ کے کان بھرے اور انھیں بادشاہ اور اس کی حکومت کے مخالف قرار دیا۔ مولانا آزاد رقم طراز ہیں :

لیکن چون کہ پولٹیکل خطرہ کے بغیر سلیم شاہ برہانگینختہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے مخدوم الملک وغیرہ نے اسی سنت قدیمہ علمائے سومکو اختیار کیا، اور سلیم شاہ کہ ایک سادہ لوح افغان تھا، فوراً آمادۂ مخالفت ہو گیا۔

صدرالصدور ملا عبدالنبی اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری دونوں دنیا دار، حُصِتِ جاہ میں مبتلا اور ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے۔ مولانا آزاد کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

بدایونی لکھتے ہیں کہ اگرچہ ملا عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک دونوں ایک ہی تنور کے سوختے تھے اور صلحائے امت و اہل اللہ کی اذیت و مخالفت میں ہم رنگ و ہم آہنگ۔ لیکن چون کہ دنیا کے عشق نے دونوں میں رقابت کا رشتہ قائم کر دیا تھا، اس لیے خود بھی ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے، اور آپس کی ٹکریں برابر چلی گئیں، نتیجہ یہ نکلا کہ ان آپس کی ٹکروں ہی سے دونوں پاش پاش ہو گئے۔ کسی دوسرے ٹکڑے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ یخربون بیوتہم بایدا یہہم کا منظر نظروں میں پھر گیا۔

اس سے آگے مولانا فرماتے ہیں :

بدایونی لکھتے ہیں کہ مخدوم الملک نے جب ملا عبدالنبی کو برسرِ عروج و صدارت دیکھا تو ان کے رد میں ایک پوری کتاب لکھ ماری اور ثابت کیا کہ ان کے سچے نماز بھی درست نہیں، نابہ صدارت و شیخ الاسلامی چہ رسد؛ باپ نے عاق کر دیا ہے، اور مزید برآں یہ کہ بو اسیر خونی کا عارضہ ہے۔ خیر پہلی دلیل تو جیسی کچھ ہے ظاہر ہے۔ لیکن دوسری دلیل بڑی ہی پر لطف اور دلچسپ رہی۔ یارانِ ظرافت نشہ

اس کو لے اڑے اور خوب خوب ستم ظریفیاں کی گئیں۔ اسی طرح یہ دونوں ایک دوسرے پر جھلے کرتے رہتے، اور اسی میں دونوں کی چوریوں کھلتیں اور پردے فاش ہوتے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان دونوں کے اس قسم کے کردار کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے اور اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ پھر منتخب التواریخ وغیرہ کے حوالے سے ان کے انجام کی تفصیل بیان کی ہے۔ ایک جگہ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کے اہل علم پر مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لیکن سبحان اللہ! مکافات و مجازات عمل کا قانون الہی کس طرح اس دنیا ہی میں اپنا کام انجام دے رہا ہے اور آخرت کی منزل ابھی باقی ہے۔ لوگ انوا یعلمون۔ بالآخر ایک زمانہ آیا کہ یہی مخدوم الملک تھے اور یہی ہندوستان۔ مگر پیشوائی و شیخ الاسلامی ایک طرف رہی، عزت و آبرو سے اپنا بڑھاپا بھی بسر نہ کر سکے اور عمرِ ابری کے نئے نئے مفتیوں کے ہاتھوں وہ ذلتیں اور خواریاں نصیب ہوئیں کہ بقول ملائے بدایونی: یوم تبلی السائر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یا تو یہ حال کہ ان کے قلم شیخ الاسلامی کی ایک گردش اہل اللہ کی زندگیوں کا فیصلہ کر دیتی تھی، یا یہ یوم العذاب دیکھنا پڑا کہ حاجی ابراہیم سرہندی اور شیخ ابوالفضل جیسے نوخیز و احداث بھری مجلس میں ان کے فسق و تقویٰ کا فیصلہ کرنے لگے اور عمر بھر کی بد اعمالیوں کا ایک ایک کر کے حساب دینا پڑا۔

مخدوم الملک ملا عبداللہ اور صدر الصدور عبداللہ کے حالات تمام مورخین نے بیان کیے ہیں۔ شیخ محمد اکرام مرحوم نے بھی ان کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے اور ان کی زندگی کے متنازعہ فیہ پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔

۱۵۵۲ ایضاً ص ۹۸، ۹۹

۱۵۵۳ تذکرہ ص ۱۲۵

۱۵۵۵ ملاحظہ ہو رد و کوثر، ص ۹۳ تا ۱۰۰۔

نے بڑی تحقیق سے ان کے بارے میں اظہار رائے کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”بدایونی نے عمداً اکبری کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اکبر نے علما کا اقتدار ان کی کج بحثیوں اور حماقتوں کی وجہ سے کم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں خرابیوں کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے، اور اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی کی رائے نقل کی ہے: ”ہر فورے کہ دریں زمانہ در ترمیج ملت و دین ظاہر گشتہ، از شنوئی علمائے سوء است کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اند۔“ اور ان دو بزرگوں کو اس بیان کا مصدق قرار دیا ہے، اور اب یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ”علمائے سوء“ سے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی مراد ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملے میں مولانا محمد ناظم ندوی کی رائے بہین زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، جنھوں نے تعلیمات مجددیہ کے پیش لفظ میں ”علمائے سوء“ سے ”مبارک ناگوری کے دونوں ذہین و طباع بیٹے ابو الفضل اور فیضی اوتاج الدین دہلوی (کذا)“ مراد لیے ہیں۔ شاید ان کے علاوہ قاضی خان بدیشی کی طرف بھی اشارہ ہو، جنھوں نے بادشاہ کے لیے سجدہ تہمت جائزہ قرار دیا۔“

اس سے آگے وہ بدایونی کی رائے سے اختلاف کا تاثر دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

بدایونی کے علاوہ عمداً مغلیہ میں عمداً کے جتنے تذکرے لکھے گئے اور جن کا ماخذ منتخب التواریخ نہیں، ان میں بالعموم شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کی تعریف کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت مجدد کے شاگرد اور خلیفہ (اور ان کی مشہور سوانح عمری حضرات القدس کے مصنف) جنھیں سترہ سال مرشد کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا، سنوآت الاتقیاء (قلبی) میں شیخ عبدالنبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”شیخ عبدالنبی ابن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث بود... التسرع بر کمال داشت، و در اتباع سنت و رفع بدعت، رسوخ تمام نصیب وقت اوشده بود۔“

فقہائے ہند جلوسوم

و در امر معروف و نہی منکر بر سلاطین و امرا شدت کر دے ... صاحب تصانیف شریفہ است۔ در سنہ نہ صد و نو دو یک در عمدر عرش آشیانی شہادت یافت۔ ع صاحب فیض لغت سانش عقل

اس سے آگے رقم طراز ہیں :

اخبار الاصفیا (قلمی) میں جو ابو الفضل کے بھانجے عبدالصمد نے اسی زمانے میں لکھی، اسی طرح کا اظہار خیال کیا گیا ہے :

”شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس حسینی گنگوہی، عنوان صحیفہ دین دانش و فرسیت جریدہ علم و عمل بود۔ در عنوان بر نانی ... بحر میں شریفین شافت و حدیث در ان بی الفقاع نے شیخ ابن حجر ... استماع نمودہ بوطن گاہ خرامید۔ و (مکر) در دران مکان شریعت خرابینہ ... آرام گاہ فتح پوری۔ کتاب سنن الہدایہ ازو یادگار است۔“

اس سے آگے مرقوم ہے :

”دوسرے معاصرانہ تذکروں میں بھی (مثلاً مرآة العالم میں)۔ (سوائے ان کے جنہوں نے طبقات شاہ جہانی کی طرح برائیوں پر انحصار کیا ہے) شیخ عبدالنبی بلکہ مخدوم الملک کا ذکر بھی تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے، باوجود اس حضرت مجدد کے تناکر اور سوانح نگار خواجہ بدرالدین سرہندی کی شیخ عبدالنبی کی تعریف کے بعد یہ قیاس کہ حضرت مجدد نے انھیں ”علمائے سوء“ میں شمار کیا ہوگا، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔“

اس سے آگے اکرام صاحب مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کی صفائی

پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

”مخدوم الملک کی شخصی کوتاہیوں میں کلام نہیں، عبادت خانہ کے مباحثوں میں بھی علمائے بالعموم بڑی نا عاقبت اندیشی سے کام لیا جس سے اکبر کے دل میں طبقہ علما کے لیے کوئی احترام باقی نہ رہا۔ لیکن اکبر کی علما سے اختلاف کی وجہ فقط ان کی کوتاہیاں اور قابل اعتراض باتیں نہ تھیں۔ بلکہ ان کی خوبیاں اور ترویج شرع کی

کوششیں بھی وجہ مخالفت ہو گئیں۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ شیخ عبدالنبی پر کوئی جارتہ اور وزنی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ان کی ذاتی دیانت داری پر کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا۔ بے شک وہ احکامِ شریعت کی پابندی میں سخت تھے، لیکن مذہبی نقطہ نظر سے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، اور جس واقعہ (متھرا کے برہمن کو سزائے قتل) پر اکبر سے ان کا اختلاف ہوا، اس میں تو بے فی حد علما بلکہ اس سے زیادہ شیخ عبدالنبی کے ہم خیال ہوں گے۔

”مخدوم الملک میں شخصی کمزوریاں زیادہ تھیں، لیکن ان کی جس چیز کی شکایت کی جاتی ہے۔ یعنی شدت احتساب۔ وہ بھی شرعی نقطہ نظر سے خوبی ہے، برائی نہیں۔ انھوں نے (بقول بدایونی) شیخ ابو الفضل کی نسبت جو یہ کہا تھا کہ پتا نہیں، اس شخص سے دین میں کیا کیا فتنے برپا ہوں گے، اسے بھی واقعات نے درست ثابت کیا، اور شیخ مبارک کی راسخ الاعتقادی کی نسبت انھیں جو شبہ تھے، وہ بھی بجا نہ تھے۔ شیعوں کے متعلق ان کا جو نقطہ نظر تھا، وہی حضرت مجدد الف ثانی کا تھا۔“

”واقعہ یہ ہے کہ مہدویت کی مقبولیت، شیعیت کی اشاعت، شطاری اور دوسرے آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج سے ملک میں جو روحانی انتشار رونما تھا، اس کے سبب اب میں مخدوم الملک کی محتسبانہ کوششیں، شیخ مبارک کی علمیت و آزاد خیالی، اور شیخ علانی کی نیک نفسی اور خلوص سے زیادہ مفید تھیں۔“

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حالات کے ضمن میں اخبار الاخبار میں، مولانا عبداللہ سلطان پوری کا ذکر کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ

۹۵۵ رود کوثر، ص ۹۶ تا ۹۸

۹۵۶ اخبار الاخبار، ص ۲۲۲

عبدالنبی عہدِ اکبری کی دو معروف علمی شخصیتیں ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں تذکروں میں مرقوم ہیں۔ شیخ عبدالنبی کے حالات اگرچہ اس کتاب میں دوڑی جگہ بھی لکھے گئے ہیں مگر چونکہ مخدوم الملک کے ضمن میں بھی ان کا تذکرہ لازماً آتا ہے، لہذا یہاں بھی ان کے متعلق بعض چیزوں کا زبانِ قلم پر آجانا گزیرے گا۔

تصنیفات

مخدوم الملک جہاں بہت بڑے عالم تھے، وہاں مصنف بھی تھے اور تصنیف کا لایف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ عقیقۃ الانبیاء، کشف الغمۃ عن بصائر الائمة اور منہاج الدین ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ ۱۵۵ھ

۱۶۲۔ مولانا عبداللہ لاہوری

مولانا عبداللہ بن عبدالخالق شریف حسینی لاہوری، شیخ وقت، عالم باعمل اور صالح بزرگ تھے۔ ان کا شمار تفسیر، حدیث اور فقہ کے جید علما میں ہوتا تھا۔ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ تھے۔ تمام عملاً لاہوریوں میں درس و افادہ میں مصروف رہے۔ خلقِ کثیر کو مستفید کیا اور بہت سے علما ان کے حلقہ درس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ۱۶۲۳ھ کو لاہوریوں میں وفات پائی۔ حدائق الحنفیہ میں انھیں سید عبداللہ بھاکری لکھا گیا ہے۔ لیکن مدفن لاہور ہے اور سن وفات بھی یہی ہے ۱۵۵ھ

۱۶۳۔ مولانا عبداللہ ملتانی

مولانا عبداللہ مفتی ملتانی، اپنے عصر کے شیخ اور عالم کبیر تھے اور ان کا شمار علوم

۱۵۵ھ ہدیۃ العارفین ج ۱ ص ۴۷۳۔ طبقات اکبری بھی دیکھیے ص ۳۹۰۔ نیز ملاحظہ ہو

ادکار ابرار ص ۴۹۵۔ درحالات مخدوم الملک

۱۵۹ھ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۳۔ نزهۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۰۸، ۲۰۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۳۷۳۔

عربیہ کے جلیل القدر علما میں ہوتا تھا۔ ملتان میں پیدا ہونے، وہیں پلے بڑھے اور اسی شہر کے مشہور اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ پھر ملتان سے بھکر منتقل ہو گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بھکر میں ان کا باقاعدہ سلسلہ تدریس جاری تھا، جس سے بے شمار تشنگانِ علوم نے استفادہ کیا۔ فقہ، اصول، لغت اور علم نحو میں مہارت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں علومِ حکمیہ میں بھی کامل عبور حاصل تھا۔ دسویں صدی ہجری کے بے بغیر پاک و ہند کے اس عظیم عالم دین نے ۹۷۰ھ کو وفات پائی۔

۱۶۴۔ مولانا عبداللہ بدایونی

مولانا عبداللہ ہندی سامانوی ثم بدایونی، شیخ صالح اور مشہور عالم دین تھے۔ مشرقی پنجاب کے ایک شہر سامانہ میں پیدا ہوئے۔ یہ دراصل ہندو تھے۔ ان کے والدین بھی ہندو دھرم کے حامل تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق والدین نے مسجد میں ایک مسلمان استاذ سے تعلیم دلانا شروع کی، جن سے انھوں نے حساب و ریاضی کی چند کتابیں پڑھیں۔ ایک روز سعدی شیرازی کی بوستان کا درس لے رہے تھے کہ یہ شعر پڑھا:

حال است سعدی کہ راہِ صفا تو اں رفت جز در پئے مصطفیٰ

استاذ سے عرض کیا۔ اس شعر کے معنی ہندی زبان میں سمجھائیے۔ استاذ نے کہا۔ تجھے اس سے کیا غرض ہے؟ کہا، جب تک آپ اس کا مطلب ذہن نشین نہیں کر لیں گے میں آگے سبق نہیں پڑھوں گا۔ استاذ نے معنی سمجھائے تو شاگرد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شخصیت اور نعمیات کے بارے میں استفسار کیا۔ جب آنحضرت کے مکالم و فضائل اور اخلاقِ حسنہ کی وضاحت کی گئی تو کلمہ طیبہ پڑھا اور جذبہ بے خودی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی اطلاع ماں باپ کو ہوئی تو دوڑے ہوئے

۳۳۶ ص ۳۳۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۲۱۔ تاریخ معصومی ص ۳۳۸

آئے اور ڈرا دھکا کر اسلام قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ نہ مانے تو ان کے حال پچھوڑ دیا۔

اب وہ ماں باپ سے قطع تعلق کر کے سامانہ سے نکل کھڑے ہوئے اور وہلی جا پہنچے۔ وہاں شیخ عبدالغفور بن نصیب الدین ملتانی دہلوی اور شیخ جلال الدین بدایونی وغیرہ علمائے کرام کا سلسلہ درس جاری تھا، اس میں جا شامل ہوئے اور علوم عربیہ کی تعلیم مکمل کی۔ دہلی میں ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد بدایون کی راہ لی۔ وہاں شیخ عبدالباقی بدایونی سے اخذ طریقت کیا۔ پھر خیر آباد گئے اور شیخ صفی الدین عبدالصمد سائینپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے بھی تصوف و طریقت کی تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ وہاں سے پھر بدایون آگئے اور اپنے آپ کو افادہ عام اور عبادت کے لیے وقف کر دیا اور اصل وطن سامانہ کو خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے بدایون ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔

علوم مروجہ و متداولہ مثلاً فقہ و اصول اور نحو میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ صحیح معنوں میں جامع انواع خیر اور ماہر علوم نقلیہ و عقلیہ تھے۔ اونچے درجے کے فقیہ اور معلم تھے۔ مذاہب فقہیہ پر گہری نظر تھی، شریف النفس، صحیح الدین اور قوی الفہم تھے۔ زہد و عابد، قانع و متقی اور قلیل الغذا تھے۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے، مگر سیرا حل کر بازار جاتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خود خرید کر لاتے، جہاں تک ہو سکتا، کسی سے اپنے ذاتی کام کے لیے نہ کہتے۔ اگرچہ شراخ کی طرف سے انہیں لوگوں کو اپنے حلقہ بیعت میں داخل کرنے کی اجازت حاصل تھی، لیکن اس سے گریز کرنے اور شراخ کی ان رسوم پر عمل کرنے سے محترز رہنے، جو ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

مولانا عبداللہ بدایونی کے حالات ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب النوائج میں تحریر کیے ہیں۔ ملا عبدالقادر کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا، وہ اپنے اس عظیم استاذ کی بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ مشکل اور دقیق مسائل نہایت آسانی سے حل کر دیتے تھے اور بعض ایسے مسائل علمیہ و نکات غامضہ جو ہر عالم کے ذہن کی

گرفت میں نہیں آسکتے، ان کے تمام گوشوں کو وہ بلا کسی کتاب کی طرف رجوع کیے نہایت وضاحت سے بیان کر دینے پر قدرت رکھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان سے علم کلام اور اصول فقہ کی بعض کتابیں پڑھیں۔

طبقات اکبری میں بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ مرقوم ہے:

شیخ عبداللہ بدایونی کہ دراصل ہندو بودہ است و در وقت خاندان گلستان چوں بنام پیغمبر سیدہ از اسناد پرسید کہ این چکس است ؟ و استاد پارہ بیان از مناقب آنحضرت نموده، و بہ شرف اسلام مشرف گشتہ۔ بعلم و فضل موصوف است و بورع و تقویٰ معروف۔

دسویں صدی ہجری کے برصغیر کے اس عالم و فقیہ کی تاریخ وفات کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ اتنا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے نوے سال کی عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

۱۶۵۔ شیخ عبدالعطی باکثیر مکی ہندی

شیخ عبدالعطی بن حسن بن عبداللہ باکثیر مکی ہندی احمد آبادی، شافعی مسلک تھے، شیخ و عالم اور اپنے عصر کے محدث کبیر تھے۔ عبدالقادر حضرمی نے انور السافرین ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ موصوف ماہ رجب ۹۰۵ھ کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ علما و فضلا کی ایک بڑی جماعت سے ملے اور عقول و مناقبات کے بہت سے علوم میں مہارت حاصل کی۔ مکہ مکرمہ سے ہندوستان آئے اور پھر یہیں اقامت اختیار کر لی۔ برجسنہ گوئی اور حاضر جوابی میں دسترس حاصل

۶۱۲ منتخب التواریخ ص ۲۹۷۔ طبقات اکبری ص ۳۹۴۔ خزینۃ

ج ۱ ص ۸۳، ۸۴۔ نزهت الخواطر، ج ۴ ص ۲۱۱، ۲۱۲۔ تاریخ اولیا۔ نئے دہلی ص ۸۲۔
تذکرۃ العارفين ص ۸۰ تا ۸۷۔

تھی، خوش مزاج تھے۔ ان کے بہت سے نوادار اور لطائف کلام مشہور ہیں۔ ننگلی کے آخری دم تک سلامت روی و عفت پر قائم رہے۔ ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ کہتے ہیں، اپنے ایک شیخ سے اپوری کتاب الشفاء ایک ہی نشست میں میں پڑھ ڈالی۔ یہ کتاب انھوں نے نماز صبح کے بعد شروع کی تھی اور آغازِ ظہر تک ختم کر لی۔

شیخ الاسلام ذکریا انصاری ان کے اساتذہ میں ہیں۔ ان سے انھوں نے صحیح بخاری اسی طرح سنی، جس طرح خود شیخ الاسلام نے اپنے والد سے قراءۃ سنی تھی۔ اپنے والد ہی سے صحیح بخاری، اصحاب الحدیث کی اصطلاح میں سماعاً قراءاً کرتے ہیں۔ شیخ ذکریا انصاری، صحیح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی سے روایت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبد المعطی اپنے دور میں صاحبِ سند عالی مشہور ہوئے اور اسی لحاظ سے یہ اپنے ہم پیشوں میں ممتاز ہیں۔ یعنی انھیں صرف ایک واسطے سے شراح صحیح حافظ ابن حجر عسقلانی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ اسی بنا پر طلباء حدیث کا ہجوم ان کے گرد جمع ہو گیا۔ اس اعتبار سے یہ اس شرف سے بہرہ ور ہیں جس سے بڑا اہل علم کے نقطہ نظر سے اسے کوئی شرف نہیں ہے۔

التور السافر کے مصنف شیخ عبدالقادر حضرمی نے بھی مختلف نشستوں میں ان سے صحیح بخاری کا سماع کیا، وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں: ”میں اس زمانے میں کم سن تھا، تاہم شیخ نے مجھ زبانی سند بہ مبارزہ عطا فرمایا۔“ وہ مزید لکھتے ہیں: ”میرے والد نے ان سے درخواست کی کہ منظوم شکل میں اس اجازت کا ذکر فرما دیا جائے تاکہ یہ اپنے قصائد کے ساتھ اسے شامل کر لیں، لیکن اللہ نے اس کا موقع نہ دیا۔“

شیخ عبد المعطی مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ”کتاب اسماء رجال البخاری“ ہے۔ اس کتاب میں شیوخ بخاری سے لے کر راوی حدیث صحابی تک تمام راویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو وہ مکمل نہ کر پائے۔ صرف ایک ہی ضخیم جلد معرزی تصنیف میں لاسکے۔ اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو دو جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ یہ اپنے موضوع میں بہت مفید

کتاب ہے۔

شیخ موصوف شاعر بھی تھے۔ شمع کے بارے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ مشوقۃ ہیفاء لدن قواہا
من البیض نذری بالمتقفۃ السمر
اذا اصبحت اصبحت تحد لسانہا
تفق درع الدلیل من طلعة البدر
قصیر سناہا قدھی آیتۃ الدجی
فصار نہاداً ابیضاً ساطع الفجر
تمد لساناً طائلاً غیر ساطق
ومن غیر اجفان مدامعہا تجری
وجلبا بہا یحکی لجنینا بیاضہ
واحشاؤہا ازدت علی لہب الحجر
اذا اجمدت تسمع بتصحیفہ ولا
ت حین مناص جاع فی محکم الذکر
فدونک لغزوا وضما قد شرحتہ
وبینتہ لکن بنوع من السننہ

ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

وہ (یعنی شمع) ڈوبلی اور پتلی جسامت والی ہے اور نرم ہے۔ اس کا مادہ سفید ہے، جو گندمی رنگ سے ملا ہوا ہے۔

وہ جب صبح کرتی ہے تو اس کی زبان تیز ہو جاتی ہے اور وہ جلوہ ماہتاب سے لباسِ شب کو چاک کر دیتی ہے۔

اس کا نیزہ بہت مختصر ہے جو تاریکی کا نشان مٹا دیتا ہے اور فجر کا جھپٹنا سفید دن بن جاتا ہے۔

وہ بغیر کچھ بولے، اپنی لمبی زبان کو بڑھاتی ہے، اور بغیر آنکھوں اور پوٹوں کے اس کے آنسو بہتے ہیں۔

اس کے گھونگھٹ کی سفیدی چاندی سے مشابہ ہے اور اس کے اندر کا حصہ انکارے کے شعلوں سے بازی لے گیا ہے۔

یہ تمام اوصاف جو شمع کے بیان کیے گئے ہیں، اگر جمع ہو جائیں تو تم اس کی تخریب کو سن لو گے۔

تم ایک واضح چینستان کو پلے باندھ لو، جس کو میں نے اگرچہ وضاحت کے ساتھ

بیان کر دیا ہے، مگر ایک پردہٴ خفا باقی رکھ لیا ہے۔

یہ اشعار بھی ان ہی کے ہیں :

قصہ یاندیم فذا الصبح قد انقلو
وہی بایة تودہ ظلہ الغسق
قرب صبو حک فالزمان مساعد
وادی بروقہ حکت لون الشفق
قام سقاہ کتوسہا فی خصرۃ
والمسک والکافور فیہا قد عقب
قمریدیر الشمس فی کأساتہ
وبتغیرۃ مثل المدامۃ بل ارق
قد یحاکی السامہری ومقلۃ
کالسیف واللاخطا سہام اذا رشق
قوس الحواجب موتر لقت لنا
ولذا اقلوب العاشقین غدق درق
علق الوشاح بخصرہ وتراہ قد
صحت خلاخلہ ودملجہ نطق
قوت نواظر عاشقیہ بحبہ
لکن من الصد المبرح فی ارق
قرأ المحب علی اصحیفۃ خدہ
قد کنتم ہمت بحسن وجمالہ
قضیت ایامی سدی وسبغلا
قد ان ان اثنی العفان عن اللہوی
قدم المشیب فکان ابلغ زاجر
وعود عندہ عود عبد قد ابق
ومضی الشباب کانه طیف طرق

ترجمہ : اے ندیم! اٹھ جا۔ دیکھ، صبح کی پو پھٹ گئی ہے اور اس کی روشنی نے شب کی تاریکیوں کو مٹا دیا ہے۔

اپنا بادۃٴ صبح گا ہی قریب لا، اس لیے کہ وقت اس کا تقاضا کرتا ہے، اور وہ جام شراب گردش میں لا، جس کا رنگ شفق سے مشابہت رکھتا ہے۔
ندیم کھڑا ہوا، اور اس نے شراب پی لائی، جو سبز رنگ کے جاموں میں تھی اور مشک کا فور کی خوشبو، اس میں تھک رہی تھی۔

یہ ایک چاند ہے جو اپنے پیالے میں سورج کو گردش دیتا ہے اور اس کے دائروں میں شراب بلکہ اس سے بھی رقیق تر شے موجود ہے۔

قد نیزے کی مانند اور آنکھوں کی طرح ہے، اور گھورتا ہے تو نگاہ تیر بن جاتی ہے۔
ابرو کی کمان ہمیں قتل کرنے کے لیے چمک چڑھائے ہوئے ہے، اور اس کے
لیے عاشقوں کے دل ڈھال بن گئے ہیں۔
تلوار مکر سے لگی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس کے گھنگرہ تو خاموش ہیں اور بازو بند
بول رہے ہیں۔

اس کے عاشقوں کی آنکھیں تو ٹھنڈی ہو جاتی ہیں لیکن تکلیف دہ رکاوٹ
کی وجہ سے نیند اڑ جاتی ہے۔

عاشق اس کے صحیفہ رخسار پر یہ تحریر پڑھتا ہے کہ خدا کی قسم، یحسین زین
مخلوق ہے۔

اس کے حسن و جمال سے کبھی اس وہم میں پڑ جاتا ہوں کہ یہ میری جوانی کی آرزوی
سانسیں ہیں۔

میں نے اپنی زندگی بے کار و بے مقصد گزار دی، میرے لیے نفسانی خواہشوں کی
بندگی اور عشق بازی کو چھوڑ دینا زیادہ صحیح ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ خواہش نفسانی سے بول باز آ جاؤں جیسے بھاگا ہوا غلام
واپس آ جاتا ہے۔

بڑھا پا آ گیا جو سب سے زیادہ مؤثر تشبیہ کرنے والا ہے، اور جوانی اس طرح
گذر گئی جیسے رات کا خیال خواب۔

شیخ عبدالمعطی مکی گجرات کے شہر احمد آباد میں اقامت گز بن ہو گئے تھے۔
وہیں ۲۷ ذی الحجہ ۹۸۹ھ میں وفات پائی اور اسی شہر میں دفن ہوئے۔

۱۳۳۳ النور السافر، ص ۳۶۴ تا ۳۷۰۔ شذرات الذهب، ج ۸، ص ۷۷، ۷۸، ۷۹۔

نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۱۴ تا ۲۱۶۔

ہدیۃ العارفين، ج ۱، ص ۶۲۲۔

۱۶۶۔ مفتی عبدالملک امر وہوی

مفتی عبدالملک بن محمود بن عطاء اللہ حسینی امر وہوی اپنے دور کے خطہ ہند کے شیخ اور فقیہ تھے اور اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ عالم اور ذی فہم تھے۔ امر وہہ کی مسندِ افتا پر ان کے والدِ مکرم مفتی محمود بن عطاء اللہ حسینی متمکن تھے، ان کی وفات کے بعد ۹۱۷ھ کو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں ینصب اسی عالم دین کے سپرد ہوا، جس پر وہ عمر بھر فائز رہے معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ۹۵۰ھ کو یا اس کے لگ بھگ وفات پائی، کیوں کہ ان کے بعد ان کے بیٹے مفتی عبدالغفور اسی سال امر وہہ کی مسندِ افتا پر متمکن ہوئے تھے کیلئے

۱۶۷۔ شیخ عبدالملک احمد آبادی

شیخ عبدالملک عباسی احمد آبادی علاقہ گجرات کے عالم دین اور محدث وقت تھے۔ اس عصر کے کبار و ممتاز علما میں سے تھے۔ زاد بوم اور خواب گاہ دونوں احمد آباد (گجرات) ہیں، اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین عباسی کے شاگرد تھے جنہوں نے حدیث کی سند حافظ ابن حجر عسقلانی کے تلمیذ اور مشہور امام صاحب الضوء اللامع شیخ شمس الدین بن محمد مصری سخاوی سے لی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم عربیہ میں ماہر تھے اور اس سلسلے میں استنادِ زمان کے مرتبہ کو پہنچ گئے تھے۔ قرآن مجید اور صحیح بخاری کے لفظاً اور معنایاً حافظ تھے۔ ہمیشہ اپنے حجرے اور مسجد میں وظائف و اوادارہ نمازیں مشغول رہتے لکھنؤ میں بہت کم جاتے تھے، کبر سنی کی بنا پر آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی مگر دل کی روشن بڑھو گئی تھی۔ تیز ذہن اور تیز فکر عالم تھے۔ تمام علوم کا درس زبانی دیتے۔ توکل اور تجربہ میں اس زمانے میں کوئی شخص ان کا ثیل نہ تھا۔ مولانا کمال محمد عباسی گجراتی

جو اجین مالوہ کے مفتی تھے، علم حدیث میں ان کے شاگرد تھے۔ شیخ عبدالملک عباسی نے ۹۷۰ھ کے بعد وفات پائی۔ ۱۱۷۷ھ

۱۶۸۔ شیخ عبدالنبی گنگوہی

شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی خفیہ المسلما تھے اور ارض ہند کے مشاہیر علماء و محدثین میں سے تھے۔ گنگوہ میں پیدا ہوئے اور علم و فضل کی آغوش میں پرورش پائی۔ علوم قرآن، فقہ اور باقی علوم کی تحصیل گنگوہ اور اس کے گرد و نواح کے فاضل اساتذہ سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حرمین شریفین کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہاں مختلف اساتذہ سے جن میں شیخ محمد بن حجر کی بھی شامل ہیں، حدیث کا درس لیا۔ اس سلسلے میں ان کا کئی بار ارض حجاز اور ہندوستان میں آنا جانا ہوا۔ وہ طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے اور بہت سے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ علم حدیث میں کامل رسوخ کے بعد ہندوستان کو مراجعت کی۔ ان کے خاندان میں آباد اجداد سے سماع و تواجد اور انعقادِ اعاس کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ نیز ان کے اسلاف مساک و حدیث الوجود سے بھی تعلق و انسلاک رکھتے تھے اور ان تمام رسوم و عوائد پر عامل تھے جو اکثر مشائخ صوفیہ میں مروج ہیں۔ لیکن شیخ عبدالنبی نے ان سب امور کی شدت سے مخالفت کی اور خالص سنت محمدیہ اور طریقہ سلفیہ کی نصرت و اعانت کا علم بلند کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنی تائید میں کتاب و سنت سے دلائل و براہین پیش کیں اور ایسے مقدمات سے استدلال کیا جو فقط فرہین خداوندی اور احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہیں۔ اس باب میں انھوں نے اپنے والد گرامی شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس اور چچاؤں کی مخالفت کی اور ان کے طریق عمل کو بدعت عقیدہ ٹھہرایا۔ اس صدائے حق کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مخالفین کی طرف سے سخت اذیتیں پہنچائی گئیں اور سنت رسول اللہ کی تبلیغ کے جرم بدعتی قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا۔ مگر انھوں نے اس کی

کوئی پرواہ نہ کی اور اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انھوں نے تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنا معمول ٹھہرایا، وہ برآن اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ لیکن ان کے خاندان کے عام لوگوں اور بزرگوں نے ان کو گھر اور وطن سے نکال دیا، اور وہ عرصہ تک باہر رہے۔

منصب صدر الصدور

اسی اثنا میں ان کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا اور ان کی علمی شہرت بادشاہ ہند جلال الدین اکبر تک پہنچی۔ اس نے ان کی علم و فضل کی وسعتوں سے متاثر ہو کر ان کو ۱۶۱۷ء میں مظفر خاں وزیر کی سفارش سے ہندوستان کے منصب صدارت پر فائز کر دیا۔ یہ اس دور کا بہت بڑا اعزاز تھا اور ملک کے تمام علما و قضات ان کے ماتحت تھے۔ شیخ عبدالنسی طویل عرصہ تک اس عہدہ جلیلہ پر متمکن رہے۔ ہندوستان میں بہت سے بادشاہوں نے تحت حکومت بچھایا اور بے شمار لوگوں نے صدارت کا منصب سنبھالا، مگر جو عزت و احترام، جو وقار و عظمت اور مال و دولت شیخ عبدالنسی کو حاصل ہوا، وہ اور کسی صدر کے حصے میں نہیں آیا جس قدر وظیفے اور امانتیں انھوں نے جانی کیں، اس کا دسواں حصہ بھی کسی صدر نے جاری نہ کیا ہوگا۔ مغل حکمرانوں میں سے جلال الدین اکبر بہت رعب اور دبدبے کا حکمران تھا، وہ ان کا اذہم معتقد تھا اور ان سے اس درجہ تکریم سے پیش آتا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے آگے رکھتا تھا، سماع حدیث کے لیے خود ان کے گھر جاتا اور ان کے اشاروں کا منتظر رہتا۔ ملک کے ہر طبقہ و خیال کے لوگوں اور عوام و خواص میں ان کو بڑی عزت و قبولیت حاصل تھی۔

مسجد کی جگہ مندر کی تعمیر اور ایک ہندو کا قتل

پھر ایک دور ایسا آیا کہ شاہ ہند جلال الدین اکبر تمام حق پرست علما اور صحیح العقیدہ مشائخ کی مخالفت پر اتر آیا اور مختلف حیلوں بہانوں سے انھیں مصائب و مشکلات میں پٹخانا شروع کر دیا۔ شیخ عبدالنسی بھی ان ہی علما کی جماعت میں شامل ہیں۔ اس کی اصل وجہ ملا مبارک اور ان کے بیٹے ابو الفضل اور فیضی تھے، جنھوں بادشاہ کو علما کی مخالفت پر اکسایا اور اس کے دل سے ان کے اثر و رسوخ کو ختم کیا۔

ان ہی دنوں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قاضی عبدالرحیم نے جو متحصر کے منصب قضا پر منعین تھے، صدر الصدوق شیخ عبدالنبی کی خدمت میں یہ استغاثہ بھیجا کہ متحصر کے مسلمان ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے انھوں نے جگہ کا انتظام بھی کر لیا تھا اور عمارتی سامان بھی وہاں رکھ لیا گیا تھا۔ لیکن یہاں کے ایک سرکش اور سرمایہ دار برہمن نے وہ تمام عمارتی سامان خود اٹھا لیا، اور مسجد کی جگہ پر اسی سامان سے ایک بت خانہ کی تعمیر شروع کر دی۔ میں نے جب اس سے باز پرس کی تو اس نے لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب و شتم کیا۔ اسلام کی اہانت کی اور مسلمانوں کے لیے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کیے۔

ظاہر ہے، یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا حامل تھا اور ملک کے صدر الصدوق کی حیثیت سے شیخ عبدالنبی کے لیے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ شیخ نے اس ہندو کو طلب کیا، مگر وہ حاضر نہ ہوا۔ بالآخر معاملہ بادشاہ تک پہنچا تو اس نے اپنے دربار کی دو بڑی شخصیتوں کو جن میں سے ایک مسلمان تہ یعنی ابو الفضل اور دوسرا ہندو تھا یعنی پیر پتھر بھیجا اور حکم دیا کہ وہ اس ہندو کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کریں۔ وہ ہندو تو نہ آیا، لیکن واپس آکر ابو الفضل نے بادشاہ کے سامنے وہ سب کچھ بیان کیا جو اس نے لوگوں سے سنا تھا اور کہا کہ اس بات کی تحقیق ہو گئی ہے کہ متحصر کے ہندو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم کیا ہے، اسلام کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں اور مسلمانوں کی توہین کی ہے۔

شاتم رسول کی سزا۔ علما کے دو گروہ

اس برہمن کو تو جیل میں ڈال دیا گیا مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کو اس جرم کی کیا سزا دی جائے؟ اس پر علما کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا، اور دوسرے نے اس کی تشہیر اور جرمانے وغیرہ پر زور دیا۔ بحث زیادہ طویل پکڑ گئی تو شیخ عبدالنبی نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت طلب کی اور اس پر اصرار کیا۔ بادشاہ نے صاف لفظوں میں تو اجازت نہ دی، البتہ یہ کہا کہ شرعی سزائوں کا

معاملہ آپ سے متعلق ہے، ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ شیخ نے بادشاہ سے کئی مرتبہ اس کے قتل کے لیے کہا، مگر وہ بدستور شیخ کو یہی الفاظ کہہ کر ٹالتا رہا کہ شرعی مزاویوں کے سلسلے میں ہم دخل دینا نہیں چاہتے، اس کا تعلق آپ کی ذات اور علم سے ہے۔ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ شاہی حرم میں ہندو عورتیں بھی موجود تھیں، انھیں واقعہ کا علم ہوا تو وہ بادشاہ سے اس برہمن کی رہائی کے لیے سفارش کرنے لگیں۔ بادشاہ سب کچھ سنتا لیکن خاموش رہتا، کیوں کہ اس کو شیخ کا بہت لحاظ تھا۔ نہ وہ صاف لفظوں میں اس کے قتل کی اجازت دیتا تھا اور نہ رہائی کا حکم جاری کرتا تھا۔ اب شیخ نے بادشاہ سے پھر اس کے قتل کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا، ہم تو آپ سے کہہ چکے ہیں کہ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں، ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بادشاہ کی یہ بات سن کر شیخ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا مگر جب بادشاہ کے علم میں یہ بات آئی تو اسے سخت غصہ آیا۔ اُدھر ہندو رانیوں نے جو شاہی حرم میں داخل تھیں، اور ہندو مصاحبوں نے جو دربار سے تعلق رکھتے تھے، بادشاہ کو بھڑکانا شروع کیا اور کہا کہ ان ملاؤں کو آپ نے اپنی مہربانیوں اور نرم رویے سے سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب یہ یہاں تک جبری ہو گئے ہیں کہ ان کو بادشاہ کی مرضی اور پسند کا بھی کوئی خیال نہیں رہا۔ وہ آپ کے حکم اور منظوری کے بغیر ہی اپنا اختیار اور دبدبہ جتانے کے لیے لوگوں کو قتل کرنے لگے ہیں۔ نہ ان کو آپ کی پرواہ ہے اور نہ رعایا کے احساسات کا کوئی خیال۔ ان غرض بعض عناصر نے بادشاہ کے اس طرح کان بھرے کہ اس کے لیے مزید تحمل ممکن نہ رہا، معاملہ اس کی قوت برداشت سے باہر ہو گیا اور جو مادہ ایک مدت سے اندر ہی اندر پک رہا تھا، پھوٹ کر بہ نکلا۔

ایک رات انوپ تلاؤ کی محفل میں بادشاہ نے یہ معاملہ دربار کے نئے نئے سفیروں کے سامنے پیش کیا اور اس مسئلہ سے متعلق ان کی رائے طلب کی۔ یہاں مختلف قسم کے لوگ موجود تھے، ہر ایک نے اپنی فکری اور ذہنی بساط کے مطابق اس بحث

میں حصہ لیا۔ کسی نے کہا، اس مقدمے میں نہ تو گواہوں پر کما حقہ جرح کی گئی ہے اور نہ ان کی پوری تعدیل کی گئی ہے کسی نے کہا، شیخ عبد النبی اپنے آپ کو امام ابو حنیفہ کے اولاد میں شمار کرنے میں، حالانکہ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت کافر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور ابرائے ذمہ کا باعث نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحت سے موجود ہے۔ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ شیخ کو اپنے جد امجد کے مذہب سے کیوں کراختلاف کی جرأت ہوئی۔

ملا عبد القادر سے اکبر کا استفسار

اس موقع پر ملا عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ اس مجلس میں، میں کبھی موجود تھا اور بادشاہ سے کسی قدر دُور تھا۔ دورانِ بحث میں نگہاں دُور سے بادشاہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا، اور میرا نام لے کر بلا یا اور کہا۔

”اے آوے“

میں قریب گیا تو پوچھا۔

کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر ننانوے روایتیں ہوں اور ہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو مفتی کو اس ایک روایت کو ترجیح دینا چاہیے۔ میں نے کہا، ”ہاں ایسا ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ان الحدود والعقوبات تندرد بالشبهات۔ میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا کہ شہادت حدود اور سزاؤں میں کسی کو دینے ہیں“

میری یہ بات سن کر بادشاہ نے افسوس کے ساتھ پوچھا۔

مگر شیخ عبد النبی برہنہ مستدلہ مطلع نہ بود کہ ان برہنہ بیچارہ را کبشت و این خود چگونہ باشد۔ کیا شیخ عبد النبی کو اس مسئلے کا علم نہ تھا۔ اس نے بیچارے برہنہ کو قتل کر دیا۔ آخر ایسا

لے ایسی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی جس کے یہ الفاظ ہوں یا اس سے ملنے چلتے ہوں۔

کیوں ہوا؟

میں نے کہا۔ شیخ خود بڑے عالم ہیں۔ وہ ضرور جانتے ہوں گے۔ اس روایت کے باوجود، اگر انھوں نے حکم دیا ہے تو ضرور کوئی مصالحت ہوگی۔ فرمودہ مصالحت چسپت؟

بادشاہ نے پوچھا۔ کیا مصالحت ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا۔ فتنہ و فساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سدباب۔ یہاں ملا عبد القادر لکھتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں قاضی عیاض کی شفا کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی۔ بیان کی بیکن حاضرین مجلس میں سے بعض خبیث النفس لوگوں نے کہا۔

قاضی عیاض مالکی است، سخن اور دریا خنفی سند نیست۔

قاضی عیاض مالکی مسلک کے حامل ہیں، ان کی بات خنفی ملک میں سند نہیں

بن سکتی۔

ان کے اس اعتراض پر بادشاہ نے مجھ سے پوچھا۔ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ میں نے کہا۔ وہ یقیناً مالکی ہیں، لیکن اگر کوئی محقق اور مفتی سیاسی مصالحت کی بنا پر ان کے فتوے پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔

ملا عبد القادر رقم طراز ہیں کہ میری یہ بات وہاں موضوع بحث بن گئی اور بحث خاصی طول پکڑ گئی۔ بادشاہ اس وقت بہت غصے میں تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں: دہلوی نے سبقت شاہنشاہی را دران وقت مردم می دیدند کہ چون موئے شیر برافشانہ بود۔ و از عقب سر مرمانع از بحث می آمدند۔ یکبارگی اعتراضی شدہ۔ فرمودند۔ ایں نامعقول است کہ می گوئی۔

یعنی لوگوں نے دیکھا کہ شاہنشاہ کی مونچھوں کے بال شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور حاضرین مجلس پیچھے سے میرا دامن کھینچ کر مجھے بحث سے روک رہے تھے۔ اتنے میں بادشاہ نے جھلا کر مجھ سے کہا۔

تم بہ نامعقول باتیں کر رہے ہو۔

میں فوراً تسلیہات بجالایا اور واپس آکر اپنی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس دن سے میں نے پیش قدمی اور کسی معاملے میں سبقت کرنا چھوڑ دیا اور بحث و مباحثہ سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بس کبھی کبھی کورنش بجاتا اور اپنے کام میں مشغول رہتا۔

اس واقعہ کے بعد شیخ عبدالنبی کو برابر زوال آتا گیا۔ ان کے اور بادشاہ کے درمیان ایک حجاب سا حائل ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملاقات اور گفتگو سے گریز کرنے لگے۔ یہاں تک کہ شیخ نے دربار میں جانا بالکل بند کر دیا اور ۹۸۶ھ میں وہ عہدہ صدارت سے معزول ہو گئے۔

ملا مبارک کی تجویز

اسی اثنا میں ملا مبارک کسی سلسلے میں بادشاہ کو مبارک باد دینے کے لیے آگرہ سے فتح پور گئے۔ بادشاہ نے ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا۔ ”آپ خود مجتہدِ دواں اور امامِ زماں ہیں، شرعی اور ملکی احکام کے اجماع میں ان ٹکڑوں کے محتاج کیوں بنتے ہیں جو بجز جھوٹی شہرت کے ذرہ برابر بھی علم سے بگاؤ نہیں رکھتے“ بادشاہ نے ملا مبارک سے کہا۔ تم ہمارے استاد ہو، ہم تم سے سبق پڑھتے رہیں گے، کسی طرح ہمیں ان لوگوں کے دباؤ سے نکالو۔“

بادشاہ کی یہ بات سن کر ملا مبارک کو پرانی دشمنیوں کا بدلہ لینے کا خوب موقع ملا۔ اس نے نہایت بدباطنی کے ساتھ بادشاہ سے کہا۔ آپ اجتناد کا دعویٰ کر دیں اور اس دعوے پر عالموں سے محضر لکھوا لیں۔“

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

یہی وہ واقعہ تھا، جس کی بنیاد پر ملا مبارک نے بادشاہ کے اجتناد اور تمام مجتہدوں پر اس کی افضلیت کے متعلق محضر تیار کیا اور فیہ فریوشوں کی اس مجلس میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو زبردستی سے پکڑ کر لایا گیا۔ کسی نے ان کی تعظیم

نہ کی۔ بے چارے جونیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ پھر ان پر ایسی سختی کی گئی کہ ان سے بہ جبر واکراہ اس محضر پر دستخط کرانے کو مجبور کیا گیا۔

شیخ کا غرور و تکبر

ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں اپنے عہد اور دورِ اکبری کے جن علما کا ذکر کرتے ہیں، ان سے وہ ذاتی طور واقف ہیں، ان کے اخلاق و کردار سے آگاہ ہیں اور ان کی زندگی کا ہر پہلو ان کے سامنے ہے۔ وہ ان کی علمی حیثیت کو بھی پہچانتے ہیں اور ذاتی کردار کے مختلف گوشوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے علم و فضل کے مداح ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کی زندگی کے ایسے گوشوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، جو ان کے علم و فضل سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ایک عالم دین کو ہر حال ایسی چیزوں سے محترم نہ رہنا چاہیے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی سعی کرنا چاہیے۔

بادشاہ ہند جہاںگیر ابتدا میں شیخ عبدالنبی کا بے حد قدر دان تھا، اس نے ان کو بہت سے اختیارات دے رکھے تھے، جن کی وجہ سے ان میں بڑا غرور اور تکبر پیدا ہو گیا تھا اور اس درجہ رعونت آگئی تھی کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ان کے حکم میں کھلے بندوں رشوت لیا اور دی جاتی تھی اور مملکت کے بڑے بڑے اہل کار بھی ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اس ضمن میں بدایونی کی مندرجہ ذیل سطور قابلِ مطالعہ ہیں:

بادشاہ نے حکم دیا کہ جب تک ممالک محروسہ کے تمام اہم اپنے وظائف، اوقاف اور معاش کے فرامین پر صدر شیخ عبدالنبی کی مہر نہ کرائیں، کر و طری ان کی رائے کا اجرا نہ کریں۔ اس فرمانِ شاہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے شرقی کنارے سے لے کر بھکر تک کے اہل عرض شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے جن کی

۶۷ تفصیل کے لیے دیکھیے منتخب التواریخ ص ۳۰۵ تا ۳۰۷

سفارش کسی امیر اور مقرب نے کر دی، اس کا کام حسبِ منشا تکمیل پا گیا اور جن کو کسی کی سفارش میسر نہ آئی، وہ بے چارے سید عبدالرسول اور شیخ کے دیگر کارندوں کے ہاں دھکے کھاتے رہے۔ نہ صرف ان کو بلکہ انھیں شیخ کے فرارشل دربانوں، سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھاری رشوتیں دینا پڑیں، جب کہیں ان کا کام بنتا۔ جو یہ بھی نہ کر پاتے وہ دربانوں کے ڈمڈمے کھاتے رہتے۔ ایسا بھی ہوا کہ بہت سے بد نصیب اس ہجوم اور بھاگ دوڑ میں گری کی شدت کی تاب نہ لا کر وہیں جاں بحق ہو گئے۔ یہ بات بادشاہ کے علم میں بھی آچکی تھی، لیکن وہ اس صدر عالی قدر کی تعظیم کے علاوہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جب شیخ اپنی مسند جاہ و جلال پر متمکن ہوتا اور عالی مرتبت امیر مختلف اہل علم کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے اس کی خدمت میں حاضری دیتے تو اس کے تیور دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ اس موقع پر تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ شیخ کسی کو تعظیم و تکریم سے پیش آتا، بلکہ وہ ہر ایک کو نہایت سخت الفاظ میں مخاطب ہوتا اور ڈانٹ ڈپٹ پر اُتر آتا تھا۔ جب بے چارے اسل انتہائی عاجزی اور خوشامد کا اظہار کرتا تو ان علمائے کرام کے لیے جو فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ اور دیگر منقہی کتابوں کا درس دیتے تھے، سو بیگمہ کے لگ بھگ اراضی منظور کر کے باقی زمین، جس پر وہ مدتِ دراز سے قابض تھے، ان کے نام سے قلم زد کر دیتا تھا۔ ان کے مقابلے میں جاہلوں، کینوں بلکہ ہندوؤں تک کو بہترین زمینیں عطا کر دیتا۔ اس طرح اس کے ہاتھوں علم اور اہل علم کی قدر و منزلت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔

اس سے آگے بڑھنے لگتے ہیں:

اپنے اجلاس میں دوپہر کے بعد جب شیخ نہایت غور و تکبر سے کرسی پر بیٹھا وضو بناتا تو اس کے مستعملہ پانی کے چھینٹے بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص مصاحبوں کے سروں اور کپڑوں پر گرتے اور اس کو ذرہ بھر بھی اس کا حسا

نہ ہوتا۔ وہ لوگ بھی اہل علم اور فقرا کا کام نکالنے کے لیے سب کچھ برداشت کرتے اور خوشامد، چاپوسی اور اس کی دل جوئی کی خاطر طرح طرح کی ذلتیں اٹھاتے۔ پورے شاہی عہد میں کسی صدر الصدور کا یہ اثر اور دبہ نہیں ہوا جتنا کہ شیخ عبدالنبی کو حاصل ہو گیا تھا۔

اس سے بڑھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ خود بادشاہ تعظیم و احترام کے جذبات کے ساتھ کبھی کبھی حدیث سننے کے لیے اس کے گھر جاتا۔ ایک دو مرتبہ تو بادشاہ نے اس کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی توایم کے لیے اسی کے حجرے میں بٹھایا گیا تھا، وہ عموماً مولانا عبدالرحمن جامی کی چہل حدیث کا درس دیا کرتا تھا۔

تصنیفات

شیخ عبدالنبی تعنیفی ذوق بھی رکھتے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک رسالہ حرمتِ سماع سے متعلق ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے اپنے والد مکرم شیخ احمد گنگوہی کے اس رسالے کے رد میں لکھا تھا جس میں انھوں نے سماع کو ضروری قرار دیا تھا۔ ایک اور رسالہ فقال مروزی شافعی کے ان اعتراضات کے رد اور جواب میں تحریر کیا جو انھوں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر وارد کیے ہیں۔

ان کے علاوہ وظائف النبی فی الادعیۃ الماثورۃ اور سنن الہدی فی متابعتہ المصنوعہ بھی ان کی تصنیفات میں سے ہے۔

معلوم ہوتا ہے، ان کی تصنیفات اور کتبیں ہیں، لیکن ان کا ہمیں علم نہیں

ہو سکا۔

اکبر کے حکم سے حجاز کو روانگی

مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود بہت بڑے عالم تھے اور دونوں کے درمیان شدید معاصرانہ رفاقت تھی۔ جلال الدین اکبر شروع شروع میں مخدوم الملک کو بے حد احترام کی نظر سے

دیکھتا تھا، لیکن بعض واقعات اس قسم کے پیش آئے کہ وہ اکبر کی نظروں سے گزرتے اور ان کا عروج، زوال میں بدل گیا۔ اس اثنا میں شیخ عبدالباقی کو ممالک محروسہ کا صدرالصدور بنا دیا گیا اور ان کا مرتبہ اعزاز انتہائی بلندیوں کو چھونے لگا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے)، بادشاہ ہند کے دل میں شیخ عبدالباقی کے متعلق بھی تنفر کے جذبات ابھر آئے۔ چونکہ بادشاہ ان سے نفرت کرنے لگا تھا، اس لیے وزرا کے گروہ میں بھی ان کا کوئی حامی نہ رہا اور یہ دونوں بزرگ اپنی علی ہمہ گیری کے باوصف اپنے ہی ملک میں اجنبی ہو کر رہ گئے۔ اکبر نے ایک تو نیا دین ایجاد کر لیا تھا اور اسے ان کی طرف سے مخالفت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، دوسرے وہ ان دنوں کی روز بروز کی مخالفت اور معاصرانہ چپقلش سے تنگ آ گیا تھا، لہذا اس نے ان کو دیار ہند سے نکل جانے اور مکہ معظمہ چلے جانے کا حکم دیا۔ اور اس دور میں حکمران لوگ بطور سزا کے بھی مخالفین کو حرمین بھیجتے تھے۔ چنانچہ یہ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ بعد ازاں شیخ عبدالباقی جب ۹۸۹ ہجری کو بادشاہ سے اجازت حاصل کیے بغیر واپس ہند ہوئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے شیخ کو اپنے خرچ سے ۹۸۸ھ میں مکہ معظمہ بھیج دیا۔

وفات

ایک روایت کے مطابق بادشاہ نے ان کو محاسبہ و باز پرس کے لیے اپنے وزیر راجہ ٹوڈرمل کے حوالے کر دیا تھا، اس نے ان کو جیل میں ڈال دیا اور شدید تکلیفیں پہنچائیں، جن کی تاب نہ لا کر وہ ۹۹۱ھ میں وفات پا گئے۔ دوسری روایت کے مطابق بادشاہ نے ان کا معاملہ ملا ابوالفضل کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی راجہ ٹوڈرمل کی طرح پہلے سے ان سے شدید مخالفت و عداوت رکھتا تھا۔ اس نے ان کو محبوس کر کے بہت سی ذہنی اور جسمانی آذیتوں میں مبتلا کیا اور بالآخر گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔

۱۵ تفصیل کے لیے دیکھیے: منتخب التواریخ، ص ۲۲۱، ۲۲۰ و ۳۰۵ تا ۳۰۷۔ طب الاماش

ملا بدیوئی ان کی وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں :
 شیخ عبدالنبی مکہ مکرمہ سے اکبر کے پاس فتح پور پہنچے۔ اکبر کے سامنے انھوں نے
 نہایت تلخ گفتگو کی اور اسے بہت بُرا بھلا کہا۔ ان کی باتیں سن کر اکبر کو بھی غصہ آ
 گیا اور ان کے بے باکانہ اسلوب کلام کو گستاخی پر محمول کیا۔ اس نے شیخ کے منہ پر
 زور سے طمانچہ مارا۔ شیخ نے چلا کر کہا : ”ایک ہی بار چھری مار کر میرا کام تمام کیوں نہیں
 کر دیتے؟“ اکبر نے ان کو راجہ ٹوڈرمل کے حوالے کر دیا اور حکم دیا کہ شیخ سے اس ستر
 ہزار روپے کا حساب لیا جائے جو مکہ معظمہ جاتے وقت انھیں دیا گیا تھا۔ کروڑوں
 نے ان کو کچھری کی حوالات میں طویل عرصے تک مقید رکھا۔ آخر ایک رات کلا گھونٹ
 کہ ان کو زندگی کی قید سے رہائی دلا دی۔ کس درجہ عبرت کی بات ہے کہ شیخ عبدالنبی
 جیسے مقتدر شخص کا یہ حشر ہوا کہ قتل کے دوسرے دن مناروں والے میدان میں
 اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ یہ واقعہ ۹۹۲ھ میں رونما ہوا۔
 ان کی تاریخ ”شیخ کنبی“ سے نکالی گئی اور یہ شعر کہا گیا۔

گرچہ الشیخ کانبی گفتند
 کانبی نیست شیخ ما کنبی است

شیخ اور ان کا خاندان

شیخ عبدالنبی ولد شیخ احمد ولد شیخ عبدالقدوس کا اصل وطن اندری علاقہ گنگوہ تھا۔ ان کا

تراجم الافاضل ص ۲۱۸ تا ۲۲۰ - آثار الامراء ج ۱، ص - نزهة الخواطر ج ۲، ص ۲۱۹ تا ۲۲۲ - تذکرہ
 علمائے ہند، ص ۱۳۴ - دربار اکبری، ص ۳۲۰ تا ۳۲۴ نیز ملاحظہ ہو، ص ۳۳۵ تا ۳۴۰ در
 حالات شیخ مبارک اللہ - رد و کوثر، ص ۹۴ تا ۱۰۷ - تذکرہ مولانا آزاد - بزم تیموریہ
 ص ۹۳، ۹۴ - آثار الامراء ج ۳، ص ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹ - منتخب التواریخ، ص ۲۴۱ تا ۲۴۳

تعلق ایک مشہور خاندان مشائخ سے تھا۔ مکہ اور مدینہ جا کر علم حدیث کی تحصیل کی، واپس آ کر تصوف کے مساک کو ترک کر دیا اور علوم دین کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ ۹۷۲ھ (یا ۹۷۱ھ) میں جبکہ مظفر خاں وزیر کل تھا، شیخ دربار میں آئے اور مظفر خاں کی سفارش پر صدر الصدور بنائے گئے۔ شیخ عبدالنبی کو دراصل ملامخدوم الملک (مولانا عبداللہ انصاری سلطان پوری) کا اثر گھٹانے کے لیے یہ اعزاز و ترقی دی گئی تھی۔ اکبر ابتدا میں شیخ کا نہایت معتقد تھا اور ان کے گھر جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اس نے ان کی جو تیاں تک سیدھی کیں۔ ۹۸۵ھ تک فیضی اور ابوالفضل بھی دربار میں آچکے تھے۔ ان دونوں نے اکبر کو اس طرح قابو میں کیا کہ وہ الحاد و بے دینی کی طرف مائل ہو گیا اور علما کی قدر اس کے دل سے جاتی رہی۔ شیخ کے زوال اور عبرت اکبر انجام کا باعث دراصل یہی دو بھائی تھے۔ معتمد خاں نے اقبال نامہ میں صاف لکھا ہے کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے اشارے سے شیخ کو مروا ڈالا۔ ان کی تاریخ وفات کے بارے میں جو شعر درج ہے اس کے دوسرے مصرع ”کنبی“ کا لفظ ”کنب“ سے لیا گیا ہے، جس کے معنی بھنگ کے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمارا شیخ بھنگ نوش ہے۔ بے چارے کو مرنے کے بعد بھی لوگوں نے نہیں بخشا اور طنز و طعن سے نہیں چونکے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی اخبار الاخیار میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حالات کے ضمن میں شیخ عبدالنبی کا ذکر کیا ہے۔

شیخ محمد اکرام کا تجزیہ

شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تصنیف رود کوثر میں مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور

نکھ منتخب التواریخ، ص ۵۰۲ (اردو ترجمہ)

لکھ اخبار الاخیار، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملاح عبدالقادر بدایونی کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اکبر کی تبدیلی مذہب اور علما سے نفرت کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے اور حضرت مجدد الف ثانی نے اکبری دور کے بعض علما کو جو ”علمائے سو“ قرار دیا ہے تو اس سے مخدوم الملک عبداللہ اور شیخ عبدالنبی مراد لیے ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے عمد اکبری کے ان دو علما کے کردار کا تجزیہ بڑے محتاط انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بدایونی کے علاوہ عمد مغلیہ میں علما کے جتنے تذکرے لکھے گئے اور جن کا مفہد منتخب التواریخ نہیں، ان میں بالعموم شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کی تعریف کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت مجدد کے شاگرد اور خلیفہ اور ان کی مشہور سوانح عمری حضرت القدس کے مصنف، جنہیں سترہ سال مرشد کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا، (سنوات الاقبا) قلمی، میں شیخ عبدالنبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث بود تسرع بر کمال داشت، و در اتباع سنت و رفع بدعت رسوخ تمام نصیب وقت او شدہ بود۔ و در امر معروف و نہی منکر بر سلاطین و امرا شدت کردے صاحب تصانیف شریفہ است۔ ازاں جملہ وظائف النبی است۔ درس نہ صد و نو و یک در عمد عرش آشیانی شہادت یافت، و صاحب فیض گفت سانش عقل ۱۷

[یعنی شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث تھے مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ اتباع سنت اور رفع بدعت میں بڑے تیز تھے اور ان کا

۱۷ رود کوثر، ص ۹۷۔ اس تاریخ وفات کا بدایونی کے بیان سے مقابلہ کیا جائے تو اندازہ کیجیے دونوں میں کتنا بعد ہے۔

تمام وقت اسی کام پر صرف ہوتا تھا۔ سلاطین و امرا سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سختی کا برتاؤ کرتے تھے.... بہترین تصانیف کے مصنف تھے، جن میں ایک وظائف النبی ہے۔ ۹۹۱ھ کو عہد اکبری میں شہادت پائی۔ تاریخ وفات اس عرصے سے نکلتی ہے:

[صاحب فیض گفت سالش عقل]

اکرام مرحوم اس سے آگے لکھتے ہیں:

اخبار الاصفیا (قلمی) میں جو ابو الفضل کے بھانجے عبدالسمد نے اسی زمانے میں لکھی (شیخ عبدالنبی کے بارے میں) اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے:

شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی، عنوان صحیفہ دین و دانش و فرست جریدہ علم و عمل بود۔ در عنفوانِ برناتی..... بحرین شریفین شہاد و حدیث دران تیر البقاع نزد شیخ ابن حجر..... استماع نمودہ بوطن گاہ خرامید و کرک، در رواج ارکان شریعت غرابر بستہ..... آرام گاہ فتح پور۔ کتاب سنن الہدیٰ از ویادگار است۔

[یعنی شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی، عنوان صحیفہ دین و دانش اور فرست جریدہ علم و عمل تھے عنفوانِ شباب میں..... زمین شریفین چلے گئے تھے اور اسی ارض مقدس میں شیخ ابن حجر..... سے سماعت حدیث کی۔ وطن واپس آکر ارکان شریعت غراکی ترویج و اشاعت کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ آخری آرام گاہ فتح پور ہے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب سنن الہدیٰ ہے] اکرام صاحب مرحوم مزید لکھتے ہیں:

دوسرے معاصرانہ تذکروں میں بھی (مثلاً مرآة العالم میں۔ سوائے ان کے جنہوں نے طبقات شاہ جہانی کی طرح بدایونی پر انحصار کیا ہے) شیخ عبدالنبی بلکہ مخدوم الملک کا ذکر بھی تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اور بالخصوص حضرت مجدد کے شاگرد اور سوانح نگار خواجہ بدرالدین سرہندی کی شیخ عبدالنبی کی تعریف کے بعد

یہ قیاس کہ حضرت مجتہد نے انھیں ”علمائے سو“ میں سے شمار کیا ہوگا، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔
اس عبارت کا مطلب بالکل ظاہر ہے۔ یعنی مولانا ابوالکلام تذکرہ میں واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ مجتہد الف ثانی نے ”علمائے سو“ مخدوم الملک عبداللہ سلطان یوہی اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی کو قرار دیا ہے، لیکن اکرام صاحب اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”علمائے سو“ سے مجتہد صاحب کی مراد ملا مبارک کے دونوں بیٹے ابو الفضل اور فیضی ہیں۔ اس ضمن میں اکرام صاحب کا یہ استدلال بڑا وزنی ہے کہ خود مجتہد صاحب کے مرشد اور سوانح نگار نواجہ بدرالدین سرہندی جنھوں نے سترہ سال کا طویل عرصہ اپنے عظیم مرشد کی خدمت میں بسر کرنے کی سعادت حاصل کی، اپنی تصنیف سنوات الاتقیاء میں ابوالفضل کے بھانجے شیخ عبدالصمد، اپنی کتاب اخبار الاصفیاء میں شیخ عبدالنبی کی تعریف میں ایسے بہترین الفاظ استعمال کرتے ہیں (جو اوپر گزر چکے) تو ان کو مجتہد صاحب کے الفاظ ”علمائے سو“ کا منطوق کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اکرام صاحب کے نزدیک مجتہد صاحب کا مشاۃ الیہ ابو الفضل اور فیضی ہیں، نہ کہ مخدوم الملک اور صدر الصدور۔! اکرام صاحب لکھتے ہیں:

حضرت مجتہد نے ”علمائے سو“ کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملے میں مولانا محمد ناظم ندوی کی رائے ہمیں صحیح معلوم ہوتی ہے، جنھوں نے تعلیمات مجتہد کے پیش لفظ میں ”علمائے سو“ سے ”مبارک ناگوری کے دونوں ذہین و طباع بیٹے ابو الفضل اور فیضی، اور تاج الدین دہلوی (کذا) مراد لیے ہیں۔ شاید ان کے علاوہ قاضی خاں بدخشی کی طرف بھی اشارہ ہو، جنھوں نے بادشاہ کے لیے سجدہ تہمت جائز قرار دیا۔“

۳۳۰ رد و کوشر، ص ۹۸

۳۳۱ ایضاً، ص ۹۷ — قاضی خاں بدخشی سے نظام الدین بدخشی مراد ہیں، جن کو اکبر نے

پہلے قاضی خاں اور پھر غازی خاں کا خطاب دیا تھا۔

بدایونی کی وجہ مخالفت

ملا عبدالقادر بدایونی شیخ عبدالنبی کے معاصر ہیں اور نہایت طنانہ مورخ ہیں ان کے قلم کا نشتر انتہائی تیز ہے۔ بہت کم لوگ ان کے طنز و تعریض سے محفوظ رہے ہوں گے۔ اتفاق سے یہ دونوں بزرگ اکبر کے دربار سے منسک تھے اور بدایونی کو بعض معاملات میں ان سے واسطہ بھی پڑا تھا۔ بدایونی کا ذریعہ معاش محدود تھا اور ان کو خزانہ شاہی سے اتنی مالی مدد نہ ملتی تھی، جس کے یہ متمنی تھے۔ اس کا انھوں نے اکبر سے کئی مرتبہ اظہار بھی کیا مگر ناکام رہے۔ ان کے خیال میں اس میں شیخ بھی رکاوٹ ڈالتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا، ہم نے تمہارے گروہ کے آدمیوں میں سے کسی کو اتنی امداد نہیں دی ^{۱۵۵}

ممکن ہے بدایونی کی طرف سے شیخ کی مخالفت کی ایک وجہ ان کا اپنا ذاتی معاملہ ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ لوگوں نے شیخ کی مخالفت اس لیے شروع کر دی ہو کہ بادشاہ وقت ان کا مخالف ہو گیا تھا ^{۱۵۶}

فیضی کے اشعار

شیخ عبدالنبی اپنے دور اقتدار میں اہل علم کے نزدیک نہایت عزت و احترام کے مالک تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۹۸۳ھ کو دہلی میں انھوں نے ایک مسیٰ تعمیر کی۔ تذکرہ علمائے ہند کے مترجم جناب محمد ایوب قادری رقم طراز ہیں کہ اس پر جو کتبہ نصب ہے، وہ فیضی نے لکھا اور وہ ان اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار میں شیخ کی بے حد تعریف کی گئی ہے:

۱۵۵. منتخب التواریخ (اردو ترجمہ)، ص ۳۳۸۔

۱۵۶. شیخ عبدالنبی کے حالات میں النور السافر، ص ۳۷۹، ۳۸۰ بھی دیکھیے۔ تیز ملاحظہ ہو

طبقات اکبری، ص ۳۹۰

فقہائے ہند جلد سوم

فی زمان الخلیفة الاکبر
 قد بنی بقعة مقدسة
 شیخ الاسلام ظاہر الحامین
 شیخ عبدالنبی نعمانی
 سأل تاریخ این بست فیضی
 سأل العقل قال خیر بقاء
 اید الله ذاته النفاع
 مناهم لا یكون فی الاقطاع
 شیخ اهل الحدیث بالاجماع
 معدن العلم منبغ الا نفاع

خلیفہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں، جس کی ذات الیسی سود مند ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائیدات اس کے شامل حال ہوں۔

افسوس نے ایک ایسا بفعہ مقدس تعمیر کیا ہے کہ جس کی نظیر اقطاع عالم میں نہیں ملتی۔ اور یہ وہ ہیں جن کو حرمین میں شیخ الاسلام کہا جاتا ہے اور جن کو متفقہ طور پر اہل حدیث کا شیخ قرار دیا جاتا ہے۔

وہ شیخ عبد النبی نعمانی ہیں، جو معدن علم اور سرچشمہ برکات ہیں۔

اس کی تعمیر تاریخ فیضی نے عقل سے پوچھی تو اس نے کہا۔ ”خیر بقاء“ (یعنی بہترین بقاء) ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے دورِ صدور الصدور میں خود فیضی کے نزدیک وہ کس درجہ قدر و منزلت کے حامل تھے۔

شاتم رسول کی سزا

اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ عبد النبی گنگوہی نے ایک ہندو شاتم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کی سزا دی تھی اور بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے یہ مسئلہ علما کی مجلس میں پیش کیا تھا اور پھر اس کو جس انداز سے موضوع بحث ٹھہرایا گیا، اس میں شرعی اعتبار سے شیخ کے فیصلے کو مرا مر غلط قرار دیا گیا تھا۔ یہ مسئلہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اختصار کے ساتھ اس کی شرعی حیثیت اور ائمہ دین کے لفظ نظر کی وضاحت کر دی جائے۔

تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ)، ص ۳۲۶

امام ابن تیمیہ نے الصادم المسلولوں میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ان من سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من مسلمہ او کافر فانه یجب قتله۔ هذا مذہب علیہ عامۃ اهل العلم۔ قال ابن المنذر اجمع عوام اهل العلم علی ان حر من سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم القتل وھن قالہ مالک واللیث واحمد واسحاق، وھو مذہب الشافعی ^{۱۹}

جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دیتا ہے، وہ مسلمان ہو یا کافر، اس کو قتل کر دینا واجب ہے۔ یہ عام اہل علم کا مذہب ہے۔ ابن المنذر لکھتے ہیں، عوام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دیتا ہے، اس پر حجرہ قتل نافذ کر دی جائے۔ امام مالک، لیث، احمد بن حنبل اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ اس ضمن میں امام احمد بن حنبل کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

کل من شتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم او تنقصہ، مساماً کان او کافراً، فعلیہ القتل ^{۲۰}

جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دیتا ہے یا آپ کی تنقیص کرتا ہے، وہ مسلمان ہو یا کافر، اسے قتل کر دیا جائے۔

ساتھ ہی مرقوم ہے: لیس علی هذا المظہور العهد والذمۃ۔ یہ معاملہ اس قدر سنگین ہے کہ اس پر عمد اور ذمہ کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ابو الصفر لکھتے ہیں:

سألت ابا عبد اللہ عن رجل من اهل الذمۃ شتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ماذا علیہ؟ قال اذا قامت البینۃ علیہ یقتل من شتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان او کافراً ^{۲۱}

^{۱۹} الصادم المسلول علی شاتم الرسول، ص ۳۔ فقہ ایضاً ص ۴۔ ایضاً

میں نے امام احمد سے سوال کیا، اگر کوئی ذمی آنحضرتؐ کو گالی دے تو اس کو کیا سزا دی جائے؟ فرمایا، جب اس کے خلاف ثبوت فراہم ہو جائے کہ وہ آنحضرتؐ کو گالی دینے کا مرتکب ہوا ہے تو وہ مسلمان ہو یا کافر اس کو قتل کر دیا جائے۔

اسی طرح وہ مختلف اہل علم اور اصحابِ امام احمد کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وذكر وان سابه يقتل وان كان ذمياً، وان عهده يندقض ^{١٥١}
آنحضرتؐ کو گالی دینے والے کو قتل کر دیا جائے گا، اگرچہ وہ ذمی ہو، اور اس کا عہد ٹوٹ جائے گا۔

امام مالک اور اہل مدینہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

وان كان ذمياً خانه يقتل ايضاً في مذهب مالك واهل المدينة ... و
هو مذهب احمد وفقهاء الحديث ^{١٥٢}

اگر شاتم رسول ذمی ہو، جب بھی اسے مذہب امام مالک اور مذہب اہل مدینہ کے مطابق قتل کر دیا جائے گا۔ امام احمد اور اہل حدیث کا یہی مذہب ہے۔

امام شافعی سے شاتم رسول کے بارے میں منقول ہے:
ان عهده يندقض بسب النبي صلى الله عليه وسلم وان
يقتل ^{١٥٣}

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم کی وجہ سے اس کا مسلمانوں سے عہد ٹوٹ جائے گا اور اسے قتل کر دیا جائے گا۔

امام شافعی کتاب الامم میں فرماتے ہیں کہ ذمیوں سے شرائط صلح لکھتے وقت یہ عہد لینا چاہیے کہ وہ آنحضرتؐ، کتاب اللہ اور دین اسلام کے بارے میں توہین آمیز

^{١٥١} الصارم المسلول علی شاتم الرسول ص ۶

^{١٥٢} ایضاً ص ۸

^{١٥٣} ایضاً ص ۴

الفاظ استعمال نہیں کریں گے، اگر کریں گے تو عہد ٹوٹ جائے گا اور ان کے مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس ضمن میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں:

إذا اراد الامام ان يكتب كتاب الصلح على الجزية، كتب وذكر الشرط، الى ان قال - وعلى ان احدا منكم ان ذكر محمدًا صلى الله عليه وسلم او كتاب الله او دينه بما لا ينبغي ان يذكره فقد برئت منه ذمة الله ثم ذمة امير المؤمنين وجميع المسلمين، ونقض ما اعطى من الامان، وحل لامير المؤمنين ماله ودمه كما تحل اموال اهل الحرب ودمنا لله ^{صلى الله عليه وسلم}

جب امیر المؤمنین، جزیہ کے بارے میں اہل ذمہ سے صلح نامہ معرضِ کتابت میں لائے لگے تو باقاعدہ ان شرائط کو ضبط تحریر میں لائے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں یا قرآن مجید اور اللہ کے دین کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کرے گا تو وہ اللہ کی ذمہ داری، پھر امیر المؤمنین اور تمام مسلمانوں کی ذمہ داری کے حلقے سے باہر نکل جائے گا، اور جو امان اسے دی گئی ہے، وہ ٹوٹ جائے گی، اور امیر المؤمنین کے لیے اس کا جان و مال اسی طرح حلال قرار پائے گا جس طرح کہ اہل حرب کے مال و جان حلال قرار پاتے ہیں اس سے آگے امام شافعی فرماتے ہیں، اگر کوئی ذمی مسلمان عورتوں کی عزت کو ملحوظ نہیں رکھے گا، یا کسی مسلمان پر ڈاکہ ڈالے گا یا اس کے دین کے سلسلے میں رکاوٹ پیدا کرے گا یا ان لوگوں کی اعانت کرے گا جو مسلمانوں کے محارب اور ان سے برسرِ پیکار ہیں یا ان کو اہل اسلام کے رازوں سے آگاہ کرے گا اور ان کی اندر کی باتیں انھیں بتائے گا تو اسے یاد رکھنا چاہیے۔

فقد نقض عهده وحل دمه وماله ^{صلى الله عليه وسلم}

اس نے اپنا عہد توڑ دیا اور اس کا خون اور مال مسلمانوں پر حلال ہو گیا۔

عنه ايضا

عنه الصارم المسلول ص ۸

امام شافعی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مال اور عورت کو نقصان پہنچانے کی جو کوشش بھی کرے گا، اس کو نقصانِ عمد پر محمول ٹھہرایا جائے گا اور اس سے ابرائے ذمہ ہو جائے گا۔

ثم قال فهذه الشروط اللازمة ان رضيتها فيها، وان لم يرضها فلا عقده ولا جزيه ^{١٤٥}

یہ بنیادی شرائط ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ ان پر رضامند ہے تو بہتر، ورنہ عمد اور جزیہ کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔

بہر حال اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شاتمِ رسول کی سزا قتل ہے اور ائمہ اربعہ کا یہی مذہب ہے :

ان الساب ان كان مسلماً فانك يكفرون يقتل بغير خلاف، وهو مذهب
الائمة الادبعة وغيرهم ^{١٤٦}

آنحضرت کو گالی دینے والا اگر مسلمان ہو تو وہ دائرہ کفر میں داخل ہو جاتا ہے اور بلا اختلاف اس کی سزا قتل ہے۔ ائمہ اربعہ اور دیگر اہل علم کا یہی مذہب ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ڈمی یا کافر گالی دے تو اس کا کیا کیا جائے؟ اس ضمن میں مختصر الفاظ میں امام احمد، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا مذہب بیان ہو چکا۔ وہ اس کے قتل کا فتویٰ دیتے ہیں، مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ان سے قدرے مختلف ہے :

واما ابو حنیفہ واصحابه فقالوا، لا ينتقض العهد بالسب ولا يقتل
الذمی بذالك، لكن يعزر علی اظهار ذلك كما يعزر علی اظهار المنكرات التي ليس ام
فعلها من اظهار اصواتهم بكتابهم ونحو ذلك ^{١٤٧}

امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا کہنا ہے کہ آنحضرت کو گالی دینے سے ذمی کا عمد نہیں

١٤٥ ايضاً ص ٨

١٤٦ ايضاً

ٹوٹنا اور نہ اس سے اس کو قتل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے اظہار پر اسے تعزیر کی سزا دی جائے گی، (حد کی نہیں)، جیسے کہ ان منکرات کے اظہار پر تعزیر کی سزا دی جاتی ہے، جن کا ان کی مذہبی کتاب کی دوسری زبان سے اظہار کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

آنحضرتؐ اور آپ کے صحابہ نے جن شامان رسول کو قتل کیا یا قتل کا حکم دیا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو مصلحت و سیاست پر محمول کرتے ہیں تاکہ لوگ اس میں جرمی نہ ہو جائیں اور فتنے کا دروازہ نہ کھل جائے۔

ويحملون ما جاء عن النبي صلى الله عليه وسلم واحصحابه من القتل في مثل هذا الجرم اذ الله على انه رأى المصلحة في ذلك ويسمونه القتل سياسة وكان حاصله ان له ان يعثر بالقتل في الجرم التي تغاقت بالتكرار وشرع القتل في جنسها۔^۹

اس قسم کے جرائم میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے جو قتل منقول ہے، وہ مصلحت پر مبنی ہے اور وہ اس کو ایسا قتل قرار دیتے ہیں جو سیاسی وجہ کی بنا پر ضروری ہو، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کو تعزیراً قتل کی سزا ان جرائم میں دی جائے گی، جن کا ارتکاب بکثرت و بتکرار کرنے سے، ان جرائم میں اضافہ ہو جائے، اور اس قسم کے جرائم میں قتل مشروع ہو۔

اس کے بعد امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:-

وهذا الفتى أكثرهم يقتل لمن آثر من سب النبي صلى الله عليه وسلم من اهل الذمة وان أسلم بعد اخذها، وقالوا، يقتل سياسته وهذا منوجه على اصولهم۔^{۱۰}

اسی بنیاد پر ان میں سے اکثر نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر ذمی کثرت سے آنحضرتؐ کو گالی دیتا ہے تو اس کو سیاستاً قتل کر دیا جائے، اگرچہ وہ گرفتاری یا مواخذہ کے بعد اسلاً

قبول کر لے، اور یہ بات ان کے اصول کے مطابق ہے۔

حاصل کلام یہ کہ شاتم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باب میں اصولی طور پر ائمہ اربعہ کا ایک ہی نقطہ نظر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ امام ابن تیمیہ نے کتاب و سنت، صحابہ کرام اور ائمہ دین کے اقوال وارشاد کی روشنی میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ از روئے شریعت شاتم رسول قابلِ قتل ہے۔

۱۶۹۔ شیخ عبدالوہاب اکبر آبادی

شیخ عبدالوہاب اکبر آبادی، اکبر آباد (آگرہ) کے رہنے والے تھے، شیخ ابو الفتح ملکی اکبر آبادی کے بڑے لڑکے تھے اور شیخ بدھا کے عرف سے معروف تھے۔ حسن صورت اور عمدہ سیرت سے آراستہ اور دانش و بینش سے پیراستہ تھے۔ کتبِ درسیہ اور فنون کی تحصیل میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ بالخصوص تفسیر اور حدیث میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ شیخ مبارک بن شہاب الدین گوپاموی وغیرہ علما سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس اور افادہ طلباء میں مصروف ہو گئے تھے۔ وعظ و تلقین سے گریزاں نہ ہتے تھے۔ نیکی اور صالحیت کا یہ عالم تھا کہ ان کو دیکھ کر اور ان کی مجلس میں بیٹھ کر خدا یاد آتا تھا۔ بندگانِ خدا کے حالات و کوائف کے سوا دوسری باتوں میں بہت ہی کم دلچسپی لیتے۔ تاریخ و سیرت کے بے شمار عبرت آموز واقعات زبانی یاد تھے۔ ان واقعات کو بڑے ناصحانہ انداز میں بیان کرتے۔ جواں مردی اور سخاوت ان کے خمیر میں داخل تھی۔ اگر کوئی چیز یاں نہ ہوتی اور ضرورت مند آجاتا تو گھر کے مال اسباب میں سے جو کچھ ہاتھ پڑجاتا، اہل خانہ سے چھپا کر اس کو دے دیتے۔ بسا اوقات لوگوں سے قرض لے کر بھی دوسروں کی ضرورتیں پوری کرتے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ اگرہ کے حاکم نے ان کی ہمت اور وسعت قلبی کا امتحان لینے کے لیے باشندگان شہر کو حکم دے دیا تھا کہ اس درویش عالم دین کو کوئی شخص کچھ بھی بطور قرض نہ دے، کیوں کہ یہ سب کچھ غریب میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ مگر بائیں ہمہ لوگوں نے نہایت تعجب کے ساتھ دیکھا کہ ان کے مہمان خانے کا خرچ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے اور ان کا دسترخوان مزید بہتر اور وسیع ہو گیا ہے۔ روزانہ بے شمار سائل ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کامیاب واپس جاتے۔ ان کے دروازے سے کبھی کوئی ناکام اور خالی ہاتھ نہیں کوٹا۔

جہاں یہ علوم ظاہری کے بہت بڑے عالم تھے، وہاں تصوف و طریقت کے بھی ماہر تھے چنانچہ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل کی تلقین اور معارف و حقائق تصوف کی تعلیم کا سلسلہ بھی ان کے ہاں جاری تھا۔

برصغیر پاک و ہند کے اس بلند کردار اور نامور صوفی نے ۴ شعبان ۷۷۰ھ کو

اگرہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۱۷۰۔ مولانا عبدالوہاب کشمیری

مولانا عبدالوہاب بن مفتی فیروز حنفی کشمیری، علاقہ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے عصر کے مشاہیر اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے معروف شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ علوم حکمیہ میں بھی کامل عبور رکھتے تھے اور تصنیفی ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ شرح شمسہ اور شرح المواقف پر تعلیقات و حواشی تحریر کیے۔

۱۷۱۹ء اذکار ابرار ص ۲۸۴ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۲۲

۱۷۲۰ء حقائق الحنفیہ ص ۳۸۲ بعض حالات مفتی فیروز کشمیری — دلائل قدوسی ص ۸

نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۲۵

افسوس ہے اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۱۷۱۔ مولانا عزیز اللہ اردو لوی

مولانا عزیز اللہ بن اسماعیل بن صفی الدین بن نصیر الدین حنفی اردو لوی، ردولی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ اسماعیل سے کتب دینیہ کی تحصیل کی۔ ایک عرصہ تک ان سے منسلک و ملازم رہے۔ یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے دور کے جید علما میں ہونے لگا اور سند تدریس پر فائز ہوئے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ بے شمار علما و طلباء نے ان سے اخذِ علم کیا۔

۱۷۲۔ مولانا عزیز اللہ تلنبی

مولانا عزیز اللہ تلنبی ملتانی حنفی المسلک تھے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عالم، محقق، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ مختلف علوم و فنون میں بے حد درک اور مہارت رکھتے تھے بلکہ کہنا چاہیے کہ اس ضمن میں درجہ امامت پر فائز تھے۔ نہایت دین و ذکی اور تیز فکر تھے۔ ساتھ ہی عابد و زاہد، متقی اور پرہیزگار بھی تھے۔ لوگوں سے بہت کم میل جول رکھتے تھے اور تنہائی پسند تھے۔ کتابوں پر نظر و استحضار کا یہ عالم تھا کہ تدریس کے وقت کتاب بینی اور مطالعہ کی قطعی ضرورت محسوس نہ کرتے اور مشکل سے مشکل مسائل نہایت آسانی سے کتاب دیکھ بغير حل کہہ دیتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ امتحان کی غرض سے دقیق اور الجھے ہوئے مسائل لے کر علما و طلباء ان کے پاس آئے اور انھوں نے پوری تفصیل سے مسئلہ زیر بحث کی وضاحت کر دی۔ بے حد فیاض اور سخی تھے، طلباء پر بہت مہربان اور ان کے مشفق تھے۔ ان کی ضروریات خود فراہم کرتے۔

مولانا عزیز اللہ درحقیقت ضلع ملتان کے قصبہ تلنبہ کے رہنے والے تھے۔

سکندر شاہ لودھی کے عہد میں پہلی گئے، وہاں سے عازم سنبھل ہوئے اور پھر وہیں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان سے بے شمار علمائے کسب علم کیا، جن میں شیخ نظام الدین خیر آبادی اور شیخ حاتم سنبھلی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا عزیز اللہ تلمبھی نے ۹۳۲ھ کو وفات پائی ۹۴۲ھ

۱۷۳۔ مولانا علاء الدین لاہوری

مولانا علاء الدین بن منصور لاہوری، مہد علم و فضل میں پیدا ہوئے اور معرفت و نصوت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے زمانے کے عالم و فاضل، شیخ اور برگزیدہ شخص تھے۔ علوم و فنون پر عمیق نگاہ رکھتے تھے اور اس ضمن میں اپنے اقران و معاصرین سے قائق تر تھے۔ تصنیفی اور تدریسی ذوق سے بہرہ ور تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ٹلا سعاد اللہ تغتا زانی کی شرح العقائد پر حاشیہ سپرد قلم کیا عرصہ تک خان خانان کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ پھر بادشاہ ہند جلال الدین اکبر سے تقرب پیدا ہوا، اس نے ان کے علم و فراست اور عقل و دانش سے متاثر ہو کر اپنے ندما و مصاحبین کی جماعت میں شامل ہونے کی درخواست کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا اور تمام معاملات دنیوی سے منقطع ہو کر درس و تدریس کو اپنا اصل مشغلہ قرار دے لیا۔ ان کی تمام مساعی طلباء کی خدمت کے لیے وقف تھیں۔ جو چیز کہیں سے حاصل ہوتی، طلباء کے حوالے کر دیتے، خود تکلیف اٹھاتے مگر اپنے تلامذہ کو حتی الامکان کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہونے دیتے۔ ان کے لیے بے حد مہربان اور سخی تھے۔ زندگی کے آخری دور میں حجاز تشریف لے گئے۔ حج و زیارت کی سعادت حاصل

۹۴۲ منتخب التواریخ ص ۸۶ — نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۲۵، ۲۲۶ — تذکرہ

علمائے ہند ص ۱۳۹، ۱۴۰۔

کی اور وہیں وفات پائی۔ ۹۳

۱۷۴۔ شیخ علی متقی بن حسام الدین برہان پوری

شیخ علی متقی بن حسام الدین بن عبد الملک بن قاضی خاں۔ ان کا لقب متقی تھا۔ ان کے آبا و اجداد درحقیقت جون پور کے رہنے والے تھے، وہاں سے علاقہ دکن کے شہر برہان پور میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

شیخ علی کی ولادت ۸۸۵ھ کو برہان پور میں ہوئی۔ انھوں نے عنایت و ہمار کی گود اور نذر و نقوی کی آغوش میں پرورش پائی۔ ابھی سات آٹھ سال کی عمر کو پختے تھے کہ والدِ مکرم شیخ حسام الدین ان کو شاہ باجن چشتی کی خدمت میں لے گئے جو اس زمانے میں برہان پور میں مقیم تھے۔ باپ نے اپنے اس بچے کو ان کی حلقہ ارادت میں داخل کرادیا۔ اس سے چند روز بعد والد بزرگسہ دار انتقال کر گئے، ان کے انتقال کے بعد علی کچھ عرصہ غیر علمی مشاغل میں مشغول رہے۔ نوجوانی کے زمانے میں ما نڈ میں ایک بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی اور اس اثنا میں کچھ دولت بھی جمع کی۔ ملازمت کے فتر میں ان پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دنیوی معاملات سے نفرت پیدا ہوگی اور دنیا اور اس کی بے ثباتی کا ایسا نقش دل میں بیٹھا کہ ہر طرف سے دامن سمیٹ کر شاہ باجن کے لہکے شیخ عبد الحکیم کی خدمت میں بھاہنچے۔ چون کہ طبعی طور پر نیک تھے اور فطرت میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے نشوونما کا ثلثہ تھا، لہذا ملتان کا قصد کیا اور وہاں شیخ حسام الدین متقی کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ دو سال ان کے پاس رہے۔ اس عرصے میں ان سے تفسیر بیضاوی اور کتاب عین العلم کا مذاکرہ کیا۔ ملتان سے غازی پور میں شریفین ہوئے اور مکہ معظمہ کے شیخ الحدیث شیخ ابوالحسن شافعی بکری کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے احادیث کی کتابیں پڑھیں اور تصوف و طریقت کے بعض

۹۳ منتخب التواریخ ص ۳۳۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱۔ نزہۃ الخوافر، ج ۲ ص ۲۳۱

سلسلوں کا درس لیا۔ شیخ محمد بن محمد سخاوی مصری سے بھی اخذِ طریقت کیا۔ اس اثنا میں حصولِ علم کی طرف بھی پوری توجہ مبذول کیے رکھی اور شیخ ابوالحسن شافعی بکری کے علاوہ شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی سے اخذِ علمِ حدیث کیا۔ عرصہ تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا، وہاں پہلے تو خود حصولِ علم میں مشغول رہے، بعد ازاں حدیث و تصوف کے موضوع سے متعلق کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

قیامِ ملتان کے زمانے میں

قیامِ ملتان کے زمانے میں شیخ علی متقی کبھی ایک جگہ مستقل طور پر سکونت پذیر نہ ہوتے تھے۔ گرد و نواح کے مختلف علاقوں اور قصبوں میں گھومتے پھرتے رہتے۔ جہاں نیک اور متین لوگوں کی چھوٹی بڑی جماعت دیکھتے، وہاں مقیم ہو جاتے اور اللہ کی عبادت اور ذکر و فکر کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ ان کا معمول تھا کہ سفر میں دو تھیلے اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک میں ضروریات اور کھانے پینے کا سامان ہوتا، مثلاً چاول، ماش، تیل، گندم، نمک اور کھانے پکانے کے لیے چند برتن وغیرہ۔ دوسرے میں قرآن مجید، چند کپڑے اور مطالعہ کی ضروری کتابیں۔ اجنگل سے خود لکڑی کاٹتے اور اسی کو استعمال میں لاتے۔ دو دن کا سامان چار روز تک چلاتے۔ کبھی مسیج میں نہ ٹھہرتے، کرایہ کے مکان میں رہتے۔ وضو کے لیے لوٹا اور پانی کا مشکیزہ ساتھ رکھتے۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے، کسی سے اپنے ذاتی کام کے لیے نہ کہتے۔ اگر مجبور ہو کر کہتے بھی تو پہلے اس کو اجرت عطا فرمایتے۔ شیخ علی متقی جس زمانے میں ملتان میں قیام پذیر تھے، شیخ حسام الدین متقی ملتانی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ شیخ عبدالرحمن محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

دران ہنگام کہ ایشاں بملتان در صحبت شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ می بودند در خلوت نشستند می بودند۔ شیخ حسام الدین کتاب ہارا بیر سر خود نہادہ بدر حجرہ می آمدند و استبندان می نمودند می گفتند، حسام آمدہ است چمی فرمایند؟ یک دو بار ہمیں نوع می گفتند۔ اگر حجرہ می کشاوند۔ می نشستند و با ہم نہ کہہ تفسیر بیضاوی می نمودند، آن مقدار کہ وقت خدمت شیخ السماع داشت، می نشستند۔ و اگر درنی

کشادہ، بازی گت تندیکہ

یعنی شیخ علی، اپنے ملتان کے قیام کے زمانے میں، جب کہ وہ شیخ حسام الدین کی صحبت میں رہ رہے تھے، خلوت نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شیخ حسام الدین کی کیفیت یہ ہوتی کہ وہ سر پر کتاہیں اٹھائے، شیخ علی کے دروازے پر آکر کھڑے ہو جاتے اور اندر آنے کے لیے ان الفاظ میں اجازت طلب کرتے۔ ”حسام الدین حاضر ہے۔ کیا ارشاد ہے؟“ ایک دو بار اسی طرح کہتے۔ اگر شیخ حجرے کا دروازہ کھول دیتے تو وہ بیٹھ جاتے اور دونو اتنی دیر تک تفسیر بیٹھاوی کے بارے میں مذاکرہ فرماتے، جب تک کہ وقت کی گنجائش ہوتی۔ اگر شیخ حجرے کا دروازہ نہ کھولتے تو شیخ حسام الدین واپس تشریف لے جاتے۔

گجرات میں

شیخ علی متقی گجرات میں بھی مقیم رہے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو تخت گجرات پر سلطان بہادر متمن تھا۔ اس کو شیخ کے اوصاف و کمالات کا علم ہوا تو وہ ان کے حلقہ معتقدین میں داخل ہو گیا۔ اس نے ان کو کئی دفع مختلف قسم کے انعامات سے نوازا چاہا، اور جاگیریں عطا کرنے کی کوشش کی مگر شیخ نے ہمیشہ انکار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ان کے عقیدت مندوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کو سعادت سمجھتے تھے۔ لیکن شیخ کا معمول یہ تھا کہ دروازہ بند کر کے حجرے میں بیٹھ جاتے اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان ہی دنوں سندھ کے ایک عالم و فاضل اور متقی و صلح بزرگ شیخ عبداللہ سندھی گجرات تشریف لائے۔ وہ حج کو جاتے ہوئے اپنے اہل و عیال سمیت چند روز کے لیے گجرات ٹھہرے۔ شیخ علی متقی سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ والی گجرات سلطان بہادر سے بھی ان کے مراسم تھے سلطان نے ان سے کہا وہ شیخ علی سے ملاقات کرنے اور ہم کلام ہونے کا خواہاں ہے مگر وہ اس کا موقع نہیں دیتے۔ اگر شیخ اس کو حاضر خدمت ہونے کا شرف بخشیں تو ان کی عنایت

ہوگی۔ شیخ عبداللہ نے شیخ علی متقی سے بات کی مگر شیخ نے معذرت کر دی۔ شیخ عبداللہ نے ان سے یہ بھی کہا، آپ سلطان سے بالکل ہم کلام نہ ہوں، خاموشی سے بیٹھے رہیں، ہم خود اس سے باتیں کرتے رہیں گے۔ شیخ نے فرمایا۔ بادشاہ کا لباس اور وضع قطع غیر شرعی ہے، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں اس کو دیکھوں اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کروں۔ اس پر کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ خود مناسب الفاظ میں بادشاہ کو نصیحت کریں گے۔ آپ صرف یہ مرثیہ فرماتیں کہ اس کو حاضر ہونے کی اجازت دے دیں۔ خاصی مدد و قدرح کے بعد سلطان کو حاضری کا موقع دیا گیا اور شیخ کے معتقدین نے اس کو وعظ نصیحت کی۔

اس ملاقات کے دو مہرے دن سلطان نے ایک کروڑ سکہ گجراتی بطور تحفہ شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ تمام رقم شیخ نے شیخ عبداللہ سندھی کے حوالے کر دی اور فرمایا۔ ہوں باعث ملاقات و واسطہ حصولِ این مبلغ شما بودید، این مبلغ ہم بشما تعلق داشته باشد۔

چوں کہ بادشاہ کی ملاقات آپ کی وساطت سے ہوئی اور وہ آپ کے ذریعے ہوا آیا تھا، اور اس رقم کے حصول کا باعث بھی آپ ہیں۔ لہذا اس کے حق دار آپ ہی ہیں۔ ایک وزیر کی دعوت میں شہر گت

شیخ علی متقی سے ملوک و سلاطین اور وزراء و امرا بے حد عقیدت مندانہ جذبات رکھتے تھے اور ان کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دیتے اور اس پر اصرار کرتے تھے۔ مگر وہ ان کے گھر جانے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے۔

ایک مرتبہ ایک وزیر بے درصہ ہوا کہ وہ اس کے مکان پر تشریف لے جائیں اور وہاں جا کر اس کے لیے دعا فرمائیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں : یکے از وزرائے آں جا ایشان را تکلیف ضیافت کرد، ایک بار بہ خانہ بندہ تشریف

اگر نذاردی برکتے باشد۔ فرمودند مرا معذور دارید، ہم ازین جادعائے بکنیم، خدائے
تعالیٰ شہارہ برکتے دہد۔ چون آن شخص بسیار کرد۔ فرمودند پس می آیم، اما بہ شرط۔
یکے آن کہ ہر جا کہ خواہیم بنشینیم، مارا تکلیف نہ کنند کہ بالا تر بیایند و برصد
نشینند، گفت ہم چنینی باشد۔ ہر جا کہ حضرت را خوش آید بنشینند۔

دوم آن کہ تکلیف نکلند کہ این بخورید و یا آن بخورید۔ ہر چہ مارا خوش
آید بخورم۔
سوم آن کہ ہر گاہ کہ خوش آید بر خیزم و بیایم۔ تکلیف نکلند کہ یک ساعت
دیگر بنشینند۔

یعنی ایک دفعہ (مملکت گجرات کے) ایک وزیر نے شیخ کو دعوت طعام دی اور
عرض کی کہ ایک بار غریب خانہ پر تشریف لے جا کر بندہ کو شکریہ گزار فرمائیں،
اور دعائے برکت کریں۔ فرمایا، مجھے گھر پہ جانے سے معذور سمجھیے۔ فقیر نہیں بیٹھے ہوئے
دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے گا۔ لیکن اس نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا،
میں آجاولں گا مگر تین شرطوں کے ساتھ۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جہاں چاہوں گا، بیٹھوں گا۔ آپ مجھے بلند جگہ پر اور صد
مقام پر بیٹھنے کے لیے اصرار نہیں کریں گے۔ اس نے کہا، اسی طرح ہوگا۔ جہاں
آپ کا جی چاہے، تشریف رکھیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس پر اصرار نہ کیا جائے کہ یہ کھائے اور وہ کھائے۔
میں جو چاہوں گا، کھاؤں گا۔

تیسری یہ کہ جب چاہوں گا، آپ کی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوں گا اور واپس
آجاولں گا۔ آپ اصرار نہ کریں گے کہ قصور ڈیرا اور ٹھہریے۔
اس سب سے آگے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رقم فرماتے ہیں:

آرندتا دروی برکتے باشد۔ فرمودند مرا معذور دارید، ہم ازین جادعائے بکنیم، خدائے
تعالیٰ شمارا برکتے دہد۔ چون آن شخص بسیار کرد۔ فرمودند نہیں می آیم، اما بہ شرط۔
یکے آن کہ ہر جا کہ خواہم بنشینیم، مارا تکلیف نہ کنند کہ بالاتر بیابند در صد
نشینند، گفت ہم چنینی باشد۔ ہر جا کہ حضرت را خوش آید بنشینند۔

دوم آن کہ تکلیف نکنند کہ این بخورید و یا آن بخورید۔ ہر چہ مارا خوش
آید بخورم۔

سوم آن کہ ہر گاہ کہ خوش آید بر خیزم و بیایم۔ تکلیف نکنند کہ یک ساعت
دیگر بنشینند۔

یعنی ایک دفعہ (مملکت گجرات کے) ایک وزیر نے شیخ کو دعوت طعام دی اور
عرض کی کہ ایک بار غریب خانہ پر تشریف لے جا کر بندہ کو شکریہ گزار فرمائیں،
اور دعائے برکت کریں۔ فرمایا، مجھے گھر پر جانے سے معذور سمجھیے۔ فقیر بیس بیٹھے ہوئے
دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے گا۔ لیکن اس نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا،
میں آجائوں گا مگر تین شرطوں کے ساتھ۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جہاں چاہوں گا، بیٹھوں گا۔ آپ مجھے بلند جگہ پر اور صد
مقام پر بیٹھنے کے لیے اصرار نہیں کریں گے۔ اس نے کہا، اسی طرح ہوگا۔ جہاں
آپ کا جی چاہے، تشریف رکھیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس پر اصرار نہ کیا جائے کہ یہ کھائیے اور وہ کھائیے۔
میں جو چاہوں گا، کھاؤں گا۔

تیسری یہ کہ جب چاہوں گا، آپ کی مجلس سے اٹھ کر چلوں گا اور واپس
آجائوں گا۔ آپ اصرار نہ کریں گے کہ کھوڑی دیر اور کھڑے رہے۔
اس سے آگے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رقم فرماتے ہیں:

آن شخص ہمہ این شرائط از ایشان قبول کرد و وعده کردند کہ فردا بیایم۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ چوں فردا شد، نان پارہ در خریطہ کہ دائم در گردن خود آویختہ می داشتند انداختند و تنہا بمنزل دے آمدند و ہم نزدیک در نشستند۔ آل مرد فرشتہا بتکلف انداختہ و جائے ملوکانہ ساختہ بود۔ گفت این جا بنشینید، بالاتر بنشینید۔ گفتند آخر نہ شرط است کہ ہر جا کہ خوش آید بنشینم۔ آل شخص ملزم شد۔ چیزے نتوانست، گفت، گفتند زود باشید کہ وقت تنگ است۔ طعام ہا کشیدند۔ ایشان نان پارہ کہ داشتند از خریطہ ر خود بر آوردند و بخوردند۔ آل شخص التماس کرد کہ از این طعام ہا چیزے بچشید۔ گفتند آل چہا بود کہ ہر چہ خوش آید بخوریم۔ دیگر برخواستند و وداع کردند کہ شرط بود ہر گاہ کہ خواہیم برآئیم۔ والسلام

اس وزیر نے شیخ کی یہ تینوں شرطیں منظور کر لیں تو فرمایا، ان شاء اللہ تعالیٰ، کل آئیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن روٹی کے چند ٹکڑے اس تھیلی میں ڈالے جس کو ہمیشہ گہ دن میں آویزل رکھتے تھے اور تنہا اس وزیر کے گھر پہنچے اور دروازے کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ حالانکہ اس نے بطریق شاہانہ بڑے تکلف کے ساتھ فرش آراستہ کیے تھے اور شاہی انداز سے نشست کا انتظام کیا تھا۔ وزیر نے عرض کیا، یہاں تشریف رکھیے اور اونچی جگہ پر بیٹھیے۔ فرمایا شرط یہ طے پائی ہے کہ جہاں جی چاہے گا بیٹھیں گے۔ چنانچہ وہ شرط یاد کر کے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ جلدی کرو، وقت بہت کم ہے، چنانچہ دسترخوان پر نوع بنوع کھانے چنے گئے لیکن شیخ نے اپنی تھیلی سے روٹی کے چند ٹکڑے نکالے اور کھانے لگے۔ وزیر نے بہت خوشامد کی کہ ان کھانوں میں سے بھی کچھ چکھیے۔ فرمایا، شرط یہ تھی کہ جو مرضی ہوگی، کھائیں گے۔ اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا، شرط یہ تھی کہ جب چاہیں گے، آجائیں گے پھر السلام علیکم کہہ کر محل سے باہر نکل گئے۔

حلال ذریعے کی کمائی ضائع نہیں جاتی۔

شیخ علی متقی جہاں بہت بڑے عالم و فقیہ تھے وہاں تقویٰ و صالحیت میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ فرمایا کرتے، حلال کے ذریعے جو چیز کمائی جائے وہ کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اگر ایسی چیز کم بھی ہو جائے تو دوبارہ مل جاتی ہے۔

اس سلسلے میں وہ خود اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم چند آدمی سمندر کے سفر میں کشتی پر سوار تھے، اچانک سمندر میں طوفانی لہریں اٹھیں اور کشتی پاش پاش ہو گئی۔ ہم میں کے کئی آدمی ایک ایک تختے کے سہارے ساحل پر پہنچے۔ ہمارے پاس کتابیں بھی تھیں جو بالکل بھیک گئی تھیں۔ سمندر سے باہر نکلنے کے بعد ہم لوگ پیدل سفر کر رہے تھے اور یہ عرب کی سرزمین تھی۔ پیدل سفر کی وجہ سے ان کتابوں کو ساتھ لے جانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک گڑھا کھودا، اس میں کتابیں دفن کیں، اس پر ایک علامت قائم کی اور مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں سخت پیاس لگی مگر عرب کے صحرا میں پانی کا امین نام و نشان نہ تھا۔ رفقائے سفر نے شدت پیاس سے مجبور ہو کر کہا، اب وقت دعا ہے۔ میں نے کہا میں اللہ سے دعا کرتا ہوں، آپ آمین کہتے جائیے۔ چنانچہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اتنا پانی برساکہ ہم سب نے خوب جی بھر کر پیا اور اپنے مشیکرے بھی بھر لیے۔ چند روز بعد مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ کعبۃ اللہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ اس اثنا میں چند دیہاتی عرب آئے اور انھوں نے ہم سے کہا، ہمارے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ اگر آپ خریدنا چاہیں تو حاضر ہیں۔ ہم نے دیکھا تو وہی کتابیں تھیں جنھیں ہم جنگل میں دفن کر آئے تھے۔ ہم نے وہ کتابیں خرید لیں۔ بھیک کر سوکھنے کی وجہ سے ان کے اوراق ایک دوسرے سے چپک گئے تھے ہم نے ان کو پانی لگا کر اس طرح الگ الگ کیا کہ ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا اور وہ سب دوبارہ قابل استفادہ ہو گئیں۔

سلطان محمود گجراتی کی عقیدت،

والی گجرات سلطان محمود، شیخ علی متقی کا بہت عقیدت مند تھا اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ غیہ مسنون لباس زیب تن کرتا تھا، اس لیے شیخ اس کی طرف نظر التفات اور عنانِ توبہ مبذول نہ فرماتے تھے۔ ایک روز وہ علی کا سالباں بہن کر آیا تو شیخ نے اس کو رضا مندی کی نگاہ سے دیکھا۔ اس سے سلطان بہت خوش ہوا، اور اپنے مکان پر تشریف لے جانے کی درخواست کی تاکہ اس کے سب اہل خانہ شیخ کے نقش قدم پر چلیں اور ان کے فرمان پر عمل پیرا ہوں۔

منقول ہے کہ سلطان محمود پانی پینے میں بہت شکی مزاج تھا اور دیکھو دیکھو کر گلاس لبوں سے لگانا اور گھونٹے حلق سے نیچے آتا تھا۔ شک کی یہ کیفیت اس کے دل سے کبھی نہ تھی۔

شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو انھوں نے پانی سے جبراً ہوا ایک طشت منگایا، اس میں اپنی ٹوپی دھونی اور پانی پھینک دیا۔ یہ عمل انھوں نے تین مرتبہ کیا، چوتھی مرتبہ اس طشت میں صاف و شفاف پانی جھروا کر سلطان سے فرمایا۔

بابا محمود! اس آجے است کہ در شریعت مطہرہ پاک و لطیف است، و شک کہ دن درین معنی از دوسوا است، و دوسوا کا شیدطان است۔ اس آب را بخوردید و بیچ شبہ را بخورد را ندہید۔^{۵۹۱}

بابا محمود! شریعتِ مطہرہ کی رو سے یہ پانی پاک و صاف ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک کرنا دوسوا اس ہے اور دوسوا شیطانی کام ہے۔ پانی پی لو اور کوئی دوسوہ دل میں نہ لاؤ۔

چنانچہ سلطان محمود نے وہ پانی پیا اور اس کے پیتے ہی سلطان کے دل سے دوسوے اور شک کی بیماری دور ہو گئی۔

فقہائے ہند جلد سوم

شیخ جب دوسری مرتبہ مکہ مکرمہ سے وارد ہند ہوئے تو گجرات میں سکونت اختیار کی۔ ان دنوں گجرات کا فرماں روا سلطان محمود شاہ تھا، جو شیخ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ شیخ نے اس کو شریعت پر عمل پیرا ہونے اور ملک میں احکامِ شرع کے نفاذ کی تلقین کی۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام وزراء و امرا کے نام حکم جاری کر دیا کہ خلافِ شرع رسوم و عوائد کو ختم کر دیا جائے اور مملکت میں حدودِ شرعی کی تنفیذ کی جائے۔

مکہ مکرمہ میں

شیخ طویل عرصہ تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے اور ان کی وفات بھی اسی ارضِ پاک میں ہوئی۔ شعرانی طبقاتِ کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ ۹۴۷ھ میں مکہ مکرمہ میں شیخ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ میں ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ بھی میرے ہاں آتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ورع و تقویٰ اور زہد و عبادت کے زیور سے آراستہ عالم دین تھے۔ کم خوری بلکہ جھوک کی وجہ سے اس درجہ نحیف البدن تھے کہ جسم پر چند اوقیہ سے زیادہ گوشت نظر نہ آتا تھا۔ خاموشی اور عزت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ صرف نماز جمعہ کے لیے گھر سے نکلتے اور حرم میں آتے۔ بیت اللہ کے ایک کونے میں آ کر بیٹھ جاتے اور نماز سے فارغ ہو کر تیزی سے باہر نکل جاتے۔

شعرانی مزید لکھتے ہیں: میں ان کے گھر گیا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ فخرائے صادقین کی ایک جماعت بیٹھی ہے۔ ان میں سے کوئی قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے، کوئی مطالعہ کتب میں مصروف ہے، کوئی متوجہ الی اللہ ہو کر عبادتِ الہی میں مستغرق ہے اور کوئی ذکر و مراقبہ کی کیفیت میں ہے۔ مکہ مکرمہ میں وہ اپنی نوعیت کی واحد مجالس تھی، جس سے میں بے حد متاثر ہوا۔

قیامِ مکہ کے دوران میں شیخ کی شہرت علمی اور ادائے عبادت و زہد و دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ نزدیکی کے عثمانی حکمران سلطان سلیمان کی بھی اس کا علم ہوا۔ بڑا شجاع اور نیک خواہ بادشاہ تھا۔ وہ ان کے گونا گوں اوصاف سے مطلع ہوا تو اس کے دل میں ان کی قدر و منزلت نے کروٹ لی، اور اس نے ایک مکتوب کے ذریعے

ان سے دعائے خیر کی التجا کی -
علمی تصنیفی خدمات

شیخ علی متقی کی علمی اور تصنیفی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ یا تو مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے یا عبادت اور ذکرِ الہی میں اپنا وقت صرف کرتے۔ وہ قلیل النوم، قلیل الطعام اور قلیل الکلام بزرگ تھے۔ ہمہ وقت لکھنے پڑھنے میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان کی جسمانی حالت اس درجہ کمزور ہو گئی تھی کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہو کر رہ گئے تھے۔ مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کی تصنیفات کی تعداد دنوں سے اوپر ہے، جن میں سے اہم اور مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱۔ نشئون المنزلات: یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس میں انھوں نے مستند اور مسلمہ حوالوں سے مختلف آیات قرآنی کے شان نزول اور محل نزول کا تذکرہ کیا ہے نیز بعض الفاظ و آیات کی نحوی اور لسانی نقطہ نظر سے وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب آیت بہ آیت پورے قرآن مجید کی تفسیر نہیں ہے، بلکہ صرف ان آیات کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے، جو صرف و نحو، بیان و معانی اور سبب نزول کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں اور جن کے مطالب کی وضاحت ان کے نزدیک ضروری تھی۔

۲۔ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال: اہل علم میں شیخ علی متقی کی یہ ایک نہایت مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب کس طرح معرض تصنیف میں آئی، اس کو گھنٹا ضروری ہے۔ امام سیوطی نے ایک کتاب مرتب کی، جس کا نام جمع الجوامع رکھا۔ یہ کتاب احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی ترتیب یہ رکھی تھی کہ تمام قولی احادیث، حدیث کے پہلے لفظ کے اعتبار سے اور فعلی احادیث، راویوں کے نام کے اعتبار سے مرتب کی گئی تھیں۔ یہ کتاب بہت ضخیم ہو گئی تھی، چنانچہ سیوطی نے الجامع الصغیر کے نام سے اس کو منحصر کیا، جس میں افعال رسول اللہ کو چھوڑ دیا اور صرف مختصر اقوال رسول شامل کیے۔

شیخ علی منقہ نے جمع الجوامع کی تمام احادیث کو کتب فقہ کی ترتیب کے مطابق مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیا۔ سب سے پہلے جامع الصغیر کی احادیث مرتب کیں اور اس کا نام منہاج العمال فی سنن الاقوال رکھا۔ اس کے بعد جمع الجوامع کی بقیہ قولی احادیث کو اکمال منہاج العمال کے نام سے ترتیب دیا۔ پھر اپنے دونوں مجموعوں کو ایک کتاب کی شکل دی اور اس کو غایۃ العمال کے نام سے موسوم کیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ علی منقہ نے جمع الجوامع کی فعلی احادیث کو بھی ایک مجموعہ کی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام مستدرک الاقوال رکھا۔ بعد میں انھوں نے ان تینوں مجموعوں کو یکجا کر دیا اور اس کو کنز العمال کے نام سے موسوم فرمایا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ کنز العمال شیخ کی وہ کتاب ہے جو غایۃ العمال اور مستدرک الاقوال کا مجموعہ ہے، اور غایۃ العمال میں منہاج العمال فی سنن الاقوال اور اکمال منہاج العمال دونوں شامل ہیں۔

کنز العمال کی ترتیب یہ ہے کہ پوری کتاب چند حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصے کا نام کتاب رکھا ہے اور ان کو حرف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ پہلا حصہ یا کتاب غایۃ الکمال پر مشتمل ہے جو کسی ابواب میں منقسم ہے۔ دوسرے حصے یا کتاب کے تحت مستدرک کو شامل کیا گیا ہے۔ غایۃ العمال میں پہلے منہاج اور اس کے بعد اکمال کو شامل کیا ہے۔ یہ دونوں الگ الگ کتاب کے تحت نہیں بلکہ کتاب کے ذیلی ابواب کے تحت شامل کی گئی ہیں۔

کنز العمال، آٹھ جلدوں میں حیدرآباد دوکن (ہندوستان) میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی فہرست مضامین نہایت عمدہ اور آسان ہے۔ تمام احادیث پر نمبر لگائے گئے ہیں۔ اس میں مندرج احادیث کی تعداد ۱۸۰۶۷۱ ہے۔ حدیث کے مطالعہ اور حوالے کے لیے یہ بڑی مفید اور اہم کتاب ہے۔ شیخ علی منقہ کے استاد شیخ ابوالحسن بکری شافعی اس کتاب کے بارے میں کہا کرتے تھے :

للسیوطی منة علی العلمین وللمنقی منة علیہ۔

کہ امام سیوطی نے جمع الجوامع مرتب کر کے ساری دنیا پر احسان کیا اور علی متقی نے کنز العمال کے نام سے اس کو دوبارہ ترتیب دے کر خود سیوطی پر احسان کیا ہے۔

۳۔ تلخیص البدیان فی علامات مہدی: آخر الزمان: یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے اور ان احادیث کا مجموعہ ہے جو مہدی منتظر کے بارے میں مروی ہیں۔ اس کی تالیف سید محمد جون پوری (متوفی ۹۱۰ھ) کے معتقدین کو راہ ہدایت دکھانے ہے، اس لیے کہ سید محمد جون پوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ ان کی کوئی خاص تصنیف نہیں ہے بلکہ امام سیوطی کی عرف الوردی فی اخبار المہدی کی تلخیص ہے۔ سیوطی نے اس کو باقاعدہ مرتب اور ابواب میں تقسیم نہیں کیا تھا، شیخ علی متقی نے اس کو تراجم ابواب میں مرتب کر دیا ہے۔ نیز اس میں سیوطی کی جمع الجوامع اور عقدا الدردی فی اخبار المہدی المنتظر سے بھی بعض احادیث شامل کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ کتاب میں شیخ علی متقی نے یہ وضاحت کی ہے کہ سید محمد جون پوری مہدی نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی متقی، سید محمد جون پوری کو دلی تو مانتے تھے، مگر ساتھ ہی انھوں نے بہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ بعض اوقات ولی بھی مرتکبِ خطا ہو جاتا ہے۔ مبرہ عن الخطا ہونا صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے اس مجموعے میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت احادیث مرتب کی گئی ہیں:

کراماتِ مہدی

اس کا سلسلہ نسب

حلیہ

ظہور مہدی سے قبل کے حالات

علاماتِ مہدی

مہدی کی بیعت کس طرح کی جائے گی

معاوینِ مہدی

فتوحاتِ مہدی

حضرت عیسیٰ سے مہدی کی ملاقات

مہدی کے قیام کی مدت

وفات

مدعیانِ مہدویت کا ذکر

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علما کا فتویٰ -

۴۔ جوامع الکلم فی المواعظ الحکمہ: یہ کتاب اخلاقی نصح اور

متصوفانہ اقوال پر مشتمل ہے۔ اس میں کم و بیش تین ہزار نصح جمع کیے گئے ہیں،

جن میں سے پانچ سو اقتباسات قرآن مجید سے درج کیے گئے ہیں۔ پانچ سو احادیث

رسول اکرم سے ماخوذ ہیں اور ان کے ساتھ بطور تہیہ ہم معنی تشریحی فقرات بھی

مندرج ہیں۔ علاوہ ازیں تین سو اقوال ابو عطا اسکندری (متوفی ۷۰۹ھ) کے اور ایک

سو اقوال ان کے شاگرد کے ہیں۔ باقی حصہ تقریر میں کے اقوال کو محیط ہے۔

یہ تمام مواد مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق تقریباً النسی ابواب کے تحت حرف

تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث

ہے جو حافظہ، مفسر یا محدث ہیں۔ نیز تصوف سے بھی شغف رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں ہیں جن میں بعض تصوف و سلوک کے

موضوع سے متعلق ہیں اور بعض مختلف نال کے بارے میں بعض اہل علم کے جواب میں لکھی

گئی ہیں:

البرهان الجلی فی معرفۃ الوی - یہ کتاب فارسی زبان میں ہے

المواہب العلییۃ فی الجمع بین الحکم القوانینۃ و الحدیثیہ

العنوان فی سلوک النسوان

تبویب شرح الحکم العطائیۃ المسبھی بالتبیین

زاد الطالبین

اسرار العارفين

نعم المعیار والمقیاس لمعرفة هراتب الناس -

فتح الجواد

نظم الدرر

النهج الاتم فی توتیب الحکم

الوسیلة الفاخرة فی سلطه الدنیا والاخرة -

تلقین الطریق -

ایک رسالہ سید محمد جون پوری کے دعویٰ ہدویت کے ابطال میں ہے۔

تلامذہ

شیخ علی منقی کے تلامذہ و مسرتشدین کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ محمد بن طاہر پٹنی اور شیخ عبدالوہاب بن ولی اللہ خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ شیخ عبدالحق دہلوی اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی اسلامی ہند کے بہت بڑے عالم اور محدث و فقیہ تھے۔ یہ دونوں بزرگ متعدد کتابوں کے مصنف اور اپنے عصر کے عظیم انسان تھے۔ ساسی طرح شیخ عبدالوہاب بھی اپنے دور کے جلیل القدر بزرگ اور بہت سے اوصاف و کمالات کے حامل تھے۔

شیخ کے حالات و سوانح میں عبدالقادر بن احمد فاکہی نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جو

المقول النقی فی مناقب المنقی، کے نام سے موسوم ہے۔

وفات

شیخ علی منقی نے سن ۱۱۰۹ھ کی عمر یا ۱۱۰۸ھ کی عمر یا ۱۱۰۷ھ کی عمر میں وفات پائی۔ شیخ کی وفات ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۰۹ھ کو مکہ مکرمہ میں دس بجے صبح کو قبرستان معلما میں دفن کیے گئے۔

ان کی تاریخ قرآن مجید کے ان الفاظ سے نکلتی ہے۔ یعنی فخبہ تلہ

تلہ شذرات الذهب ج ۸ ص ۳۷۹۔ اخبار الاخیار، ص ۲۵۷ تا ۲۶۹۔

۱۷۵۔ مولانا عمر جامجموی

مولانا عمر بن ابو عمر جامجموی، حنفی المساک تھے۔ اپنے عصر کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ تمام عمر درس و تدریس اور افادۂ طلباء میں مصروف رہے۔ شیخ محمد بن ابوسعید حسینی ترمذی کا لیوی اور بہت سے علما و طلباء نے ان سے اخذِ علم کیا۔
دسویں صدی ہجری کی سرزمین ہند کے اس عالم و فقیہ کے حالات، افسوس ہے، اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔

ف

۱۷۶۔ شیخ فخر الدین اکبر آبادی

شیخ فخر الدین بن داؤد بن شیخ شاہ صدیقی اکبر آبادی، صالح عالم دین اور

- مرآتِ مکنری ص ۲۹۶۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۲۶۹ تا ۳۱۴۔ مفتاح التواریخ
ص ۱۷۷۔ ابجد العلوم ص ۸۹۵۔ ناثر الکرم، ج ۱، ص ۷۶ تا ۱۷۹۔ تاریخ
برہان پور، ص ۱۱۶ تا ۱۱۹۔ مرآت احمدی ص ۸۵ تا ۸۷۔ نزہۃ الخواطر،
ج ۴ ص ۲۳ تا ۲۴۔ رد کوثر، ص ۳۵۳ تا ۳۵۵۔ سبحة المرجان ص ۴۳۔
تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۶، ۱۴۷۔ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۴۶، ۴۷، ۴۸۔
معجم المؤلفین ج ۷ ص ۵۹، ج ۱۳ ص ۶۰۴۔ حدائق الحنفیہ ص ۳۸۲، ۳۸۳۔
اشحاف النبلاء ص ۳۲۶، ۳۲۷۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۹۹۔ کشف الظنون
ج ۲ ص ۱۵۱، ۱۵۲۔ الاعلام ج ۵ ص ۷۹، ۸۰۔ التواریخ ص ۳۱۴ تا ۳۱۶۔
اذکار ابراہیم ص ۴۰۲، ۴۰۳۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون۔ یادایام ص ۴۰۲۔
نزہۃ الخواطر، ج ۱ ص ۲۵۰۔

شیخ زمان تھے۔ ان کا شمار اُس دور کے زہاد و عباد و فقہاء اور بلند مرتبت علماء میں ہوتا تھا۔ شیخ حسام الدین متقی ملتانی اور شیخ اللہ داد بن صالح سرہندی سے تحصیل علوم کی۔ پھر بہار گئے، وہاں شیخ اللہ داد چندھو سی بہاری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذ فیض کیا۔ بعد ازاں اس دور کے مشہور بزرگ سید جن ملسوی سے مسلک ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ پھر اگرہ کا قصد فرمایا اور سید رفیع الدین محدث کے جوار میں سکونت اختیار کی۔

دیباچہ بند کے اس عالم و فقیہ نے ایک سو سینتالیس سال عمر پاکر جمعہ کے روز ۱۹ جمادی الاخریٰ ۹۷۰ھ کو اگرہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۱۷۷۔ شیخ فخر الدین جون پوری

شیخ فخر الدین بن کبیر الدین جون پوری، جون پور میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے عصر کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ عابد و زاہد اور عالم و فقیہ تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے بلکہ سلسلہ تصوف کے مشائخ میں سے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دس سال تک درس و تدریس اور افادہ طلباء میں مصروف رہے۔ پھر خدمت دین کے اس پہلو سے کنارہ کش ہو کر زہد و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ان سے فیض حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ۲۲ شعبان ۹۹۴ھ کو وفات پائی۔

۱۷۸۔ قاضی فضل اللہ دیوبندی

قاضی فضل اللہ دیوبند کے رہنے والے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔

۱۔ اذکار ابرار ص ۲۸۱ تا ۲۸۳ — نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۲۵۶

۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۲۵۷ بحوالہ گنج ارشدی

شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ دسویں صدی ہجری کے مشاہیر فقہائیں سے تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے معاصر تھے۔
انسوس ہے اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۱۷۹۔ مولانا فضل اللہ رشتہ کی

مولانا فضل اللہ درحقیقت ہندوستان کے علاقہ گجرات کے باشندے تھے۔ اپنے عصر کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ حنفی المسلاک تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے کسی زمانے میں ترک وطن کر کے گجرات سے نکلے تو اثنائے سفر میں مشرقی پنجاب کے شہر رشتہ کے مقام پر پہنچے۔ وہاں سے آگے نہ بڑھ سکے، مجبوراً وہیں بود و باش اختیار کرنا پڑی اور نسبت وطن کے اعتبار سے رشتہ کی مشہور ہوئے۔ اس تواج کے بے مثل عالم دین تھے۔ متوکل علی اللہ اور عبادت گزار تھے۔ ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتے۔ کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرتے۔ کہتے ہیں، ایک تاجران کے مریدوں میں سے تھا۔ ایک روز اس نے اپنا تمام اثاثہ اٹھایا اور شیخ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مگر انھوں نے قبول کرنے سے معذرت کر دی اور کسی شے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس ذی علم اور صاحب تصوف بزرگ نے دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں وفات پائی۔ اس سے زیادہ ان کے حالات کا علم ہو سکا ہے اور نہ ان کی علمی اور تدریسی سرگرمیوں کا پتا چیل سکا ہے۔

ق

۱۸۰۔ شیخ قاسم بن یوسف سندھی

شیخ قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن شہاب الدین شہابی سندھی، سرزمین

۱۷۹۰ء نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۵۹ بحوالہ لطائف قدوسی

۱۷۹۰ء اذکار ابرار، ص ۲۴۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۵۹

سندھ میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اسی نواح میں تحصیل علم کی۔ پھر ۹۵ھ میں سندھ سے گجرات گئے اور مختلف بلاد و اصرار میں گھومے پھرے۔ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ درس و تدریس اور افادۂ علما و طلبا ان کا مشغلہ تھا۔ ان سے خلقِ کثیر نے اخذِ علم کیا، جن میں عیسیٰ بن قاسم بھی شامل ہیں۔ وہ بعض کتابوں کے مصنف تھے، لیکن ان کتابوں کے ناموں کا علم نہیں ہو سکا۔ انھوں نے ۹۸۰ھ ہجری میں وفات پائی۔

۱۸۱۔ مولانا قاسم دیوان سندھی

مولانا قاسم دیوان سندھی، عظیم المرتبت عالم اور شیخ تھے۔ حنفی المسلك تھے اور ان کا شمار اس دور کے مشہور فقہاء میں ہوتا تھا۔ شیخ میران سندھی سے علم حاصل کیا۔ علم معانی و بیان کی معروف کتاب، مطول ان ہی سے پڑھی۔ بعد ازاں مزید تحصیل کے لیے ارضِ فارس کا قصد کیا۔ وہاں کے علما سے خوب استفادہ کیا۔ پھر اپنے وطن واپس آگئے اور درس و افادۂ طلباء کے لیے کمر ہمت باندھی۔ اپنے دور کے بہت بڑے مدرس اور عالم دین تھے۔ ان کی فراوانی علم و فضل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب سلطان محمود غزنوی حکومت سیوی پر مامور ہوا تو اس نے مولانا قاسم دیوان کو اپنی رفاقت کے لیے منتخب کیا، ان سے باقاعدہ قرآن مجید پڑھا اور بعض دیگر کتابوں کے لیے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مولانا مروح بھکر میں مقیم تھے اور وہاں اشاعتِ علم کرتے تھے۔

دسویں صدی ہجری کے جن علما و فقہاء کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ مولانا قاسم دیوان سندھی بھی ان ہی میں شامل ہیں۔ ان کا سالِ وفات ۹۷۷ھ ہے۔

۱۔ زیبۃ الخواطر، ج ۲، ص ۲۶۲ بحوالہ بحر زخار

۲۔ آثارِ حیمی، ج ۲، ص ۳۸۳۔ تاریخ معصومی، ص ۳۳۲۔ زیبۃ الخواطر، ج ۲، ص ۲۶۳

۱۸۲- قاضی قاضن بھکرہ سی سندھی

قاضی قاضن بن ابوسعید بن زین الدین بھکرہ، عالم و فقیہ اور شیخ و قاضی تھے۔ شہر بھکرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت و تجوید سیکھی۔ پھر حصول علم میں مشغول ہو گئے، اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، علوم عربیہ اور انشا وغیرہ میں مہارت پیدا کی، یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے دور کے جلیل القدر علما، عظیم المرتبت فقہاء اور مشہور شیوخ میں ہونے لگا۔ قاضی قاضن سفر و سیاحت کے بہت شائق تھے۔ حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں سے مختلف بلاد و امصار کی راہ لی اور متعدد مشائخ و علما سے ملاقات کی۔ ان کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے اور علم و ادراک کی نعمت حاصل کی۔ بعد ازاں واپس سندھ آئے تو والی سندھ مرزا شاہ حسین نے ان کو شہر بھکرہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ ایک عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر مدعی ہمدویت سید محمد جون پوری کے حلقہ متبعین میں داخل ہو گئے مگر علما نے اس پر ان کو مطمئن کروانا اور مرزا شاہ حسین نے انھیں عمدۂ قضا سے معزول کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق خود ہی کبرستی کی بنا پر اس منصب سے استعفی ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ان کے برادرِ صغیر قاضی نصر اللہ کو قاضی مقرر کر دیا گیا تھا۔

قاضی قاضن امرائے سندھ کے نزدیک انتہائی قابل احترام شخصیت تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ۱۱ محرم ۹۲۶ھ کو ٹھٹھہ کے مقام پر جام فیروز اور امیر شاہ بیگ کے درمیان جنگ ہوئی اور شاہی بیگ اس میں فتح یاب ہوا تو ۲۰ محرم تک اس کا لشکر ٹھٹھہ میں لوٹے مارا اور قتل و غارت کرتا رہا۔ اس اثنا میں بہت سے معزز گھڑوں کے اہل و عیال اسیر ہوئے۔ جام فیروز کے بیٹے بھی شہر میں رہ گئے تھے۔ چنانچہ شاہی بیگ کو اس کا پتا چلا تو اس نے چند ممتاز لوگوں کو جام فیروز کی حویلی پر ان کی حفاظت کے لیے نامور کیا اور ان کی بدرجہ غایت عزت کی اور ان کی حفاظت کا اہتمام کیا۔

شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا جو بازار گرم تھا، وہ اس وقت کے جید عالم اور معروف فاضل قاضی قاضن کی کوشش سے سرد ہوا۔ خود قاضی موصوف کے اہل و عیال کو بھی گرفتار کر کے زنداں میں ڈال دیا گیا تھا اور یہ ان کی تلاش کے لیے شہر ٹھٹھہ کے گلی کوچوں میں دیوانوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔ لیکن جب وہ ان کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو ایک خط میں ٹھٹھہ کی حالت زار کا نقشہ کھینچا۔ یہ خط حافظ محمد شریف امام نے شاہی بیگ کو پیش کیا، وہ اس سے بہت متاثر ہوا، اور اس نے منادی کرا دی کہ آئندہ ٹھٹھہ کے مال و اسباب کو کوئی شخص ہاتھ نہ لگاتے اور نہ کسی کو قتل کرے۔ اس کے بعد اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر قاضی کے حوالے کیا اور اپنے آدمی ان کے ساتھ بھیج کر حکم دیا کہ جس شخص کی طرف یہ اشارہ کریں، اسے ان کے حوالے کر دیا جائے۔

شاہی بیگ ان کی اس درجہ نگریم کرتا اور ان پر اعتماد کرنا تھا کہ اس نے ایک موقع پر ان کو دریا خاں کے بیٹے محمود کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے وعظ و نصیحت کے ذریعے اس کی مخالفت سے روکیں، لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے ان سے ملنا تک گوارا نہ کیا۔ قاضی قاضن نے ۹۵۸ھ میں وفات پائی۔

ک

۱۸۳۰- شیخ کبیر الدین جون پوری

شیخ کبیر الدین بن جہاں گیہ جون پوری، صالح عالم دین اور مشہور مشائخ میں

۳۵ تاریخ معصومی ۱۵۵، ۱۵۶، تحفۃ الکرام ص ۱۷۵۔ آثار حیدری ج ۲ ص ۲۹۱

۳۶ تاریخ معصومی ص ۱۵۹

۳۷ تاریخ معصومی ص ۲۷۶، ۲۷۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۶، ۱۶۷۔ نزہۃ الخوا

ج ۴ ص ۲۶۶، ۲۶۷۔ تحفۃ الکرام ص ۲۳۳۔ اذکار ایران ص ۲۷۵

سے تھے۔ فقہ اور تصوف میں یگانہ روزگار، پیکر زبد و قناعت اور مجسمہ ایثار و توکل تھے۔ ابھی بارہ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ والدِ مکرم انتقال کر گئے۔ ان کے بعد حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوئے اور فضل و کمال میں مرتبہ بلند تک پہنچے۔ یہاں تک کہ جون پور کی مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔

۶۳
شیخ کبیر الدین سے بہت سے نملہ و شائع نے کسبِ فیض اور اخذِ علم کیا۔ تریپٹھ
سال عمر پاکر ۲۸ شعبان ۹۶۲ھ کو اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھائے۔

۱۸۴۔ مولانا کریم الدین سندھی

مولانا کریم الدین سندھی، دسویں صدی ہجری کے علاقہ سندھ کے عالم و فاضل اور شیخ تھے جنفی المساک تھے اور ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے۔ فقہ و اصول، منطق و حکمت اور نحو و لغت میں مہارت رکھتے تھے اور اپنے دور کے نامور علما میں سے تھے۔ ورع و تقویٰ میں بھی عظیم المثال تھے۔ تمام عمر درس و تدریس اور تالیف طلباء میں مصروف رہے۔

م

۱۸۵۔ شیخ مبارک بنارسی

شیخ مبارک بن ارنانی عمری بنارسی، اپنے دور کے عالم و فاضل اور محدث تھے۔ ان کا اصل وطن مشرقی پنجاب کا شہر بہتک تھا، وہاں سے ان کے آبا اجداد بنارس منتقل ہو گئے تھے، اور اس کے جنوب میں ایک قریہ میں سکونت اختیار

۱۔ نزہۃ الخواصر ج ۴ ص ۲۷۳ بحوالہ گنج ارشدی۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۶۶۹۔

۲۔ تاریخ معصومی ص ۲۹۸۔ تحفۃ الکرام ص ۶۰۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷۴۔

نزہۃ الخواصر ج ۴ ص ۲۷۴۔

کر لی تھی، جس کا نام بکھرہ تھا۔ شیرشاہ سنوری اور اس کے بیٹے سلیم شاہ سنوری کے عہد میں یہ عرصہ تک مسند وزارت پر فائز رہے۔ علم حدیث میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ماہِ رجب ۹۵۲ھ میں مدارج الاخبار کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، جو حدیث کے بارے میں ہے۔ اس میں انھوں نے شیخ حسن صفحانی لاہوری کی مشہور کتاب مشارق الانوار کی احادیث کو مصابیح کے انداز سے ترتیب دیا۔ شیخ مبارک بنارسی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ انھوں نے ۹۸۰ھ میں وفات پائی۔

۱۸۶۔ قاضی مبارک گوپاموی

قاضی مبارک بن شہاب الدین بن علاء الدین عمری گوپاموی، شیخ مبارک ناصحی بلنچی کی اولاد سے تھے۔ گوپامو میں پیدا ہوئے اور وہیں علم و تصوف کی گود میں تربیت پائی۔ شیخ نظام الدین امیٹھوی سے علم حاصل کیا اور عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ ان کی نیکی اور حصولِ علم میں غربت کی بنا پر شیخ ان سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اپنے عصر کے عالم اور فقیہ تھے۔ سونی اور صاحبِ طہقت بھی تھے۔ گوپامو کے منصبِ قضا پر متعین تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم دین تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبدالوہاب بن ابو الفتح اکبر آبادی اور شیخ محی الدین حسینی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ جلیل القدر عالم و فقیہ تھے جو تمام عمر مسندِ قضا پر فائز رہے اور زندگی کے آخری لمحے تک طلباء کو درس دیتے رہے۔

۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴ ص ۲۷۷، ۲۷۸ بحوالہ گنج ارشدی۔

۲۔ منتخب التواریخ ۳۲۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۴۔ نزہۃ الخواطر

ج ۴، ص ۲۷۹۔

۸۷۔ شیخ مبارک جھنجھانوی

شیخ مبارک بن عبدالمقتر بن فاضل علوی جھنجھانوی ثم جون پوری اپنے زمانے کے فقیہ تھے اور علم و فضل اور زہد و طریقت کی دولت سے مالا مال تھے۔ چونکہ تھوڑے میں مقام عالی پر فائز تھے، اس لیے بالادست کے لقب سے معروف تھے یعنی شیخ مبارک بالادست۔ شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی کے بھتیجے اور رضائی بھائی تھے شیخ علی بن قوام الدین شطاری جون پوری سے علم طریقت حاصل کیا اور طویل عرصہ تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے، اس لیے جون پوری کہلائے۔ اس عالم و فقیہ کی زادبوم بھلی جھنجھانہ ہے اور خواب گاہ بھی وہیں ہے۔

۱۸۸۔ شیخ مبارک سندھی

شیخ مبارک بن ابوالمبارک پاتری سندھی، علاقہ سندھ کے ایک مقام موضع پاتری میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ شیخ عباس بن جلال سندھی کے سامنے آئے تلمذ تہ کیا اور طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ فقہ، اصول کلام اور علوم عربیہ میں جہارت حاصل کی۔ بعد ازاں نوشتہ تقدیر نے احمدآباد میں لاٹوالا۔ وہاں ناصر الملک کی مسجد میں سکونت پزیر ہوئے اور عرصہ تک مسند تدریس پر فائز رہے۔ پھر برہان پور تشریف لے گئے اور قصبہ چوڑے کے منصب قضایہ منتعین ہوئے کئی سال یہ عہدہ ان کے سپرد رہا۔ ان دنوں صوبہ برار کا وزیر اعظم تھیں خاں تھا۔ اس کے بیٹے پر ایلیچ پور کا قصبہ کیا۔ تذاول زمان ان کا بہت مداح تھا اور بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے ان کو ایلیچ پور کی مسند تدریس پیش کی، جس پر خالص عرصہ متمکن رہے پھر عازم علاقہ گجرات ہوئے۔ وہاں شیخ لشکر محرفارغ سے اخذ طریقت کیا، وہاں سے

دوبارہ برہان پور گئے۔ اپنے وقت کے عالم و فاضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ خوف الہی سے ہر آن آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ شب و روز بے داری میں کھٹتے اور سرفوت اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ بے دار رہنے سے یوں سمجھیے کہ ان کے نزدیک شب ہم رنگ دن ہو گئی تھی۔ ان کے اور شیخ طاہر بن یوسف سندھی کے درمیان گہری اور پکی دوستی تھی۔

شیخ مبارک سندھی کے حلقہ تلامذہ میں اس زمانے کی مشہور علمی شخصیتوں کے نام تذکرہ میں مرقوم ہیں، جن میں شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کا اسم گرامی بھی موجود ہے۔ یہ ان کے برہان پور کے دور قیام کے نمبرز ہیں۔ انھوں نے ان سے علوم مرویہ کی تحصیل کی۔ شیخ مبارک نے ۹۷۸ھ کو جمعہ کے روز وفات پائی اور شیخ ابراہیم بن عمر سندھی کے حلیہ میں مدفون ہوئے۔

۱۸۹۔ شیخ مبارک الوری

شیخ مبارک بن ابوالمبارک الوری حنفی المسلك تھے اور دسویں صدی ہجری کے دیار ہند کے نامور عالم و فقیہ تھے۔ زہد و صلاح کے زیور سے آراستہ تھے۔ منقول ہے کہ وہ اولادِ نبوی ہاشم سے تھے۔ اسی وجہ سے افغانوں میں انھیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود سلطان سلیم شاہ سویری ان کی مجلس میں حاضر ہوا، ان سے دعا و برکت حاصل کرنا اور اپنے ہاتھوں سے ان کی جو تیاں ان کے سامنے لکھنا تھا اور احتراماً انھیں شاہ مبارک کہا کرتا تھا۔

افغانوں نے نزدیک شیخ مبارک الوری کی عزت و توقیر کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب شیخ سلیم بن بہار الدین حشتی سیکروی، افغانوں کے ہاتھوں مبتلائے آلام ہوئے اور انھیں زنجبورو کے قلعہ میں محبوس کیا گیا تو انھوں نے شیخ سلیم کی سفارش

کی جس کے نتیجے میں انھیں قیام سے رہائی حاصل ہوئی اور وہ دوبارہ عازم مکہ مکرمہ ہوئے۔
 علامہ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے
 کہ انھوں نے ۹۸۷ھ میں ان کو دیکھا تھا۔ ان کی صحیح تاریخ وفات کا تو علم نہیں
 ہو سکا، مگر بقول بدایونی کے وہ لوگ ۷۰ سال عمر پا کر تقریباً اسی زمانے میں فوت ہوئے
 جس زمانے میں ان کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ۵

۱۹۰۔ شیخ محب اللہ سدھوری

شیخ محب اللہ کا سلسلہ نسب یہ ہے: محب اللہ بن خواجگی بن خیر الدین بن علی بن
 نظام الدین انصاری ہروی۔ ثم ہند بن سدھوری۔ ان کے اسلاف دراصل ایران
 کے شہر ہرات کے باشندے تھے اور وہاں سے وارد ہند ہوئے تھے۔ یہاں آکر انھوں
 نے علاقہ اودھ کے ایک بڑے قریب سدھوری میں سکونت اختیار کی۔ شیخ محب اللہ کی ولادت
 اسی گاؤں میں ہوئی۔ انھوں نے ہمیں پرورش پائی اور اپنے والد سے تحصیل علم کی۔
 ان کے والد مولانا خواجگی اپنے عصر کے معروف عالم دین تھے۔ یہ طویل عرصہ تک ان سے
 وابستہ رہے اور ان سے خوب فیض حاصل کیا۔ مولانا خواجگی تصوف و طریقت سے
 بھی بہرہ ور تھے، شیخ محب اللہ کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور یہ علم بھی ان سے
 اخذ کیا۔ والد کی وفات کے بعد ان کی جگہ مستند مشیخت پر فائز ہوئے۔ شیخ محب اللہ
 سدھوری اپنے علاقے کے مسلمہ اور مشاہیر فقہاء میں سے تھے۔ ان سے خلق کثیر نے
 استفادہ کیا۔ ۵

۱۹۱۔ علامہ محمد بن احمد فاکی

علامہ محمد بن احمد بن علی فاکی کی کنیت ابو السعادات تھی، اور یہ ابو السعادات

۵ منتخب التواریخ ص ۳۱۶، ۳۱۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۲۸۱

۶ نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۲۸۲

گجراتی کے نام سے معروف تھے۔ بہت بڑے عالم اور شیخ وقت تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنبلی تھے۔ عبد القادر حضرمی نے النور السافر میں انھیں کبار علما میں سے گردانا ہے۔

علامہ محمد بن احمد ۹۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور مذاہب اربعہ کے مسائل و احکام کی تمام کتابیں دقت نظر سے پڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علوم مروجہ پر انھیں پوری دسترس حاصل تھی۔ ان کے شیوخ میں اکابر علما اور مشاہیر وقت محققین شامل ہیں، جن میں علامہ ابوالحسن بکری، شیخ ابن حجر عسقلانی اور شیخ محمد بن خطاب کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔ انھوں نے مکہ مکرمہ، حضرموت اور زبید وغیرہ کے اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ کتنے ہیں جن اہل علم کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ نہ کیا اور سند و اجازہ سے بہرہ ور ہوئے، ان کی تعداد نوٹس سے زائد ہے۔ انھوں نے باقاعدہ اساتذہ سے اتنی کتابیں پڑھیں کہ ان کو حیضہ شمار میں لانا ناممکن ہے۔ جو کتابیں حفظ یاد کیں، ان میں اربعین نوویہ، عقائد نسفیہ، فقہ حنبلی کی المقنع، اصول فقہ کی جمع الجوامع، علم نحو کی الفیہ ابن مالک، معانی و بیان کی تانحیص المفتاح، فن قرأت کی الشاطبہ اور سیر و تاریخ سے متعلق ابن سید الناس کی نور العیون، شامل ہیں۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ اور قرأت سببہ کے ساتھ تجوید سے پڑھتے تھے۔

علامہ موصوف، بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے کئی عمدہ رسائل تصنیف کیے، جن میں ایک آیتہ الکرسی کے متعلق ہے۔ اس میں انھوں نے آیتہ الکرسی کے متعلق بعض نہایت مفید نکات بیان کیے ہیں۔ ایک کتاب فقہ شافعی کے موضوع پر ہے، جس کا نام نور الابصار ہے۔ یہ کتاب مختصر الانوار کی شرح ہے۔ ایک رسالہ لغت کے بارے میں ہے۔ ایک بڑی اہم کتاب سلاطین کے متعلق ہے۔

بہت خوش مزاج اور حاضر جواب عالم تھے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ میں ذرا کی ایک مجالس میں بیٹھا تھا کہ استفہام انکاری کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔

ایک اہل علم نے اس کی مثال دیتے ہوئے بطور طنز و تعریض کے میری طرف اشارہ کر کے یہ آیت پڑھی :

أَتَا مُرُونَ النَّاسَ بِالْبُرِّ وَتَنْسُونَ أَنفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ
أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۞

میں اس کی تعریض کو فوراً سمجھ گیا اور جلدی سے اس کو مخاطب کر کے یہ آیت پڑھی اور کہا، استفہام انکاری یہ ہے۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَصْلَلَهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمِهِ وَخَتَمَ عَلَىٰ
سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ
أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۞

یہ آیت من کروہ صاحب بڑے شرمندہ ہوئے۔

صاحب النور السافر عبدالقادر حضرمی کہتے ہیں، شیخ محمد بن احمد کو میرے والد شیخ الاسلام کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ وہ بہت فرخ دست اور سخی تھے کچھ لوگوں کا کہنا ہے، کوئی شخص ان سے زیادہ سخی نہ تھا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ جو عالم سرزمین عرب یا کسی اور ملک سے آتا، اس کی ہر ممکن طور پر امداد کرتے اور کوئی شے اس سے چھپا کر نہ رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت متروض رہتے تھے۔

۷۵ سورہ البقرہ آیت ۴۴ - ترجمہ : یہ کیا بات ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہو، حال آنکہ تم (اللہ کی) کتاب بھی پڑھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

۷۶ سورۃ الحجاثیہ - آیت نمبر ۳۳ - ترجمہ : بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے تو) خدا نے (بھی) اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اب خدا کے سوا کون اس کو راہ ہدایت پر لا سکتا ہے۔ بھلا تم کیوں نصیحت نہیں کر پڑتے؟

دوسروں کی امداد کے لیے لوگوں سے اس محنت و سماجت سے قرض لیتے کہ ان کے بعض رفقا اسے تعلق سے تعبیر کرتے۔

وہ پہلی مرتبہ ہندوستان آئے تو مدتِ مدید تک یہاں رہے پھر ۵۹۵ھ میں اپنے وطن مالوف مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ اس سال حج کیا۔ دوسرے سال بھی یہ سعادت حاصل کی اور ۶۰۶ھ میں واپس ہندوستان آئے۔ پھر زندگی کی آخری سانس تک یہیں اقامت گزریں رہے۔

ان کے فاضل تلمیذ شیخ عبدالمطیف الدبیر نے ان کی مدح میں یہ قصیدہ کہا:

يا علامۃ الدنيا ويا عالم غدا	يقصر عن غاياته في العلو البدر
ومن لاح مثل الصبح فضل كماله	فضاء به الاقطار وافتخر العصر
ويا ايها البحر الخضم لعنمد	وبالرفق للطلاب يا ايها البر
وفاكهة الدنيا ينهاه ذا الهنا	وجمع علوم فاح من طيبها النشر
اب لسعادات واصل محامد	فمن امه بالنجح ال كذا اليسر
تباهت له كجرات لما ثوى بها	فان فخرت يوما يحق لها الفخر

ترجمہ: اے وہ شخص جو موجودہ حالات کو کبھی جانتا ہے اور مستقبل سے بھی باخبر ہے اور وہ جس کی بلندیوں کو پانے سے چاند بھی قاصر ہے۔

اور وہ جس کا فضل و کمال سپیدہ صبح کی طرح روشن ہوا، اقطارِ عالم اس سے چمک اٹھتا ہے اور زمانہ اس پر ناز کرتا ہے۔

اے علم کے بحرِ فیاض اور اے طالبانِ علم کے لیے حسن سلوک کے بر عظیم۔

وہ دنیا کا ایسا پھل ہے جو اپنی خوش گواری میں انہما کو پہنچا ہوا ہے، اس کے جمع

علم کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

وہ سخاوتوں کی اساس اور فضائل و مناقب کی جڑ ہے، جو شخص حصولِ کامرانی

کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو لیسر و کامرانی اس کی طرف چل پڑتی ہے۔

گجرات اس پر نازاں ہے کیوں کہ وہ اس کی آرام گاہ ہے اور اگر وہ اس پر

فقہائے ہند جلد سوم

ناز کرے تو یہ نازا سے زیب دیتا ہے۔

شیخ محمد بن احمد فاکہی نے جمعہ کے روز ۲۱ جمادی الاولیٰ ۹۹۲ھ کو شہر احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے یہ

۱۹۲۔ شیخ محمد بن احمد نہروالی

شیخ محمد بن احمد بن محمد بن محمود نہروالی۔ ان کا لقب قطب الدین اور والد کا علامہ الدین تھا اور چوں کہ یہ اپنے زمانے کے مفتی تھے، اس لیے مفتی قطب الدین بن علامہ الدین مکی کے نام سے معروف تھے۔ علامہ دوران اور محدثت زمان تھے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور انشا و شعر کے ماہر علما میں سے تھے۔ فقہی مسلک کی رو سے حنفی تھے۔

شیخ محمد بن احمد، ۹۱۷ھ کو لاہور میں پیدا ہوئے اور عمر کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے والد مکرم شیخ احمد لقب بہ علامہ الدین سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ وہاں خطیب معمر احمد صاحب الدین بن ابوالقاسم محمد العقیلی نویری مکی، محدث یمن وجید الدین عبدالرحمن بن علی دیب شیبانی زبیری، شیخ شہاب الدین احمد بن مویز بن عبدالغفار مغربی مصری نزہیل حرینی، شیخ محمد بن محمد بن عبدالرحمن خطاب مکی، دوران کے والد شیخ محمد بن عبدالرحمن سے مختلف علوم مرویہ کی تحصیل کی۔ ۹۳۳ھ کو عازم مصر ہوئے، وہاں ابو عبداللہ محمد بن یعقوب عباسی متوکل علی اللہ (متوفی ۹۵۰ھ) سے ملے مصر، اس زمانے میں مرکز علمائے عظام اور منبع فضلائے فخرام تھا۔ وہاں اپنے درجے کے مشائخ میں بھی موجود تھے، جن کے رشد و ہدایت کی رات پورا ملک بفقہ نورینا ہوا تھا۔

شیخ قطب الدین محمد بن احمد کو تصویف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے

میں وہ شیخ علاء الدین کرمانی نقشبندی (توفی ۹۳۹ھ) سے غالباً سفرِ مصر سے قبل مستفیض ہوئے۔ شیخ محمد نروالی کو یہ شرف حاصل تھا کہ اپنے زمانے میں ان کی صحیح بخاری کی سند ساری دنیا میں عالی تھی۔ وہ اس طرح کہ انھوں نے اپنے والد شیخ علاء الدین احمد بن محمد نروالی سے، انھوں نے حافظ نور الدین ابو الفتح احمد بن عبداللہ طاؤسی شیرازی سے، انھوں نے شیخ معمر بابا یوسف ہروی سے، انھوں نے محمد بن شایخت فارسی فرغانی سے، انھوں نے شیخ ابولقمان یحییٰ بن عماد بن مقبل بن شاہان ختلانی سے سماعت کی، انھوں نے محمد بن یوسف فربری سے اور انھوں نے امام عالی مقام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری سے روایت کی۔ ایک روایت کے مطابق شیخ قطب الدین محمد نروالی نے اپنے والد شیخ علاء الدین احمد بن محمد کے واسطے کے بغیر براہِ راست حافظ نور الدین ابو الفتح طاؤسی سے بھی صحیح بخاری کی روایت کی ہے۔ شیخ محمد نہایت فصیح و بلیغ شخص تھے اور عربی کے بلند پایہ ادیب تھے۔ ترکی کے عثمانی حکمران اور عام ترک ان کی بے حد تکریم کرتے تھے، وہ حج کو جاتے تو رسوم حج کی ادائیگی میں ان ہی سے رہنمائی حاصل کرتے اور اس باب میں کسی دوسرے عالم کو قابلِ اعتنا قرار نہ دیتے۔ ترک حجاج ان کی مالی امداد بھی دل کھول کر کرتے، ان سے انھیں جو رقم وصول ہوتی، اس سے یا تو کتابیں خریدتے، یا پھر محتاجوں اور مستحق افراد کو دے دیتے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح میں ان کے احترام کا یہ عالم تھا کہ جہر نکل جاتے، علما و ادبا کی جماعت ان کے ساتھ ہوتی۔

شیخ قطب الدین محمد بن احمد نے اپنی کتاب تاریخ مکہ میں خود اپنے حالات میں لکھا ہے کہ والی گجرات سلطان احمد شاہ نے مکہ مکرمہ میں حرمِ محترم کے قریب جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا۔ ممکن ہے، ان کے والد شیخ علاء الدین احمد بن محمد نے ان کو حجاز بھیجا ہو اور والد کی وفات کے بعد اس کی تولیت خود شیخ قطب الدین محمد بن احمد کے سپرد ہو گئی ہو۔

انھوں نے دو مرتبہ قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ ایک مرتبہ وہ ۹۶۵ھ میں قسطنطنیہ

گئے، جب عثمانی حکمران سلطان سلیمان بن سلیم نے انہیں خلعت عطا کی سلطان نکو نے مکہ مکرمہ میں مدارس قائم کیے تو شام کے اوقاف سے ان مدارس کے مدرسین، طلباء، خدام، بواب اور فراش کے لیے وظائف مقرر کیے۔ شیخ قطب الدین محمد نے وہاں کے مدرسہ حنفیہ سلیمانیاہ میں ہادیہ پورا، کچھ حصہ کشف کا اور کچھ حصہ مفتی ابوالسعود عمادی کی تفسیر کا پڑھا۔ اس مدرسہ میں خود انہوں نے حدیث، اصول حدیث اور علم طب کے کچھ اسباق پڑھوائے۔ پھر وہ بن ہمام کی شرح الہدایہ بھی اس مدرسہ میں پڑھواتے رہے جس کی تکمیل مولانا شمس الحق احمد قاضی زادہ نے کی۔

عثمانی حکمران سلطان سلیم بن سلیمان بھی ان کا بے حد احترام کرتا تھا اور وہ اپنے زمانہ ولی عہدی میں بھی اور خود مختار حکمران ہونے کے بعد بھی ان پر احسان و اکرام کرتا اور انہیں باقاعدہ ہر سال خلعتِ خاص سے نوازتا رہا۔ اسی طرح اس کے بیٹے سلطان مراد کے دل میں بھی بروری میں ان کا احترام جاگزیں رہا اور اس نے ہمیشہ ان کی طرف عنانِ توجہ بند کیا کیے رکھی، سلطان مراد نے ان کو مکہ مکرمہ کے منصب افتا پر متعین کیا اور بیت اللہ کی خطابت بھی ان ہی کے سپرد کی۔ مدرسہ سلیمانیاہ کی تدریس کے لیے ان کو اور ان کی اولاد کو مقرر کیا۔ اس نے صفا کے نظام پر مدرسہ عثمانیاہ کے نام سے ایک مدرسہ کی تاسیس کی، اس کی مسند تدریس پر بھی ان ہی کو متعین کیا۔ اس مدرسہ میں یہ حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے۔

شیخ قطب الدین محمد بن احمد جہاں بہت بڑے عالم اور مدرس تھے، وہاں اپنے دور کے عظیم مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں :

۱۔ الإعلام بالعلوم بیت اللہ الحرام : یہ کتاب مکہ معظمہ کی مفصل تاریخ ہے، جو ایک مقدمہ، دس ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے اپنی اس کتاب کے ماخذ کی فہرست بھی دی ہے اور لکھا ہے کہ مکہ کا قدیم ترین مورخ عبدالولید محمد بن عبدالکریم الارزقی ہے۔ اس کتاب کی فہرست ابواب درج ذیل ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے :

باب اول : مکہ مکرمہ اور کعبہ کا جغرافیائی بیان۔

باب دوم: کعبہ کی بنا اور تعمیر۔

باب سوم: عہدِ جاہلیت اور آغازِ اسلام میں مسجد الحرام کی کیفیت۔

باب چہارم: عہدِ عباسیہ میں مسجد الحرام میں کیا اضافہ کیا گیا۔

باب پنجم: جو تعمیر منصور کے عہد میں شروع ہوئی اور اس کے بیٹے ہمدی کے

عہد میں مکمل ہوئی، اس کی تفصیل۔ نیز آئندہ چیل کر عہدِ عباسیہ میں جو اہم اضافے ہوئے، ان کا تذکرہ۔

باب ششم: چراگنہ کے عہد میں مسجد الحرام کی مرمت۔

باب ہفتم: مسجد الحرام عہدِ عثمانیہ میں۔

باب ہشتم: مسجد الحرام سلیم اول کے عہدِ حکومت میں۔

باب نهم: مسجد الحرام سلیم دوم کے عہد میں۔

باب دہم: مسجد الحرام سلطان مراد کے عہد میں۔

ضمیمہ: مکہ کے مقامات مقدسہ۔

تاریخ کعبہ کی مکمل وضاحت کی غرض سے مصنفِ شہیر نے عہد رسالت سے لے کر خود اپنے زمانے تک، مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سرسری خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ مغربی علمائے اس کتاب کو اپنے موضوع میں بہت اہم قرار دیا ہے اور اس قسم کی دوسری کتابوں کے ساتھ اس کو بھی ووٹن فلڈ نے مرتب کیا ہے۔

۲- البرق الیہانی فی الفتح العثماني: اس کتاب کو الفتح العثماني

للاقطار الیمنیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ان واقعات کی

تاریخ ہے جو دسویں صدی ہجری کے آغاز سے لے کر ۸۷۹ھ تک رونما ہوئے۔ یہ تین

ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تیرہ فصلوں میں منقسم ہے جس میں دسویں

صدی ہجری کے آغاز سے عثمانی ترکوں کی فتح یمن تک یعنی بادشاہوں کی تاریخ

بیان کی گئی ہے۔ دوسرا باب سینتیس فصلوں کو محیط ہے۔ اس میں یمن پر ترکوں کے

قابض ہونے سے لے کر سلطان سلیمان کے عہدِ حکومت تک کے واقعات درج کیے گئے

ہیں۔ تیسرے باب میں چھ فصلیں ہیں اور اس میں ان واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو سلطان سلیم کے عہد حکومت میں پیش آئے۔ خاتمہ کتاب چار فصلوں کو مختصر ہے اس میں سنان پاشا کی مصر کو واپسی اور اس کی تونس اور گولینا کی فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۳: منتخب التواریخ فی الترجمة -

۴: تمثال الامثال النادرة و التمثیل و المحاضرة بالابیات المفردة النادرة -

۵: الكنز الاسمی فی فن المعوی -

شیخ قطب الدین محمد شاعر بھی تھے عثمانی حکمران سلطان مراد کی مدح میں لکھنے لے یہ اشعار کہے:

ان سلطاننا مراد لظلل	اللہ فی الارض یا ہر السلطان
ملك صار من مضى من ملوك	الارض لفظاً و جاء عين المعاني
ملك وهو فى الحقيقة عندى	ملك صيغ من صيغة الانسان
ملك عادل فكل ضعيف	وقوى فى حكمه سيات
سيفه و المنون طرفا دهان	لحلق العد و يستدران
كامل المسجد الحرام بناء	فاق فى العالمين كل الباني
هكذا هكذا و الافلا	انما الملك فى بنى عثمان

مراد ہمارا سلطان ہے، جو زمین پر اللہ کا سایہ ہے اور اس کی حکومت

سب پر فائق ہے۔

وہ ایسا فرماں روا ہے جو واقعی و معنوی لحاظ سے فرماں روا ہے اور جو فرماں روا روئے زمین پر گزرے ہیں وہ صرف ظاہری و لفظی فرماں روا تھے۔ وہ ہے تو نیک (فرماں روا) لیکن میرے نزدیک دراصل وہ نیک (فرشتہ) ہے، جس نے انسانی شکل اختیار کر لی ہے۔

وہ ایسا عادل فرماں روا ہے کہ قوی اور ضعیف دونوں اس کی نگاہ میں برابر

ہیں۔

اس کی تلوار اور موت گھوڑ دوڑ کے ایسے دو گھوڑے ہیں جو دشمن کو ختم کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو دوڑ پڑتے ہیں۔

اس نے مسجد حرام کی تعمیر مکمل کر دی، جو ساری دنیا کی عمارتوں پر فوقیت رکھتی ہے۔

بلاشبہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ ملک (مراد) بنی عثمان میں سے ہے۔

امام شوکانی نے البدروالطالع میں شیخ قطب الدین محمد بن احمد نہروالی کی تاریخ وفات ۹۸۸ھ تحریر کی ہے اور عصامی کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے ہفتہ کے روز ۲۷ ربیع الثانی ۹۹۰ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

۱۹۳- شیخ محمد بن اسحاق سندھی

شیخ محمد بن اسحاق حنفی سندھی، صالح عالم دین اور شیخ وقت تھے۔ بلاد سندھ میں واقع اعمال سیدوستان کے ایک گاؤں لاکڑہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ شیخ عبدالرشید سندھی سے تحصیل کی اور فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں اپنے اقران و معاصرین سے فوقیت لے گئے۔ علاوہ ازیں نہایت صالح ہنقی اور متدین بزرگ تھے۔ حجام نظام الدین والی سندھ کے عہد کے عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار دسویں صدی ہجری کے باعمل ہندی علما میں ہوتا تھا۔ لوگوں کے کام کرنے میں بہت تیز تھے اور ان کی سفارش کے لیے امرا اور

۱۹۳- البدروالطالع ج ۲ ص ۵۸، ۵۷۔ النور السافر ص ۳۸۳۔ نزہۃ النحوظ

ص ۲۸۵ تا ۲۹۰۔ یاد ایام ص ۶۲، ۶۱

فقہائے ہند جلد سوم

ارکانِ حکومت کے پاس کثرت سے جاتے تھے۔

ان کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔ یہ کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس سن میں پیدا ہوئے اور کب عالم جاودانی کو سدھارے۔

۱۹۴- علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹینی

شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹینی، دسویں صدی ہجری، بحری کے دیار ہند کے بہت بڑے عالم، محدث، لغوی، شیخ، مبلغ اور مصنف تھے۔ گجرات (کاٹھیاواڑ) کے شہر نہروالا کے باشندے تھے، جو بعد کو پٹین کے نام سے موسوم ہوا۔ اور اسی مناسبت سے یہ شیخ محمد بن طاہر پٹینی کہلائے۔ ان کا لقب جمال الدین بھی تھا، اور عبدالدین بھی!

شیخ ممدوح ۹۱۴ھ کو شہر پٹین میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ ابتدائے عمر ہی سے حصولِ علم میں مصروف ہو گئے اور سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے کہ اپنے علاقہ کے مختلف اساتذہ سے علم حاصل کرنے لگے، جن میں ملا ہند، شیخ ناگوری، شیخ برہان الدین سموی اور مولانا ید اللہ سوہی وغیرہ شامل ہیں۔ کم و بیش پندرہ سال حصولِ علم میں مصروف رہے اور مختلف علوم و فنون میں اپنے اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے۔ تیس سال کی عمر کو پہنچے تو ۹۴۴ھ میں حرمین شریفین کا قصد کیا۔ حج و زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور ایک مدت تک وہاں مقیم رہے۔ اس دوران میں انھوں نے حرمین شریفین کے مشاہیر اساتذہ سے بھی اخذِ علم کیا، جن میں شیخ ابوالحسن بکری شافعی، صاحب الصواعق المحرقة شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مصری ثم مکی، شیخ علی مدنی، شیخ جبار اللہ بن فہد مکی، شیخ عبید اللہ سرمدی، شیخ عبداللہ عبیدروس، شیخ عبداللہ زبیری، سید عبداللہ عدنی، شیخ عبید اللہ حضرمی،

www.KitaboSunnat.com
 دار تہذیب و علم، لاہور
 نزہۃ الخواص ج ۴ ص ۲۹۰

اوشیخ برخوردار سندھی شامل ہیں۔ ان دنوں شیخ علی متقی بھی وہاں اقامت گزین تھے۔ شیخ محمد بن طاہر نے ان سے بھی اخذِ علم کیا اور ان سے منسلک و ملازم رہ کر مستفید و مستفیض ہوئے۔ اب انھوں نے فضل و علم میں کامل و مکمل ہو کر وہاں سے ہندستان کو مراجعت فرمائی اور اپنے وطن پٹن کو اپنا مستقر ٹھہرایا جو اس زمانے میں علاقہ گجرات کا ایک نہایت اہم مقام تھا۔

شیخ محمد بن طاہر علاقہ گجرات کی بوہرہ برادری سے تعلق رکھتے تھے جو برصغیر کی مال دار اور تجارت پیشہ برادری تھی۔ بوہرے دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ کچھ لوگ شیعہ اسماعیلیہ تھے، جو مدویہ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو محمد المہدی بن عبداللہ بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کے پیرو بتاتے ہیں اور محمد بن عبداللہ کو مہدی آخر الزماں مانتے ہیں۔ کچھ لوگ جماعت اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ محمد بن طاہر نے بوہروں کی اصلاح کا عزم کیا اور ان میں جو بدعات و رسوم پیدا ہو گئی تھیں، ان کو ختم کرنے کی ٹھکانی۔ نیز اپنے علاقے میں تعلیم عام کرنے اور لوگوں کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کا تمہیہ کیا۔ انھوں نے ایک ایسی اصلاحی تحریک شروع کی جس کا بنیادی مقصد سنت رسول اللہ کی ترویج، احکام شریعت کی تنفیذ اور منکرات کا انسداد تھا۔

النور السافر میں عبدالقادر حضرمی رقم طراز ہیں کہ شیخ محمد بن طاہر اپنے باپ کی طرف سے بہت سے مال و دولت کے وارث ہوئے تھے، وہ خود دشمنائی بنانے کا کام کرتے تھے۔ اس طرح علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ انھیں گجرات کی ایک مال دار شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ اپنا مال تعلیم و تبلیغ پر خرچ کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ لڑکوں کے مدرسے کے معلم کے ذریعے ذکی اور فہیم لڑکوں کو اپنے ہاں طلب کرتے۔ اگر لڑکا مال دار ہوتا تو اسے علم حاصل کرنے کی ناکید فرماتے۔ اگر تنگ دست ہوتا تو اس کے اور اس کے گھر والوں کے مصارف کا بوجھ خود برداشت کرتے اور اس کو تعلیم میں مشغول رہنے کی ترغیب دیتے۔ اسی طرح غریب و مساکین اور مستحقین میں بھی مال و دولت تقسیم کرتے اور ہر ایک کو ضرورت کے مطابق باقاعدہ وظیفہ دیتے۔ اس طرح وہ کوشاں ہوتے

کہ لوگ فکرِ معاش سے بے نیاز ہو کر اللہ کے دین کی خیریت کو اپنا مقصدِ حیات ٹھہرائیں۔ شیخ محمد بن طاہر نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک ان کی قوم بدعات و منکرات کو ترک نہیں کر دیتی اور سنت پر عمل نہیں ہو جاتی، وہ سرپرستِ مائمن نہیں بن سکتے۔ فریب تھا کہ ان تمام بدعات کا قطعی طور سے خاتمہ ہو جاتا جو بلادِ گجرات میں مروج تھیں کہ مغل حکمران جلال الدین اکبر نے ۹۸۰ھ میں گجرات فتح کیا، اکبر سے شیخ کی ملاقات ہوئی تو اس نے عمامہ باندھنے کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے وجہ بتائی تو اکبر نے کہا، بدعات کا قلع قمع کرنا، دین کی نصرت اور سنت کا نفاذ عمل میں لانا میرے فرائض میں ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ ان امور کی پردہ نہ کریں۔ چنانچہ اکبر نے اپنے ہاتھوں سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور ساتھ ہی والی گجرات مزارعہ بنالہ کو کہہ کر جو اکبر کا رضاعی بھائی تھا، شیخ کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا منقول ہے کہ اس نے اس سلسلے میں شیخ کی پوری اعانت کی اور ممکن حد تک رسوم بدعات کے ازالے کی سعی کی۔ لیکن جب مزارعہ بنالہ نے کو کہہ کر معزول کر کے اس کی جگہ عبدالرحیم خان کو مقرر کیا گیا تو اس نے بسروں کے عقیدہٴ ہندویت کی حمایت کرنا شروع کر دی جس کے نتیجے میں وہ تمام ہندوی جو گوشتہ عزالت میں چلے گئے تھے دوبارہ باہر نکل آئے اور شیخ کی تحریکِ اصلاح بڑی حد تک دب گئی۔

شیخ کو اس کا بڑا قلق ہوا، انھوں نے دوبارہ عمامہ سر سے اتارا اور اکبر سے ملنے کی غرض سے آگرہ کا قصد کیا۔ دراصل ان کا مقصد اکبر کو اس کا وعدہ یاد دلانا اور اس ضمن میں جو کام ہو چکا تھا اس کی اطلاع دینا تھا، نیز عزیز الدین کو کہہ کر معزولی اور عبدالرحیم خان، خانانہ کے تقرر کے نتیجے میں جو تغیر رونما ہو گیا تھا، اس کی تفصیلات سے اکبر کو آگاہ کرنا تھا۔ مگر اس کا انھیں موقع نہ ملا۔ وہ گجرات سے چلے تو کچھ لوگ جو فرقہ بندی سے تعلق رکھتے تھے، ان کے تعاقب میں نکلے۔ جب شیخ اجمین کے نواح میں پہنچے تو انھوں نے موقع پا کر ان کو قتل کر ڈالا۔ یہ حادثہ ۹۸۶ھ کو پیش آیا۔ شیخ کے رفقاء سفر ان کے جسدِ خاکی کو وہاں سے پٹن لے آئے اور انھیں ان کے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

شیخ محمد بن طاہر طینی متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں بہت اہم اور اہل علم میں زیادہ مقبول و معروف کتابیں یہ ہیں:

- ۱- مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار: یہ حدیث کا ایک لغت ہے جو نہایت اہمیت اور جامعیت کا حامل ہے، اور دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ شیخ نے یہ معجم اپنے مرشد و استاذ، شیخ علی نقی کے نام مضمون کیا ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے جو ۱۶۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی کتابت بہت گنجان ہے۔ اس کو حروف مصادر کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ جو الفاظ، احادیث میں استعمال ہوئے ہیں، ان کے مصادر اور مشتقات اس لغت میں موجود ہیں اور احادیث کا متن بھی اس میں درج کیا گیا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف الفاظ کے معنی لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ متعلقہ حدیث کے بارے میں وضاحت طلب نکات کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ اس لغت سے پہلے اس قسم کے جتنے بھی لغت مرتب کیے گئے ہیں، وہ اس کے سامنے کم اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ اہل علم میں یہ کتاب بڑی مقبول ہے۔
- ۲- تذکرۃ الموضوعات: یہ موضوع احادیث سے متعلق ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کے مقدمہ میں مصنف رحمۃ اللہ نے یہ وضاحت کی ہے کہ کسی حدیث کو محض اس لیے موضوع نہیں قرار دے دینا چاہیے کہ کسی نے اسے موضوع کہا ہے۔ اس کا فیصلہ اس سلسلے کی مستند کتب سے رجوع کے بعد کیا جائے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے شیخ نے لکھا ہے کہ امام ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات میں بعض ان احادیث کو بھی موضوع قرار دیا ہے، جو دراصل حسن کا درجہ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں بعض ضعیف احادیث کو بھی انھوں نے موضوع ٹھہرایا ہے۔ اس کے بعد شیخ نے ان احادیث پر عالمانہ و ناقدانہ بحث کی ہے جنہیں کسی نہ کسی عالم نے موضوع سے تعبیر کیا ہے۔ اس مسئلہ سے متعلق یہ ایک مفید کتاب ہے۔ یہ کتاب مصر میں چھپ چکی ہے اور مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبد الجلیل سامرزوی نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی ہے۔

فقہائے ہند جلد سوم

۳۔ علاوہ ازیں المغنی فی ضبط اسماء الرجال :

۴۔ قانون الموضوعات فی ذکر الضعفاء والموضوعین : یہ کتاب مصر میں طبع ہو گئی ہے۔ اس کے مقدمہ میں مرقوم ہے کہ مصنفِ علام نے اس کو تہذیباً الموضوعات کے بعد تصنیف کیا۔

اس کتاب میں مصنف نے ان روایات کو حذف و تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا ہے جو موضوع حدیثیں وضع کرتے یا بیان کرتے تھے۔ آخری دو فصلوں میں ان کی کنیتیں اور نسب بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کے بالکل آخر میں مولانا عبد الجلیل سامروہی مرحوم نے ترجمۃ المؤلف کے عنوان سے شیخ محمد بن طاہر کے حالات و سوانح تحریر کیے ہیں۔

فاضل مصنف نے، وضاع راویوں کے نام اور اوصاف یا قاعدہ حوالوں کے ساتھ درج کیے ہیں اور ان کا ساقط الاعتبار یا غیر مستند ہونا متقدمین کی کتابوں سے ثابت کیا ہے۔ اس کا انداز اس قسم کا ہے۔ مثلاً :

غالب بن عبد اللہ الجزری۔ لیس بشیء۔

غریب بن عبد الواحد القرشی۔ مجہول۔

غسان بن ابان الخنقی۔ یروی عجائب۔

غیاث بن ابراہیم۔ کذاب۔

خلیل بن مجد۔ وضاع۔

الفرج بن فضالة۔ ضعیف۔

الفرات بن السائب۔ مندوک۔

الفضل بن حرب البجلی۔ غیر محفوظ۔

الفضل بن عبد اللہ بن مسعود بيشکری۔ لایخوذ احتجاج بہ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ کفاية المفروطين : یہ شافعیہ کی شرح ہے۔ اس کا ایک نسخہ احمد آباد

میں پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دسویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت عالم اور محدث و فقیہ نے ۹۸۶ھ میں عین اور سارنگ پور کے درمیان جام شہادت نوش کیا اور ان کے ساتھیوں اور خواہر زادہ شیخ نور محمد نے میت کو پٹن لاکر، ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا۔^۱

۱۹۵۔ شیخ محمد بن عاشق چریاکوٹی

شیخ محمد بن عاشق موضع چریاکوٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ذرا بڑے ہوتے تو اپنے علاقہ کے علمائے عظام سے تحصیل علم کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن چریاکوٹ میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں تدریس اور افادہ طلباء کا سلسلہ شروع کیا۔ شیخ محی الدین عباسی چریاکوٹی کے لقب سے ملقب تھے۔ فاضل بزرگ تھے اور فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں التفسیر المحمدی، الجواهر العربیہ فی الفنون اللادبیہ، اصول فقہ کی مشہور کتاب تلویح پر حاشیہ اور فرائض و مواریث میں الکوکب الدرری شامل ہیں۔ اس عالم و فقیہ اور مصنف نے ۹۷۲ھ میں وفات پائی۔ ان کا تذکرہ احمد مکرم چریاکوٹی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔^۲

- ۱۔ النور السافر، ص ۳۶۱، ۳۶۲۔ اخبار لاخیار، ص ۲۷۲۔ تذرات الذہب، ج ۸، ص ۴۱۰۔
 الرسالة المستطرف، ص ۱۱۳۔ الفوائد البیہ حاشیہ، ص ۱۶۲، ۱۶۵۔ معجم المؤلفین، ج ۱۰، ص ۱۰۰۔ ہدیۃ الغارین، ج ۲، ص ۲۵۵۔ کشف الظنون۔ ایضاح المکنون۔ اتحاف النبلاء، ص ۳۹، ۴۰۔ ایجد العلوم، ص ۸۹۵، ۸۹۶۔ آثار الکرام، ج ۱، ص ۹، ۱۸۱۔ سبحة المرجان، ص ۴۳، ۴۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۸۵، ۳۸۷۔ الاعلام، ج ۷، ص ۴۲، ۴۳۔ مرآت احرار، ج ۳، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔ انوار ابرار، ص ۳۲، ۳۳۔ روڈ کوثر، ص ۳۹۲، ۳۹۴۔ خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۲۶، ۴۲۷۔ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر حرثی، طبعی، ترجمہ رسالہ مناقب۔ مؤلفہ شیخ عبدالوہاب اقصی القضاة (متوفی ۱۰۸۶ھ)۔ ترجمہ مولانا سید ابوظفر ندوی۔^۳ نذہتہ الخواطر، ج ۴، ص ۳۰۲۔

۱۹۶۔ شیخ محمد بن عبد الملک قاری خالدي

شیخ محمد بن عبد الملک خالدي، اپنے عصر کے مشہور قاری، فقیہ اور شیخ تھے۔ ساتھ ہی جو دو نسخے منصف - اکتب درسیہ اپنے والد کے نام سے شیخ عبد الملک سے پڑھیں، قرأت و تجوید کا علم بھی ان ہی سے سیکھا۔ پھر ذکر و عبادت میں مشغول ہو گئے اور علماء و طلباء کی ایک بڑی جماعت ان کے گرد جمع ہو گئی۔ تمام عمر درس و تدریس اور اہل علم کو علمی فائدہ پہنچانے میں صرف کر دی۔ توکل و عفاف ان میں کوٹھوٹ کر بھرا ہوا تھا اور طبیعت کو قناعت بالیسیر کا ایسا عادی بنا لیا تھا کہ ضرورت سے زیادہ کوئی چیز حاصل کرنے کی خواہش ہی دل میں باقی نہ رہی تھی۔ سخت تکلیف کے وقت بھی ملوک و امرا کے دروازے پر نہیں گئے۔ نہ کسی کے آگے کبھی ہاتھ پھیلا یا اور نہ تنگ دستی کا شکوہ کیا۔ دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین اور فقیہ قاری نے ۱۲ رجب ۹۸۴ھ کو آگرہ میں وفات پائی۔ ۱۱۷۷ھ

۱۹۷۔ شیخ محمد بن عمر بحرق حضرمی

شیخ محمد بن عمر بن مبارک بن عبد اللہ بن علی حمیری حضرمی، بحرق کے نام سے مشہور تھے۔ شافعی المسلک تھے۔ علامہ زمان اور محدث دوران تھے۔ ان کا شمار اپنے عصر کے علمائے محققین اور فضلاء مدققین میں ہوتا تھا۔ لقب جمال الدین تھا۔ ۵۷ شعبان کی شب کو ۸۶۹ھ میں حضرت موت میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اسی نواح کے علما سے اخذ علم کیا۔ پھر مزید تعلیم کے لیے زبید چلے گئے۔ وہاں شیخ زین الدین محمد بن عبد اللطیف شرحی سے حدیث کا درس لیا اور شیخ جمال الدین محمد بن ابوبکر صانع فقیہ سے اصول کی کتابیں پڑھیں۔ تصوف و طریقت کے لیے مختلف شایخ کی خدمت میں گئے اور اس علم سے بہرہ ور ہوئے۔ ۸۹۴ھ

۱۱۷۷ھ (ذکار ابرار، ص ۳۳۷، ۳۳۸) - نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۲، ۳۰۲

میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور حافظ شمس الدین سخاوی سے کسب فیض کیا۔ حصول علم کے بعد درس و تدریس اور افادۂ طلبہ کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ حضرت موت میں ان سے فقیہ محمد بن احمد باجرقیل نے تحصیل علم کی اور عدن میں ان کے سامنے عبداللہ بن احمد مخزومی نے زانوئے تلمذتہ کیا۔ طلبہ پر نہایت مہربان اور اہل خیر کے لیے بدرجہ غایت کرم فرماتے تھے۔ حق و صداقت کے علم بردار تھے۔ شجر کی مسند قضا پر بھی تعین رہے۔ پھر اس منصب سے الگ ہو گئے اور عدن چلے گئے۔ وہاں کے امیر مرجان عامری کے نزدیک انھیں بڑی عزت و قبولیت حاصل ہوئی اور بے حد عزت و جاہ کے حامل ہوئے۔

بعد ازاں دیار ہند کے لیے رخت سفر باندھا اور والی گجرات سلطان مظفر بن محمود میگڑہ کے پاس آئے۔ یہ حکمران ان سے نہایت تعظیم سے پیش آیا اور ان کی بے حد قدر و منزلت کی۔ اس نے اپنی قلمرو میں ان کی آمد کو منہنم جانا اور ان سے اخذِ علم کیا۔ شیخ محمد بن عمر بجزق کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک کتاب تبصرة لخصفة الشاہیة الاحمدیہ بسیرة النبیۃ الاحمدیہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ہندوستان آکر فرماں روئے گجرات سلطان مظفر کے دربار سے منسلک ہونے کے بعد لکھی اور اسی بادشاہ کے نام سے سب کی۔ اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

- ۱- الحسام الرسول علیہ بعضی اصحاب الرسول۔
- ۲- ترویج السلوک الی ملک المارکٹ۔
- ۳- منغذہ الاسماع باحکام السماع۔
- ۴- المختصر من کتاب الامتاع۔
- ۵- مواہب القدر وس فی مناقب العیدروس۔
- ۶- اختصار شرح لامیۃ العجم للصفدی۔

شاہ ابضاح المکنون فی الذیل عن کشف الظنون، ج ۱، ص ۲۲۱

- ۷۔ الاسرار النبویہ فی اختصار الاذکار النوویہ ۔
- ۸۔ ذخیرۃ الاخوان المختصر من کتاب الاستغناء بالقرآن ۔
- ۹۔ النبذۃ المنتخبۃ فی کتاب الدوائل للعسکری۔
- ۱۰۔ السننۃ المختصرۃ فی الخصال المکفرۃ للذنوب المقدمۃ والمؤخرۃ۔
- ۱۱۔ الحدیقۃ الانیقۃ بشرح العروۃ الوثیقہ۔ اس کتاب کا ذکر کشف الظنون میں بھی ہے مگر مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ لیکن ایضاح المکنون میں بتایا گیا ہے کہ یہ مصنف کے ایک قصیدہ العروۃ الوثیقہ کی شرح ہے جو خود مصنف نے کی ہے۔
- ۱۲۔ الحواشی المفیدۃ علی ابیات الیافی فی العقیدۃ۔ منقول ہے کہ شیخ عبداللہ بن اسعد یافعی کے ابیات پر انھوں نے تین شرحیں سپرد قلم کیں، ایک مفصل، دوسری اوسط درجے کی اور تیسری مختصر۔
- ۱۳۔ مختصر المقاصد الحسنۃ۔
- ۱۴۔ وصیۃ البنات والبنین فی ما یحتاج الیہ من امر الدین۔
- ۱۵۔ لامیۃ العجم۔ اس کی دو شرحیں سپرد قلم کیں۔
- ۱۶۔ شرح علی الملحۃ۔
- ۱۷۔ رسالۃ فی الحساب۔
- ۱۸۔ رسالۃ فی الفلک وغیرہ۔
- ۱۹۔ مختصر الترغیب والترہیب للمندردی۔
- ۲۰۔ عقد الدرد فی الایمان بالقضاء والقدر۔
- شیخ بحر قشقر بھی تھے۔ یہ شعر ان ہی کے ہیں :
- انا فی سلوۃ علی کل حال ان ابانی الجیب او ان اتانی

۱۶۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۶۴۵

۱۷۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون ج ۲ ص ۹۹۔ نیز دیکھیے ج ۱ ص ۳۹۷۔

اغتم الوصل ان دنا فی زمان واذا مانا اعشر بالامانی۔
میرا دوست میرے پاس آنے سے انکار کرے یا آجائے۔ میں دونوں صورتوں میں
مطمئن اور خوش ہوں۔

اگر وہ حالتِ الطینان میں میرے پاس ہو تو میں لذتِ وصل سے بہرہ یاب
ہوں گا اور اگر دور ہو تو آرزوؤں میں زندگی گزار دوں گا۔

درج ذیل اشعار بھی ان ہی کے ہیں:

یا من اجاد عذ اة المشد مقولا . و افاد من احسانه و تفضله
ان کنت متحنی بذالو فانسى . لست الهیوبه حیثما قیل انزلا
واذ انبادرت الجیاد بحلبة . یوم النزال رأیت طرفی ادلا
قسما یا آیات البدیح و ما حوی . من صنعیه موشحاً و مسلسلا
لو کنت مفتخر بانظم قصیده . لبنیت فی هام المحبرة منزلا
من کل قافیة یروق سماعها . و یعید سحبان الفصاحة باقلا
و تری لبید کم بلیسد اقلبه . حصرا و ینقاب الفرزدق خطلا
و علی جری یختر مطرف تیجها . و یتجسها نبیلا نسج مهلهلا
ولئن تنبأ ابن الحسین فانتی . ساکون فی تلك الصناعة مرسللا
اظننت ان الشعر یصعب صوغه . عندی وقد اضحی لدی مثللا
ابدی العجائب ان برزت مفاخرها . او ما وحا للقوم او متغزلا
لکننی رجل اصون بضاعتی . عمّن یساوم نجسها متبذلا
واری من الحرم اعظیم خریدة . حسناء تمبدی للئیم و تجتلا
ما کنت احسب عقربا تحتک با . لا فعی ولا جذا عا یزاحم بزلا
فانا الغریب و انت ذاک یئینا . رحم یحی لمثلها ان توصللا

اے وہ جس نے صبحِ بڑی عمدہ بات کہی اور اپنے حسنِ کلام سے بے حد فائدہ پہنچایا۔
اگر تو اس بات سے میرا امتحان لینا چاہتا ہے تو میں ڈرنے والا نہیں، خواہ کہیں

بھی مجھے ٹھہرنے کو کہا جائے۔

جب میدانِ جنگ میں عمدہ گھوڑے دوڑ رہے ہوں تو میرے اسیل گھوڑے کو سب سے اول پاؤں گئے۔

ان آیاتِ بدیع کی قسم کھاتے ہوئے اور ان چیزوں کی قسم کھاتے ہوئے کہ جس میں توشیح و تسلسل پنہاں ہے۔

(میں کہتا ہوں) اگر کوئی قصیدہ منظوم کرنے پر مجھے ناز ہوتا تو میں کہکشاں کے مغز میں ٹھکانا بناتا۔

اس میں ہر وہ قافیہ ہوتا جو ذوقِ سماعت کو بھلا لگتا اور جس سے سبحانِ نصاّت انگڑائی لینے لگتا۔

اور اپنے لبید کو دیکھو گے کہ اس کا دل بلبیدا اور گنگ ہو گیا ہے اور فرزوقی ہزل گو بن گیا ہے۔

اور تم دیکھو گے کہ جبریر یا اپنے فخر و ناز کی چادری سمیٹے ہوئے چلا جا رہا ہے اور دیکھو گے کہ اس میں مہمل کا اسلوب کبھی نمایاں ہے۔

اور اگر اسِ احمسین دعوائے نبوت کرتا ہے تو میں شعر گوئی میں مدعی رسالت ہو سکتا ہوں۔

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے لیے شعر کہنا کوئی مشکل کام ہے۔ یاد رکھو میرے سامنے اس فن نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ تم ہائو فخر کرتے ہوئے نکلتے ہو یا قوم کی مدح سرائی کرتے ہو یا عشقِ بازی سے دل بہلاتے ہو۔

لیکن میں تو ایسا آدمی ہوں کہ اپنی پونجی ان لوگوں سے محفوظ رکھتا ہوں جو اس کی قیمت کم لگاتے ہیں چھچھورین کا اظہار کرتے ہیں۔

میں دو شہزادے شعر کو کسی کیسینے کے سامنے ہدیہ پیش کرنا یا اسے دکھانا جرمِ عظیم تصور کرتا ہوں۔

مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ کوئی پچھو، سانپ یا بچہ بڑا، اونٹ کا مقابلہ کرے گا۔

میں پر دیسی ہوں اور تم بھی پر دیسی ہو اور ہمارے تمہارے درمیان ایسا رشتہ رحم ہے جسے بہر حال جوڑے رکھنا چاہیے۔

عامر بن عبد الوہاب نے زبید میں مدارس کی تاسیس شروع کی تو اس پر شیخ محمد بن عمر بقرق حضرمی نے یہ شعر کہے:

ابى الله الا ان تحوذ المفاخر ا فستاك من بين البرية عامرا

عمرت رسوم الدين بعدد سما فحييت اثار الاله الدواثرا

فانت صلاح الدين لاشك هذا نشواهد تبتد وعليك طواهرا

اللہ تو چاہتا ہی تھا کہ تم قابلِ فخر باتوں کو سمیٹ لو، اس لیے اس نے اپنی محبت میں تمہارا نام عامر رکھ دیا۔

تم نے مراسمِ دین کو اس وقت قائم کیا، جب کہ وہ مٹ چکے تھے، گویا کہ تم نے اللہ کی مردہ نشانیوں کو زندہ کیا۔

تم بلاشبہ صلاح الدین (مصلح دین) ہو، اور اس کے شواہد و آثار تم پر ظاہر ہو کر ہیں گے۔ اس عظیم عالمِ دین اور فقیہِ عصر نے ۲۰ شعبان کی رات ۳۰ ۹ھ کو بکرات میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات زہر کی وجہ سے ہوئی۔ سلطان ان کی بے حد تکریم کرتا تھا، جس سے بعض وزراء کے دل میں ان سے حسد پیدا ہوا اور انہوں نے زہر دے کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

شہ ظفر الوالہ، ص ۱۱۸ تا ۱۲۰ - شذرات الذهب، ج ۸، ص ۱۷۷، ۱۷۸ - نزمۃ الخواطر، ج ۴

ص ۳۰۶ تا ۳۰۹ - النور السافر، ص ۴۳ تا ۱۵۲ - کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۵۳۶، ۱۵۳۸

ایضاح المکتون میں ان کی تصنیفات کا ذکر متعدد مقامات میں موجود ہے۔ عربی ادبیات میں پاک

ہند کا حصہ، ص ۱۸۲، ۳۸۹ - ہدیۃ العارفین، ج ۲، ص ۲۳۱، ۲۳۰ - معجم المؤلفین، ج ۱۱، ص ۱۸۹، ۹۰

۱۹۸۔ شیخ محمد بن فخر الدین جون پوری رہتاسی

شیخ محمد بن فخر الدین جون پوری ثم رہتاسی، فاضل کبیر اور شیخ وقت تھے۔ ان کا شمار اس دور کے کبار علما میں ہوتا تھا۔ تمام عمر درس و افادہ میں مصروف ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے اپنے رسائل میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ اور انہیں علامہ عصر قرار دیا ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی زبدۃ المقامات میں شیخ عبداللہ سرہندی کے حالات کے ضمن میں رقم طراز ہیں کہ شیخ محمد بن فخر الدین رہتاسی طلبا کو درس دیتے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ عبداللہ نے ان سے رہتاس میں ملاقات کی اور ان کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ طلبا کو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح المصباح کا درس دے رہے تھے اور اپنے تلامذہ کے سامنے اس کتاب پر ایسے اعتراضات وارد کر رہے تھے جو مصنف کے کلام اور مفہوم کے بالکل خلاف تھے اور علمی اعتبار سے اس پر وارد نہیں ہو سکتے تھے۔ شیخ عبداللہ نے پہلے تو ارادہ کیا کہ معقولیت اور دلائل کی روشنی میں قاضی شہاب الدین کا دفاع کریں اور شیخ محمد بن فخر الدین کو بتائیں کہ یہ اعتراضات و ایرادات واقعاتی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں، لیکن بعد کو اس بنا پر خاموشی اختیار کر لی کہ وہ مسافر ہیں، سیاحت کے لیے گھر سے نکلے ہیں اور آگے جا رہے ہیں، اگر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس نے طول پکڑ لیا تو سفر میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ مگر وہ کہتے ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب شیخ محمد بن فخر الدین درس سے فارغ ہوئے تو ان پر حقیقت حال منکشف ہو گئی اور انہوں نے طلبا کے سامنے صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ قاضی شہاب الدین کے پیش نظر کلام کے بارے میں جو کچھ وہ بیان کر رہے تھے، صحیح نہ تھا اور ان کے کلام کے بالکل خلاف تھا۔ اس کے ساتھ ہی قاضی ممدوح کے کلام کا صحیح محل بھی بیان کر دیا۔ قاضی عبداللہ فرماتے ہیں، ان کے اس علمی انصاف اور صاف بیانی سے میں بہت متعجب اور خوش ہوا۔

شیخ محمد بن فخر الدین کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک توضیح الحواشی شرح المصباح ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے کافیہ پر جو حواشی تحریر کیے، ان کی شرح بھی انھوں نے سپردِ قلم کی۔

شیخ محمد کی وفات کب ہوئی، اس کا صحیح طور سے پتا نہیں چل سکا۔ البتہ خواجہ محمد ہاشم کشمی نے بعض علما کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ مولانا محمد ایک روز علما کے حج غیفر کے ساتھ ایک باغ میں موجود تھے، جو شہر سے باہر واقع تھا۔ وہاں وہ ان کی آنکھوں سے ایسے اوجھل ہوتے کہ دوبارہ واپس نہ آتے اور نہ کہیں سے ان کے بارے میں کسی قسم کے معلومات فراہم ہو سکے۔ ان کے متعلق کئی دن لوگ باتیں کرتے رہے، لیکن ان کا وجود بہر حال لوگوں کے احاطہ علم سے باہر ہی رہا۔

۱۹۹- شیخ محمد بن مبارک جون پوری

شیخ محمد بن مبارک جون پوری، حنفی المساک تھے اور دسویں صدی ہجری کے عالم و فقیہ۔ ان کا شمار کلام و اصول اور علوم عربیہ کے علمائے متبحرین میں ہوتا تھا۔ شیخ رکن الدین محمد گنگوہی نے لطائف قدوسی میں ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، شیخ محمد بن مبارک نہایت متدین، سلیم الفطرت اور نیک عالم دین تھے۔ اثنائے بحث میں اگر ان پر حقیقت حال منکشف ہو جاتی تو بلا تکلف اپنے قول سے رجوع کر لیتے۔ وہ لکھتے ہیں، ایک مرتبہ شاہ آباد میں ان کے اور شیخ عبد القدوس گنگوہی کے درمیان علم کلام کے اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ کسی شخص معین کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ اہل جنت میں سے ہے یا اہل دوزخ میں سے، جائز ہے یا نہیں؟ شیخ محمد بن مبارک کا موقف یہ تھا کہ چوں کہ ہم کسی خاص شخص کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ اللہ اور بندوں کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے، لہذا

۱۹ لطائف قدوسی، ص ۲۲، ۲۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۰۹-۳۱۰

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اہل جنت میں سے ہے یا اہل دوزخ میں سے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ دائرہ کفر سے نکلنے کے لیے طہارت عقیدہ یعنی ایمان ضروری ہے اور وہی دخولِ جنت کی شرط ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ نمازی کی صحت نماز کے لیے طہارت جسمانی شرط ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان سے محروم ہے یا اس کے ایمان میں شک ہے تو کیا اسے دخولِ جنت کا مستحق قرار دیا جائے گا، جب کہ طہارت جسمانی کے مشکوک ہونے کی صورت میں، صحتِ نماز کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ بات یہ ہے کہ طہارت جسمانی اور طہارت عقیدہ دو شرطیں ہیں، اور صحتِ نماز اور دخولِ جنت ان کے ساتھ مشروط ہے۔

شیخ عبد القدوس گنگوہی کہتے تھے کہ یہ کننا کہ نماز اسی صورت میں جائز ہوگی، جب کہ طہارت میں کسی نوع کا شک نہ ہو، یعنی جو ازہ صلوٰۃ کی بنیاد، طہارت میں عدم شک ہے، اسی طرح یہ کننا کہ دخولِ جنت کا جواز اسی وقت پیدا ہوگا، جب ایمان شک و شبہ سے بالا ہوگا۔ یعنی دخولِ جنت کا حکم، ایمان میں عدم شک پر مبنی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ کسی اہل اسلام کے اسلام و ایمان کا معاملہ چوں کہ عند الناس بالکل ظاہر اور عیاں ہے، لہذا اس کے ایمان میں شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے حکم ظاہری کی بنا پر دخولِ جنت کا فیصلہ دیا جاسکتا ہے۔ لیکن عند اللہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ ہمیں اس کا علم نہیں، اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق ان امور سے ہے جو ہمارے احاطہ علم سے باہر ہیں۔ صاحبِ شریعت کے علاوہ کوئی شخص اس ضمن میں قطعی بات نہیں کہہ سکتا۔

شیخ عبد القدوس گنگوہی نے مزید کہا کہ اس کی مثال ایسی ہی جیسے ایمان کے بارے میں استئنا یعنی ان شاء اللہ کہنا۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے: اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ۔ (میں، ان شاء اللہ مؤمن ہوں)۔ تو اس استئنا کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ ایمان کا معاملہ مغیبات میں سے ہے، اور یہ لفظ، اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمت

سے خوف کی بنا پر کہا گیا ہے۔ ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ العیاذ باللہ ایمان میں شک یا ارتباب کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ استثنا درست نہیں ہے۔ ایک صاحب ایمان کو کہنا چاہیے: انا مؤمن حقاً (میں یقیناً مومن ہوں)۔ اس لیے کہ وہ اپنے ایمان کا تحقق اس وقت کر رہا ہے اور یہ الفاظ کامل وثوق کے ساتھ اس آن زبان سے ادا کر رہا ہے جب کہ ایمان باللہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے اور یہ رب کریم اور غفور و رحیم کے ساتھ مال انجام کے اعتبار سے حسن ظن کی بنا پر ہے۔ ہاں انجام کا معاملہ چوں کہ مبہم ہے، لہذا اس کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کی جاسکتی۔ لیکن نماز کی یہ شکل نہیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق کی ذیل میں آتا ہے۔

شیخ محمد بن مبارک نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا، یہ عقیدہ کہ ایمان، خوف اور رجا کے درمیان ہوتا ہے، صحت ایمان کے لیے شرط ہے اور کسی کے ایمان کے انجام کے بارے میں ایک قطعی حکم لگا دینے سے یہ شرط کہ ایمان، خوف و رجا کی درمیانی کیفیت ہے) فوت ہو جاتی ہے اور شرط کے فوت ہونے سے شرط بھی فوت ہو جاتا ہے، اور یہ بات ہی غلط ہو جاتی ہے، کیوں کہ بندوں کے یقین سے خوف زائل نہیں ہوتا، اس لیے کہ اسی یقین کے ذریعے نجات و فلاح کا علم ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوگا، جب عند اللہ بھی اس یقین کا علم ہو جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی یقینی علم نہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ انسانی یقین صحت ایمان کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے کہ یہ عقیدہ کہ ایمان، خوف و رجا کے درمیان ہے، صحت ایمان کے لیے شرط ہے۔ لہذا مطلقاً غیر یقینی سے کیفیت رجا فوت ہو جاتی ہے۔ پس شرط کے فوت ہونے سے مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے۔ نیز مطلق نماز جو ظاہری طہارت کے ساتھ ہو بلا شک و شبہ صحیح ہوگی، بخلاف ایمان کے۔ یعنی ایمان کے دو پہلو ہیں، ظاہری اور باطنی۔ ظاہری تو ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہے، جس کا

تعلق حس ظاہری سے ہے۔ ظاہراً دخول جنت کے جواز کے لیے، اس کے سوا اور کوئی شرط نہیں۔ رہا باطنی پہلو تو وہ قلب سے تعلق رکھتا ہے اور اسی سے عند اللہ دخول جنت کا حکم متعلق ہے، لہذا ایمان اور نماز دو جداگانہ چیزیں ہیں۔

شیخ رکن الدین محمد کہتے ہیں کہ جب ان کے چچا عزیز اللہ بن اسماعیل رودہی نے یہ بحث سنی تو لکھ بھینجا کہ جنت اسلام کا اور دوزخ کفر کا ثمرہ ہے۔ جب ہم کسی کے اسلام یا کفر کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور حسی طور پر معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کی موت اسلام کی حالت میں ہوئی یا کفر کی حالت میں۔ یعنی جب اس کی موت واقع ہوئی تو مرتے وقت اس کی زبان سے اسلام کا کلمہ نکلتا رہا یا کفر کا، تو ہم ایسا ہی حکم لگا دیتے ہیں اور عند الناس یہ گواہی دے دیتے ہیں کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی۔ اور کتابوں میں جو یہ مرقوم ہے کہ انجام مبہم ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جنتی ہے یا دوزخی تو اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ یہ اسی حد تک مبہم ہے جس حد تک کہ اللہ کے علم و حکمت نے ازل سے اس کے حق میں لکھ دیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کے نزدیک بھی وہ یقینی اور قطعی طور پر جنتی ہے یا دوزخی۔ واللہ اعلم

دسویں صدی ہجری کے اس جلیل القدر ہندی عالم و فقیہ کی تاریخ ولادت اور سن وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۳۰۰۔ شیخ محمد بن محمد ابجدی

شیخ محمد بن محمد ابجدی گجراتی، ان کا لقب مجد الدین تھا۔ اپنے دور کے علماء، محدث اور شیخ تھے۔ یوں تو تمام علوم مرتبہ کے عالم تھے لیکن حدیث اور رجال کے تو بہت ماہر تھے اور اس موضوع کے کبار و مشاہیر علمائے ہند سے تھے۔ سلطان محمود شاہ کے عہد

تہ لطائف قدوسی، ص ۲۶ تا ۲۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۱۰ تا ۳۱۲۔

میں گجرات آئے۔ اس نے ان کی بے حد تعظیم کی، اپنی مجلسوں میں اہم مقام عطا کیا، قربتِ سلطانی سے نوازا، اپنے بیٹے مظفر کا اتالیق مقرر کیا اور ان کے علم و فضل کی وسعت و فراوانی سے متاثر ہو کر انھیں رشید الملک کا خطاب دیا۔

اس کے بعد جب مظفر شاہ حلیم سریر آرائے مملکت گجرات ہوا تو ۹۱۷ھ میں اس نے ان کو اپنے کبار امرا پر تقدم کا شرف بخشا، انھیں اپنا وزیر مقرر کیا اور خداوندِ نفا کا لقب مرحمت کیا۔ چودہ سال مسندِ وزارت پر فائز رہے۔ پھر جب عثمان حکومت مظفر شاہ کے بیٹے بہادر شاہ کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ان کو منصبِ نیابت عطا کیا۔ اس منصب پر پندرہ سال متمکن رہے۔ بعد ازاں جب سلطنتِ گجرات میں انقلاب کی لہریں چلیں اور بہادر شاہ، دیو کی طرف نکلا اور بلادِ گجرات میں مغل حکمران ہمایوں فتح کا جھنڈا لہراتا ہوا داخل ہوا تو اس نے شیخ محمد بن محمد ایچی خداوند خاں کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب انھیں ہمایوں سے ملایا گیا تو وہ ان کی گفتگو اور علم و فضل سے بہت متاثر ہوا، ان پر بڑی نوازشیں کیں اور اپنے دربار و جلسا میں شامل کیا۔ پھر وہ انھیں آگرہ لے گیا اور وہ ایک مدت تک ان کے پاس رہے۔ جب ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگ گیا اور ہندوستان کی زمامِ حکومت شیر شاہ سوری کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ان کو گجرات جانے کی اجازت دے دی۔ اس زمانے میں گجرات کا حکمران محمود شاہ ضعیف تھا۔ وہ احمد آباد گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات کا ظم نہیں ہو سکا۔

۱۲۰۱۔ شیخ محمد بن محمد گجراتی

شیخ محمد کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ محمد بن محمد بن شاہو بن تگور بن جام زندہ قرشی سندھی ۱۲ ربیع الاول ۸۶۱ھ کو گجرات (کاٹھیا واڑ) میں پیدا ہوئے اور اپنے عصر

کے مشامیر اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اپنے دور کے عظامہ، مفتی اور مستند عالم دین تھے اور علامہ حمید الملک شمس الدین بن رکن الدین ابن تاج الدین گجراتی کے نام سے معروف تھے۔ ان کا شمار فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے نامہ علمائے ہند تھا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالعزیز نے بھی ان ہی سے کسب علم کیا۔ یکم صفر ۹۳۲ھ کو گجرات میں فوت ہوئے۔ شیخ ابن حجر نے ان کے حالات میں ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے پلٹے

۲-۲۔ شیخ محمد بن محمد مالکی مصری

شیخ محمد بن محمد بن عبدالرحمن بن حسن جلال الدین مصری، علامہ عصر تھے اور فقہی سبک کی رو سے مالکی تھے۔ ان کی ماں اُم ولد تھیں۔ شیخ عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۷۱۰ھ اشعبان ۵۶ھ کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی آغوش تربیت میں قرآن مجید حفظ کیا اور شہ در اصولی و فروعی ابن حاجب کا الفیہ زبانی یاد کیا جو علم نحو کی معروف کتاب ہے۔ کچھ اور کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔ اپنے باپ کے کچھ نام زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ باپ کی طرف سے بہت سے مال و دولت کے وارث بنے تھے، لیکن یہ تمام دولتیں کچھ ہی کم مدت میں ضائع کر دی۔ پھر تنگ دست ہو گئے اور صعبید پیلے گئے۔ بعد ازاں مکہ منظر کا قصد کیا۔ وہاں حافظ شمس الدین سخاوی سے موطا، مسند امام شافعی، سنن ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کتابوں کا درس لیا۔ نیز ان کو ان کی شرح الفیہ اور دیگر تصانیف باقاعدہ سنائیں اور عرصہ تک ان کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل کیا۔ خود حافظ سخاوی نے اپنی تاریخ الضوء اللامع میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، شیخ محمد بن محمد دکنی بے حد ذی اور ذہین تھے۔ حفظ و ذکاوت میں سب سے تیز تھے۔ بہت سی کتابیں انھیں مستحضر

تکلیف تریبۃ الخواطر ج ۲، ص ۳۱۳ بحوالہ نظر الابرار۔

تھیں اور قادر الکلام تھے لیکن ان کی سیرت کے بعض پہلو پسندیدہ نہ تھے۔ یمن بھی گئے اور زیلع جاکر درس و تدریس اور احادیث پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا پھر عازم کنیا ت ہوئے اور اس کے والی سے ملے۔

شیخ جام اللہ بن فہد کہتے ہیں، وہ ہندوستان آئے تو ان بلاد میں ان کی بدرجہ غایت تعظیم و توقیر کی گئی اور علاقہ گجرات کے حکمران سلطان محمود شاہ کے دربار میں ان کو بڑا تقرب حاصل ہوا۔ ان کی معرفت حدیث اور فصاحت و بلاغت کی وجہ سے سلطان محمود نے ان کو ملک المحدثین کا خطاب عطا کیا اور یہ پہلا خطاب تھا جو ان بلاد میں کسی اہل علم کو دیا گیا۔ گجرات میں یہ ورزائے مملکت اور اکابر دولت کے مرکز توجہ قرار پائے اور انھیں بے پناہ عزت و تکریم حاصل ہوئی۔ سلطان محمود کی زندگی میں ان کی یہ حالت تھی کہ ان کے ذریعے وظائف و صلوات کا سلسلہ حرمین شریفین تک جاری تھا۔ محمود کی وفات کے بعد تخت گجرات کا وارث اس کا لڑکا سلطان مظفر علی بن بنا تو بعض وزرائے ان کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کیے جس سے متاثر ہو کر وہ ذہنی طور سے ان سے دور ہو گیا اور کچھ وظائف بھی بند کر دیے۔ پھر اسی آٹنا میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ظفر الوالد میں بتایا گیا ہے کہ حافظ سخاوردی الضوء اللامع میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے مختلف شیوخ سے شیخ محمد بن محمد مالکی کے لیے چالیس احادیث جمع کیں اور اس کتاب کو الفتح المبین الیہافی لعلو سندی ملک المحدثین القاضی جلال الدین الکنانی کے نام سے موسوم کیا۔ اس کتاب کی، ان بہت سے مشائخ نے جنھوں نے ان سے کوئی فائدہ حاصل کیا، نظم اور نثر میں تعریف کی اور اس تعریف میں حافظ سخاوردی کو بھی شامل کیا اور ان کو بھی! یہ سب چیزیں حافظ سخاوردی نے ان کو بھیج دیں جس سے وہ بہت خوش ہوئے اور اس کی وجہ سے ان کی بڑی توصیف کی اور لوگوں کو اس کے مندرجات سے آگاہ کیا۔

اس عالم دین نے ۹۲۹ھ کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون

ہوئے ۱۱۳ھ

۲۰۳۔ شیخ محمد بن محمود ٹھٹھوی سندھی

شیخ محمد بن محمود بن ابوسعید ٹھٹھوی سندھی، عالم کبیر اور بلادِ سندھ کے شیخ تھے۔ ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ ۹۷۰ھ میں فوت ہوئے۔ ۱۱۳ھ

۲۰۴۔ سید محمد بن منتخب امر وہوی

سید محمد بن منتخب بن کبیر بن چاند بن منتخب حسینی امر وہوی، میر عدل کے نام سے معروف تھے۔ سید شرف الدین سیسی نقوی کی اولاد سے تھے۔ امر وہی میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور حصولِ علم کے لیے سنبھل کا عزم کیا۔ وہاں شیخ حاتم بن ابو حاتم سنبھلی کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ ان سے خاصی مدت منسک ہے اور کتبِ درسیہ پڑھیں۔ حدیث اور دیگر علوم کی تحصیل سید جلال الدین باریونی سے کی اور ان کی خدمت میں رہ کر علوم میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ و تدریس کی مسند پر فائز ہونے کے لائق ٹھہرے۔

ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر مغل حکمران جلال الدین اکبر نے ان کو امارتِ عدل کے عہدہ پر فائز کر دیا تھا اور یہ میر عدلی کے لقب سے معروف ہو گئے تھے۔ یہ خدمت انھوں نے صوبلِ عرصہ تک انجام دی اور نہایت وقار و عظمت کے ساتھ اس کی نازک ذمہ داریوں کو نبایا۔ اپنی ذات میں یہ متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اور حدود اللہ کو قائم کرنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اپنی مثال آپ تھے۔ دین کے معاملے میں اتہاماتی متصلب، منکرات کے دشمن تھے۔ اہل ہوی اور غلط کردار

۱۱۳ھ ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۱۱۷، ۱۱۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۱۳ تا ۳۱۵۔

۱۱۴ھ آثارِ حبیبی، ج ۲، ص ۳۲۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۱۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۷۔

لوگوں پر شدید نیکر کرتے تھے اور اس ضمن میں کسی کی قطعاً پرواہ نہ کرتے۔ ان کے عہد میں بے دین اور ملاحدہ کو کسی امر شرعی میں مداخلت کرنے اور کسی کو دھوکا دینے کی جرأت نہ تھی۔ حتیٰ کہ قاضی القضاۃ بھی قضا و عدل کے معاملے میں دخل دینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ حاجی ابراہیم سرہندی نے ان کی موجودگی میں دربار میں بادشاہ کے سامنے زعفرانی اور سرخ لباس پہننے کا فتویٰ دیا تو سید موصوف نے ان کو سخت الفاظ میں ڈانٹا، ان کو تنبیہ کی اور ان کے خلاف فیصلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ خود بادشاہ ان سے مرعوب اور خوف زدہ تھا۔ اسی لیے انھیں ۹۸۴ھ کو بھکر منتقل کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں تھوڑی مدت اس خدمت پر مامور رہے اور ۹۸۶ھ میں وفات پا گئے۔ ۱۵ھ

۲۰۵۔ شیخ محمد بن منکن مملانوی

شیخ محمد بن منکن بن داؤد بن شہاب الدین رومی بکری مملانوی، ۱۹ محرم ۸۱۰ھ کو پانی پت میں پیدا ہوئے اور ذرا پیش سنبھالا تو ملا محمد سعید کے حلقہ میں شمولیت کی۔ ان سے فارسی کے کچھ رسائل، صرف و نحو کی چند کتابیں اور عربی میں فقہ کی بعض مختصرات پڑھیں۔ پھر لاہور آئے، لاہور سے ملتان کا عزم کیا اور وہاں زاویۃ شیخ بہار الدین زکریا میں سکونت اختیار کی۔ ملتان کے زمانہ قیام میں تمام کتب درسیہ اور کتب احادیث کی تحصیل مولانا حسین ملتان سے کی۔ پھر عازم حجاز ہوئے، سعادت حج بیت اللہ حاصل کی اور شاخ مکہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ گئے۔ وہاں ایک سال سات مہینے مقیم رہے۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور پانی پت میں شادی کی۔ اس کے بعد مشرقی ہند کے سفر پر روانہ

۱۵ھ منتخب التواریخ، ص ۳۰۴۔ طبقات الہری، ص ۳۸۴۔ نزهة الخواطر، ج ۴، ص ۴۱۸، ۴۱۹۔

ہوئے۔ اس سفر کے دوران لکھنؤ میں شیخ محمد اعظم حسینی کرناٹی اور ان کے مسقر شد شیخ محمد مینا اور شیخ سعد الدین سے ملاقات کی۔ وہاں سے شہر اودھ گئے، جسے اب اجودھیا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہاں شیخ احمد صوفی راوتی سے ملے، ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے اور سات سال ان سے منسک رہے۔ اب تصوف و طریقت کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اپنے آپ کو اخذ فیض کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں مختلف مقامات پر گئے اور متعدد مشائخ کی خدمت میں حاضری دی، خاصاً عرصہ ان کی صحبت و ملازمت اختیار کیے رکھی اور ان سے اخذ فیض کیا۔ سلاطین و امرا کے نزدیک بھی انھیں قدر و منزلت حاصل تھی چنانچہ ہندوستان کا فرماں رواں سکندر لودھی دہلی آکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے حکم سے اس کے لڑکے سلطان ابراہیم لودھی نے دہلی میں ان کا استقبال کیا۔ یہ دونوں لودھی حکمران ان کے نہایت عقیدت مند تھے۔

شیخ محمد بن منکن ملا نوبی، جہاں بہت بڑے عالم دین اور فقیہ تھے، وہاں مشہور صاحب طریقت بھی تھے۔ انھوں نے ایک سو ستائیس سال عمر پاکر یکم رجب ۹۳۷ھ کو وفات پائی۔

ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو تصوف و طریقت کے حوالے کر دیا تھا۔ درس و تدریس اور دیگر علمی مشاغل سے منقطع ہو گئے تھے۔ ۱۲۶

۲۰۶۔ سید محمد جون پوری

سید محمد بن یوسف جون پوری اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے۔ یہ دسویں صدی ہجری کے دیار ہند کی وہ شخصیت تھے، جنھوں نے مہدویت کا دعویٰ کیا اور اس

۱۲۶ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۱۸ تا ۳۲۰ بحوالہ مصباح العاشقین۔

کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان کے اہل علم میں بلکہ بیرونی دنیا کے پڑھے لکھے لوگوں میں بحث و مذاکرہ کا ایک نیا باب واہو گیا تھا اور فکر و نظر کے حلقوں میں حرکت و جنبش کی عجیب و غریب لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

سید محمد جون پوری ۸۴۷ھ کو جون پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ دانیال بن حسن عمری بلخی سے قرآن مجید حفظ کیا اور دیگر علوم کے لیے بھی پہلے پہل ان ہی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ابتدائے عمر ہی میں فضائل علم سے بہرہ ور ہو گئے تھے۔ ابھی پندرہ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ مباحثہ و مناظرہ کے میدان میں اتر آئے اور بڑے بڑے اہل علم سے نہایت جرأت اور اعتماد کے ساتھ دقیق سے دقیق علمی مسائل پر گفتگو کرنے لگے۔ اسی لیے اس نواج کے علما اور علم دوست حضرات نے ان کو ”اسد العلماء“ کا خطاب دیا تھا۔ بے حد ذکی، ذہین، معاملہ فہم، حاضر جواب اور صاحب مطالعہ تھے۔ عرصہ تک درس و تدریس اور افادۂ طلباء میں مصروف رہے۔ مختلف علوم و فنون پر گہری نظر رکھتے تھے اور وعظ و تذکیر اور بیان و تقریر میں اس دور کی عظیم المثال شخصیت تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ پیدا ہوا اور شیخ دانیال سے کسب فیض کیا۔ مدت تک ریاضت و مشاہدہ میں مشغول رہے۔ بعد ازاں وطن و علاقہ کو خیر باد کہا اور اہل و عیال اور تلامذہ و رفقا کے ساتھ سہاڑے کی چوٹیوں اور غاروں کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور مدتِ مدید تک انزا و علیٰ درگی کی زندگی اختیار کیے رکھی۔

اب ان کی زندگی نے نیا موڑ کاٹا اور اثنائے ہجر میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر چندیری آئے جو بلادِ مالوہ کا بہت بڑا شہر تھا۔ وہاں وعظ و خطابت کے سلسلے کا آغاز کیا اور بہت سے لوگ ان کے حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ اس دعوے کے نتیجے میں طبقہ، علما و مشائخ میں وہ اختلاف و نزاع کا ہدف بن گئے اور ولایتِ شہر کو ان کے اخراج پر مجبور کیا گیا۔ چنانچہ وہ چندیری کی سکونت ترک کر کے مالوہ کے دار الخلافہ منڈو چلے گئے۔ وہاں مالوہ کا حکمران غیاث الدین خلجی ان کا

معتقد ہو گیا اور شیخ الحداد نے ان کی بیعت کی۔ ماندو میں ان کی بڑی تعظیم کی گئی اور ان کے مرتبہ و منزلت میں بے حد اضافہ ہوا۔ وہاں سے علاقہ گجرات کے ایک شہر چانپانیر میں منتقل ہو گئے۔ چانپانیر میں انھوں نے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور رشد و ہدایت کا سلسلہ نہایت شد و مد سے شروع کیا۔ وہ عوام کو زہد و عبادت کی ترغیب دیتے، ترک دنیا کی تلقین کرتے اور شریعتِ فرا کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کا حکم دیتے تھے۔ ان کی شہرت اور نیکی سے اثر پذیر ہو کر مملکتِ گجرات کے حکمران سلطان محمود بیگہ نے بھی ان کی مجلس میں حاضر ہونے کا قصد کیا، مگر علمائے گجرات نے اس کو ان کے پاس جانے سے روکا اور ان کی نیکر کی۔ اس کے بعد وہ برہان پور اور دولت آباد سے ہوتے ہوئے احمد نگر پہنچے۔ اس سفر میں بعض مشہور شیوخ و علما بھی ان سے بیعت ہوئے۔ پھر وہ گلبرگہ (دکن) گئے۔ اور وہاں سے حرمین شریفین کا عزم کیا۔ مکہ مکرمہ پہنچے اور وہاں جا کر دوسری مرتبہ اپنی مدد و بیت کا اعلان کیا اور کہا: من تبعنی فہو معی من (جو میری اتباع کرے گا وہ مو من ہے)۔ یہ ۹۰۱ھ کا واقعہ ہے۔ اس موقع پر سب سے پہلے شیخ نظام اور قاضی علامہ الدین نے ان کی تصدیق کی اور ان کے دعویٰ مدد و بیت کو تسلیم کیا۔

مکہ مکرمہ سے مراجعتِ ہند کی اور گجرات کے شہر احمد آباد میں اقامت گزین ہوئے۔ وہاں بھی اپنے معمول کے مطابق تذکیر و مواعظت میں مصروف ہو گئے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے بیعت کی۔ احمد آباد میں ۹۰۳ھ کو تیسری مرتبہ علی رؤس الاشہاد اعلان مدد و بیت کیا۔ اس موقع پر علمائے احمد آباد نے متفقہ طور پر ان کو شہر سے نکال دینے کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ والی گجرات سلطان محمود نے ان کو شہر بدر کر دیا اور وہ ایک موضع سولہ سانچ چلے گئے۔ پھر پٹن اور وہاں سے بڑی کا قصد کیا جو پٹن سے تین میل کی مسافت پر واقع تھا۔ یہاں انھوں نے چوتھی مرتبہ اپنے دعویٰ مدد و بیت کا اعلان کیا، اس کے منکر کو کافر ٹھہرایا۔ علمائے اس باب میں ان کی تعقیب کی اور ان سے باقاعدہ مباحثہ کیا۔ بالآخر یہاں سے بھی ان

کو نکال دیا گیا۔

اب وہ گجرات سے نکلے اور سندھ کی راہ لی۔ سندھ کے لوگ ان سے بے حد متاثر ہوئے اور ایک جم غفیر نے ان کے مذہب میں شمولیت اختیار کی۔ ان کی سرگرمیوں اور کثرتِ متبعین کو دیکھ کر والی سندھ سخت پریشان ہوا اور ان کے قتل کا فیصلہ کیا مگر اس کے دذرا وندمانے اس کو اس اقدام سے روک دیا اور صرف علاقہ سندھ سے اخراج کے حکم کو کافی سمجھا۔ سندھ سے وہ اپنے اٹھتے ہوئے رفقا کے ساتھ خراسان اور پھر قندھار گئے۔ قندھار کے والی مرزا شاہی بیگ نے شہر کی جامع مسجد میں علما کا محضر طلب کر کے ان کو اس محضر میں پیش کیا۔ شیخ نے علما کے محضر میں ایک تقریر کی، جس میں وہ خود بھی روئے اور لوگوں کو بھی رُلایا۔ شاہی بیگ اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ یہ جہاں جی چاہے جائیں، ان کو کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے۔ قندھار سے وہ ایک شہر گئے جس کا نام فراہ تھا۔ اس شہر کا امیر ذوالنون ان کے پاس آیا اور انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس نے شاہِ خراسان سلطان حسین مرزا کے پاس آدمی بھیجا اور دریافت کیا کہ سید محمد جون پوری کے بارے میں کیا قدم اٹھایا جائے۔ اس کے جواب کے انتظار میں ان کو پورے نو مہینے وہاں ٹھہرنا پڑا لیکن سلطان مذکور کی طرف سے کوئی جواب آنے سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ جمعرات کے روز اور ۱۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ان کے پیروکار مختلف علاقوں میں پھیل گئے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے۔

شیخ محمد جون پوری، بہت بڑے عالم بھی تھے اور بہت بڑے مجاہد اور جنگ جو بھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلطان حسین شرقی جو جون پور کا آخری بادشاہ تھا اور سلطان ہملول لودھی کے ہاتھوں اپنا تخت و تاج کھو بیٹھا تھا، جب جون پور کے تختِ حکومت پر قابض تھا تو آخری دور میں مہدویوں کی روایت کے مطابق وہ والی گور راجہ دلیپ رائے کا خراج گزار

تھا۔ سید محمد نے وعظ و نصیحت کے ذریعے اس سے کہا کہ وہ اس غیر مسلم کو خرچ دینے سے انکار کر دے اور اس سے لڑائی کرے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سید محمد نے پندرہ سو بیراگی جوان ملازم رکھے تھے۔ جب لڑائی کا بازار گرم ہوا تو مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، لیکن سید محمد جون پوری اپنے پندرہ سو بیراگی جوانوں کے سمیت میدان میں ڈٹے رہے۔ بلکہ سید نے خود آگے بڑھ کر دلیپ رائے کو تہ تیغ کیا اور شکست کو فتح میں بدل دیا۔

مہدویوں کی روایت ہے کہ جب سید موصوف نے راجہ دلیپ رائے پر زور سے وار کیا اور ان کی تموار راجہ کا سر کاٹتی ہوئی سینے تک پہنچی تو دلیپ رائے کا دل باہر نکل آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مقتول راجہ جس بُت کی پوجا کرتا تھا، اس کی شکل اس کے دل پر کندہ ہے۔ یہ دیکھ کر ان پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی اور سطح ذہن پر یہ بات اُبھر آئی کہ اگر جھوٹے معبودوں کا اتنا اثر ہو سکتا ہے تو حقیقی معبود کا کس درجہ ہوگا۔ یہ کیفیت ان پر بارہ برس تک طاری رہی۔ جب اس سے افاقہ ہوا تو چالیس برس کی عمر میں وطن سے ہجرت کر کے جنگل کی راہ لی اور عرصہ تک مختلف علاقوں اور شہروں میں گھومتے پھرے۔

سید محمد جون پوری کے بارے میں مختلف حضرات نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعض انھیں صاحب مقامات عالیہ اور کشف و کرامات کا حامل قرار دیتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان کا دعویٰ مہدویت کشف پر مبنی تھا اور اس دعویٰ میں وہ غلطی پر تھے۔ بعض کے نزدیک وہ مبتدع اور ایک جدید مذہب کے بانی تھے۔ بعض کا خیال ہے وہ عارف باللہ تھے لیکن دعویٰ مہدویت میں سچے نہ تھے۔ بعض کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ درحقیقت صادق تھے، ان کی نیت نیک تھی، لیکن اس معاملے میں برسرِ حق نہ تھے، وہ غلط فہمی کی بنا پر اپنے آپ کو مہدی قرار دیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ان کا اور ان کے متبعین کا ذکر کیا ہے اور

ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

”میرا خیال یہ ہے کہ سید محمد اپنے اس دعویٰ میں سچے تھے کہ وہ مہدی ہیں اور ملک کی جو حالت اس وقت ہو رہی تھی، وہ یقیناً ایک مہدی کے ظہور کی مقتضی و منتظر تھی، نہ کہ ایک مفضل و دجّان کی! البتہ غلطی یہ ہوئی کہ لفظ مہدی کو انہوں نے مہدی آخر الزمان سمجھ لیا۔ چونکہ شہرت و انتظار عام طور پر اسی مہدی کی نسبت ہے، اور جب لفظ مہدی بولا جاتا ہے تو سب سے پہلے ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے، اور یہ رائے بھی اسی صورت میں ہے جب کہ خود ان کی نسبت مہدی آخر الزمان کا مدعی ہونا قطعی طور پر ثابت ہو جائے، ورنہ بہت ممکن ہے کہ ان کے قلب پر جو واردہ گزرا ہو، وہ صرف یہ ہو کہ انت المہدی۔ اسی کا اٹھنا نے اظہار کیا ہو، اور معتقدین نے شہرت عام کی بنا پر مہدی آخر الزمان سمجھ کر تمام علائم و آثارِ مہدیہ کو ان پر چسپاں کرنا شروع کر دیا ہو۔“

مولانا ابوالکلام نے سید محمد جون پوری اور فرقہ مہدیہ کے بارے میں خاصی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

”یہ فرقہ، سید محمد جون پوری کی طرف منسوب ہے، جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے۔ اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقائد میں بہت سی نئی نئی باتیں اور حدّ غلو سے بھی گزرے ہوئے اعتقادات شامل ہو گئے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی، یعنی دعوت و تبلیغ حق و احیائے شریعت و قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اس کا مقصد اصلی تھا۔ اور خود سید محمد اور ان کے پیروں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک باز اور خدا پرست لوگ تھے۔ اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں کچھ اور ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔ اور فتنہ غلو و تاویل کھلی

امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لیے بھی ایک بڑا افتخار رہا ہے یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت، اخلاف کے غلو و محدثات میں گم ہو گئی۔

آگے چل کر اس زمانے کے ہندوستان کی طوائف الملوکی، بدعات و منکرات کی کثرت، لوگوں کی احکام شرع سے روگردانی اور امور دینی سے انحراف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

”نویں صدی ہجری کا وہ زمانہ جو اکبر سے پہلے گزرا، ہندوستان میں سخت بدنامی اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ روز بادشاہ نہیں بنتی اور بگڑتی تھیں، اور کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی جو احکام شرع کے اجرا و قیام کی ذمہ دار ہوتی۔ علمائے حقانی بہت کم تھے اور علمائے دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دنیا طلبی اور کمرو زور کی گرم بازاری تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ جاہل صوفیوں کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ یہ حال دیکھ کر سید موصوف نے احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا اور لوگوں سے کہا کہ اب نہ کسی مجاہدہ کی ضرورت ہے اور نہ ذکر و شغل کی۔ سب سے بڑا مجاہدہ یہی ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگاؤ اور احکام شرعیہ کے قیام کی راہ میں اپنی جانیں تک لٹا دو۔ عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہزاروں آدمی حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور متعدد سلاطین وقت نے ان کی بیعت کی۔ ان لوگوں کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے، اور ایسے تھے کہ صحابہ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الہی کی ایک جلالی راہ جماعت تھی، جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتے پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک

دوسرے کے رفیق و غم گسار بن گئے تھے۔ امیر و فقیر، اعلیٰ و ادنیٰ، سب ایک حال اور ایک رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکام شرع کے اجراء قیام کے اور کسی کام سے واسطہ نہ رکھتے۔ ۱۹

سید محمد جون پوری نے اپنے متبعین و معتقدین کے لیے آٹھ اصول مقرر کیے تھے۔ رجن کا ذکر آگے آ رہا ہے، کہ وہ ان پر عمل کریں اور اپنی زندگیوں کو ان اصولوں کے قالب میں ڈھالیں، مگر انھوں نے ان کو قوانین شرع کی حیثیت دے دی اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو کافر ٹھہرایا۔ مثلاً ان اصولوں میں سے ایک یہ تھا کہ مال و دولت سے تعلق محبت منقطع کر لیں اور اس حد تک ایثار کا ثبوت دیں کہ اسے ضرورت مندوں اور مستحقین میں تقسیم کر دیں، لیکن ان کے معتقدین نے اس کو یہاں تک بڑھایا کہ جب مال سب کا مشترک ہے اور کسی ایک کی ملک نہیں تو پھر ورثے اور ترکے کا کیا مطلب؟ کسی کے اعزہ و اقارب کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے۔ یعنی انھوں نے اس کو قانونِ توریت کے مقابلے میں ایک قانونِ شرعی سے تعبیر کیا۔ اس طرح اور بھی بہت سے امور فرقہ مہدویہ نے اپنے مذہب میں داخل کر لیے تھے اور اس میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔

سید محمد جون پوری کی بعض حضرات نے مخالفت کی اور بعض نے موافقت۔ ان کے مخالفین میں بڑے بلند مرتبہ لوگوں کے نام تذکرہ در میں مرقوم ہیں جن میں شیخ علی متقی، شیخ ابن حجر مکی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ اسد کی افغانی تذکرہ ہیں، مگر ان میں سے کسی نے ان کی تکفیر نہیں کی۔ شیخ وجیبہ الہی پوری کے سامنے، جو اس دور کے بہت بڑے عالم تھے، جب سید محمد اور ان کے بعض متبعین کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا گیا تو انھوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ شیخ علی متقی نے مہدویہ کے غلو اور محدثات کے رد میں رسالہ لکھا، لیکن وہ خود

سید موصوف کی نسبت لکھتے ہیں کہ کف لسان اولیٰ ہے۔ سید رفیع الدین محدث جو بہ یک واسطہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تھے اور شیخ بڑھادانا پوری جو اس عہد کے استاذ الاستاذہ تھے، ملا عبد القادر بدایونی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”دیبا مہدویہ حسن ظن داشتند“
مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

”حضرت شاہ ولی اللہ کا قول شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک مکتوب میں نقل کیا ہے کہ سید محمد، عالم حق اور واصل بانہ تھے۔ بعض خواطر و واردات ان پر ایسے گزریں کہ ان کے درک و فہم میں در ماندہ و عاجز رہ گئے اور خود اپنے مقام کی نسبت دھوکے میں پڑ گئے۔ یہ بات نہ تھی کہ انھوں نے دانستہ غلط دعویٰ کیا ہو۔ حضرت مجدد صاحب اور مرزا منظر جان جاناں سے بھی ایسا ہی منقول ہے“
بہر حال اکثر مشائخ وقت اور علمائے حق یا تو ان سے حسن ظن رکھتے تھے یا اقلًا ان کے بارے میں توقف اور سکوت سے کام لیتے تھے۔

فرقہ مہدویہ، نظم و نسق کی مضبوط لڑی میں منسلک تھا، یہی وجہ ہے کہ سید محمد جون پوری کی وفات کے بعد بھی ان کی دعوت کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار علما و صلحا اور اپنے دور کے متقی و با اثر لوگ اس جماعت یا تحریک میں شامل ہوئے۔ کچھ اہل علم نے ان کی شدید مخالفت کی، جن میں علمی اعتبار سے شیخ علامتی کا نام قابل ذکر ہے، انھوں نے ان کے رد میں باقاعدہ کتاب لکھی مگر انھیں کافر کہنے سے سکوت اختیار کیا۔ اسی طرح سیاسی اعتبار سے مخدوم الملک عبداللہ انصاری نے ان کو ہدف تنقید ٹھہرایا اور مہدویوں کے اثر و رسوخ کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ مہدویہ جماعت کا ایک خاص نقطہ فکر تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ فرائض و واجبات قرآنی دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ احکام شامل ہیں، جن کا تعلق نبوت

اور شریعت سے ہے۔ ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلسان شریعت مفصل بیان فرمادیا ہے۔ دوسری قسم ان احکام کو محیط ہے جو ولایتِ محمدیہ سے متعلق ہیں۔ اب مشیتِ الہی کو منظور ہوا کہ ان احکام کی تبلیغ بھی ہو جائے۔ لہذا حضرت سید محمد مدنی مبعوث ہوئے، جو دافعِ ہلاکتِ امتِ محمدیہ، ناصرِ شریعتِ محمدی اور مبلغِ ولایتِ محمدی ہیں۔ مقامِ ولایت میں جو امور فرض ہیں اور ارکانِ دین کا درجہ رکھتے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

- ۱- ترکِ دنیا
- ۲- صحبتِ سادقین
- ۳- عزلت از خلق
- ۴- توکل علی اللہ
- ۵- طلبِ دیدارِ الہی
- ۶- عشر
- ۷- ذکرِ کثیر
- ۸- ہجرت

ان اصولوں کی پیروی مہمدیوں کے نزدیک ایک خاص انداز اختیار کرنی تھی، جس کی وجہ سے کئی مرتبہ حکومتِ دقت سے ان کا تصادم بھی ہوا، اور ان میں تشدد و تصلب کا رنگ غالب آیا۔ اس ضمن میں انھوں نے بارہا علمائے حق کی مخالفت بھی کی اور اس میں حد سے تجاوز نہ کر گئے۔ ۱۱۱

۱۱۱ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ منتخب التواریخ، حاشیہ ص ۲۷۱، ۲۷۲۔ مذکورہ طلبائے

ہند، ص ۱۹۷ تا ۲۰۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۲ تا ۳۲۶۔ روبر کوثر، ص ۲۰۲ تا ۳۲۲۔
 تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ تاریخِ معصومی، ص ۲۷۷۔ ائمہ تلبیس، حصہ دوم، ص
 ۲۹۲ تا ۳۱۸۔ تاریخِ شیرازہ ہند جون پور، ص ۶۸۳ تا ۶۸۷۔

۲۰۷۔ شیخ محمد بن یوسف برہان پوری

شیخ محمد بن یوسف بن کمال الدین قرشی ماوندی، ان کا لقب شیخ قطب الدین بن تاج الدین بن کمال الدین تھا اور شیخ بھکاری کے نام سے معروف تھے۔ اپنے دور کے عالم و فقیہ تھے۔ تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور ان کا شمار کبار مشائخ میں ہوتا تھا۔ ان کے جدِ امجد شیخ کمال الدین ہندوستان آئے اور رنتھنبور میں سکونت گزین ہوئے۔ وہیں شادی کی اور اللہ نے اولاد عطا کی جن میں ایک لڑکے کا نام شیخ یوسف تھا، جو بعد کو شیخ تاج الدین کے عرف سے معروف ہوئے۔ شیخ یوسف کی ولادت ۸۸۵ھ میں ہوئی۔ جوانی کو پہنچے تو ماٹو میں ان کی شادی کی گئی۔ شیخ قطب الدین محمد ۹۰۲ھ کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے علم ظاہری و باطنی کی تعلیم شیخ ابراہیم بن مبین الدین حسینی ایرجی سے حاصل کی اور خود ان سے قاضی ضیاء الدین عثمانی نبوتی اور بہت سے علماء و مشائخ نے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔

شیخ قطب الدین محمد بن یوسف عرف بھکاری اپنے دور کے فقیہ بھی تھے اور صاحبِ طریقت بزرگ بھی۔ انھوں نے ۱۲ ربیع الاول ۹۷۲ھ کو برہان پور میں وفات پائی۔ تصوف کے موضوع پر ان کی تصنیفات بھی ہیں، جن میں ایک کتاب کا نام جو اسرار ہے ۳۲

۲۰۸۔ شیخ محمد اوچی

شیخ محمد بن محمد اوچی، اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ فقہ اور دیگر علوم کے ماہر تھے۔ مدعی مہدویت شیخ محمد بن یوسف جون پوری، والی سندھ جام نظام الدین کے عہد میں سندھ گئے تو وہ ان کے قتل کے درپے تھا، مگر شیخ محمد بن محمد

۳۳ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۶۔ بحوالہ مجمع الابرار۔

اوپچی نے اس کو ان کے قتل سے باز رکھا۔ جب علاقہ ملتان میں فسادات پھیلے تو شیخ محمد بن محمد اویچ سے بھکر چلے گئے تھے اور وہاں سے ٹھٹھہ منتقل ہو گئے تھے۔ مرزا شاہ حسین والی سندھ نے ان کو قاضی شکر اللہ سندھی کی جگہ قاضی مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے مرزا عیسیٰ کے ایام حکومت میں وفات پائی اور مرزا عیسیٰ ۹۶۲ھ کو تختِ سندھ پر متمکن ہوا تھا۔

۲۰۹۔ مولانا مفتی محمد لاہوری

مولانا مفتی محمد لاہوری، شیخ وقت، عالم کبیر، محدثِ عصر اور باتفاقِ علماءِ حنبلیہ فضل و کمال تھے۔ لاہور کے منصبِ افتا پر فائز تھے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالمِ دین تھے۔ اپنے حلقہٴ درس میں صحیح بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کے اختتام کے موقع پر وسیع پیمانے پر دعوتِ طعام کا اہتمام کرتے، جس میں تمام علماء و مشائخ کو بلاتے اور لذت و عمدہ کھانوں سے ان کی تواضع فرماتے۔ عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ نوٹے سال کی عمر کو پہنچ کر کبرسنی کی بنا پر سلسلہٴ درس ترک کرنا پڑا۔

۲۱۰۔ شیخ محمد ناطلی فقیہ

شیخ محمد بن ابو محمد ناطلی، شافعی المسک تھے اور اپنے دور کے عالم و فقیہ تھے۔ علم فقہ پر ان کے عبور کا یہ عالم تھا کہ لفظ فقیہ ان کے نام کا جز ہو گیا تھا اور یہ فقیہ محمد ناطلی کے نام سے معروف تھے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ موش سنبھالا تو حجاز تشریف لے گئے۔ شیخ علی متقی سے اخذِ علم کیا۔ سال میں چھ مہینے مکہ مکرمہ میں گزارے۔

۳۳۳ھ تحفۃ الکرام، ص ۵۹۳، ۶۵۵، ۶۵۶ — تاریخِ معصومی، ص ۲۸۰ — آثارِ رحیمی

ج ۲، ص ۳۲۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۲۶۔

۳۳۴ھ منتخب التواریخ، ص ۳۳۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۷۷۔

رکھتے اور چھ مہینے مدینہ طیبہ رہتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب زاد المتقین میں ان کا ذکر کیا ہے شیخ محمد فقیہ ناطلی نے مدینہ منورہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے ۳۵

۲۱۱۔ قاضی محمد تھانیسری

قاضی محمد بن ابو محمد حنفی تھانیسری، کبار علما میں سے تھے۔ اپنے دور کے عالم دین اور فقیہ تھے۔ شیخ رکن الدین محمد بن عبد القدوس گنگوہی نے لطائف قدوسی میں ان کا ذکر کیا ہے ۳۶

۲۱۲۔ مولانا محمد حسین یزدی

شیخ محمد حسین یزدی اپنے دور کے مشاہیر و کبار علما میں سے تھے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت میں ممتاز درجے پر پہنچے۔ تفسیر اور حدیث کے ماہر تھے تحصیل علم کے بعد دارِ ہند ہوئے تو دہلی میں سکونت اختیار کی۔ صاحب تصنیفات تھے۔ شمائل ترمذی پر ایک بسیط و مفصل شرح سپردِ قلم کی۔ شمائل پر ایک منظوم رسالہ بھی تحریر کیا۔ ۹۸۱ھ کو دہلی میں وفات پائی ۳۷

۲۱۳۔ مولانا محمد درویش جون پوری

مولانا محمد درویش حسینی واسطی جون پوری، نواح غازی پور کے ایک قریہ نونہر

۳۵ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۲۸ بحوالہ زاد المتقین۔

۳۶ لطائف قدوسی، ص ۴۲، ۴۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۳۰

۳۷ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۳۱ بحوالہ تحفۃ الکرام۔

میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصولِ علم کے لیے جون پور کا قصد کیا۔ وہاں شیخ مبارک بن خیر الدین جون پوری کے زاویہ میں رہنے لگے اور علوم میں تبحر و پختگی کے مرتبے کو پہنچے۔ وہ شیخ وقت اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کا شمار صلح اور متقی علمائے دین میں ہوتا تھا۔ سلسلہ نسب سولہ واسطوں سے حضرت زید بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم تک منتهی ہوتا ہے۔ بحث و اشتغال کے باہر تھے اور افتاد تدریس کی مسند پر فائز تھے۔ شیخ مبارک جون پوری نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔ جون پور میں سکونت اختیار کر لی تھی، تمام عمر وہاں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۷ ار ذی الحجہ ۹۹۸ھ کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے پٹلے

۲۱۲۔ مولانا محمد سعید خراسانی المعروف میر کلاں

مولانا محمد سعید بن مولانا خواجہ حنفی خراسانی میر کلاں کے نام سے معروف تھے۔ حنفی المساک تھے اور اپنے دور کے شیخ، عالم دین اور محدث تھے۔ وسعتِ معلومات کی بنا پر کبار علما میں سے گردانے جاتے تھے۔ علامہ عصام الدین ابراہیم بن غرب شاہ اسفرائینی اور دیگر علمائے عصر سے اخذِ علم کیا۔ پھر سید نسیم الدین میرک شاہ بن جمال الدین حبیبی ہروی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ایک عرصہ ان کی صحبت میں رہے۔ بعد ازاں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی مگر کربلا میں خاصی مدت اقامت اختیار کیے رکھی۔

عالم کبیر، محدث اور محقق تھے۔ یوں تو سب علوم مروجہ کے باہر تھے۔ لیکن حدیث میں بالخصوص یدِ طولیٰ حاصل تھا اور اس کے تمام پہلوؤں پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں طریقت و تصوف اور رشد و صلاح کی راہوں پر بھی گام زن تھے۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں مشکوٰۃ کے شارح شیخ ملا علی قاری ہروی صاحب مرقاۃ، سید غضنفر بن جعفر حسینی ہنروالی اور بے شمار علماء شامل ہیں۔ نہایت کثیر انفوان بزرگ تھے۔

یہ وہ ہندی عالم دین ہیں جن کے سامنے محدثِ ذہراں اور صاحب تصانیف کثیرہ ملا علی قاری نے زانوئے تلمذتہ کیا۔ ان کی فراوانی علم و فضل کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے ان کو شہزادہ نور الدین محمد جہاں گیر کا اتالیق مقرر کیا تھا اور وہ ان سے بدرجہ غایت تعظیم و توقیر سے پیش آتا تھا۔

مولانا میر کلاں فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اسمائے حسنی کی منظر تھی۔ والدہ کے اس درجہ فرماں بردار تھے کہ اس خیال سے شادی نہیں کی کہ کہیں بیوی ان کی نافرمان نہ نکلے۔ وہ سیدہ اپنے بیٹے کے انتقال کے وقت زندہ تھیں اور ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ جب بیٹے کا انتقال ہوا، قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھیں۔ عزیزوں نے سعادت مندی بیٹے کی وفات کی اطلاع دی اور تجویز دیکھنے کی اجازت طلب کی تو اس نیک بخت خاتون نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، اجازت دی اور تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئیں۔ نختِ جگر کی موت پر زبان سے کسی قسم کی بے قراری اور حزن و ملال کا اظہار نہیں کیا۔

دسویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کے اس عظیم المرتبت عالم نے اسی سال عمر پانچا کر ۹۸۱ھ کو آگرہ میں وفات پائی۔ ۳۹۹ھ

۲۱۵۔ قاضی محمد معین لاہوری

قاضی محمد معین لاہوری، حنفی المسک تھے۔ مشہور و پرتاثر واعظ شیخ وقت اور زور

۳۹۹ منتخب التواریخ، ص ۳۱۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۳۱، ۳۳۲۔ تذکرہ علمائے ہند

ص ۲۳۰، ۲۳۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۸۵۔

علم سے آراستہ تھے۔ اپنے عصر کے مشہور فقہاء میں سے تھے۔ معارج النبوت کے مصنف ان کے پوتے تھے۔ لاہور کے منصب قضا پر فائز تھے۔ طویل مدت تک اس مسند پر متمکن رہے اور کبر سنی کی وجہ سے اس سے الگ ہوئے۔ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں بہت مشہور تھے۔ ان کا اصل مشغلہ یہ تھا کہ مختلف کتابیں معرض کتابت میں لاتے، ان کی تصحیح کرتے اور پھر پڑھنے کے لیے طلباء کو دیتے۔ وہ اس پر اپنی گرہ سے رقم خرچ کرتے تھے۔ فیصلوں میں احتیاط کا یہ حال تھا کہ کہتے ہیں اپنے زمانہ قضاآت میں ایک مقدمہ بھی فیصل نہیں کیا۔ اگر مدعی فیصلے پر اصرار کرتا تو اسے انتہائی عاجزی سے کہتے، خدا راتم دونوں آپس میں صلح کر لو تاکہ میں تمہارے جھگڑے میں اللہ کے نزدیک پکڑا نہ جاؤں اور مجھے اس کے دربار میں شرم سار نہ ہونا پڑے۔ فریقین سے کہتے، تم دونوں دانا ہو، مجھ ایک نادان کو، دو داناؤں سے سابقہ آپڑا ہے، خدا راتم دونوں مجھے اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ نہ کرو۔

اگر کوئی عورت، شوہر کے غائب ہونے کی بنا پر تفریق کا مطالبہ کرتی تو وہ تاحداً امکان اپنے پاس سے اس کو خرچ دیتے اور کہتے، یہ رقم لو اور شوہر کا انتقا کرو۔ اس سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔

اپنی آمدنی، جو اس زمانے میں بہت معقول تھی، تمام تر کاتبوں پر خرچ کر دیتے۔ مختلف کاتبوں سے قیمتی اور عمدہ کتابیں اکھوتے، ان کا مقابلہ و تصحیح کراتے اور پھر جلد بندھوا کر طالب علموں کو مفت تقسیم کر دیتے۔ زندگی بھر ان کا یہی مشغلہ رہا اور لوگوں کو ہزاروں کتابیں بخش دیں۔

انتقال کے بعد ان کے دو لڑکے تھے، ایک پہلوانی میں اور دوسرا کبوتر بازی میں مشہور تھا۔ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کی مجلس میں بھی ان کے ان مشاغل کا ذکر آیا۔ اس نے دونوں کو بلایا اور ان کے کھیل تماشے دیکھے۔ اس عالم دین اور نامور فقیہ نے ۹۹۵ھ کو لاہور میں انتقال کیا۔ ۱۰۰۰ھ

۲۱۶۔ میرک محمود بن ابوسعید سندھی

شیخ محمود بن ابوسعید ٹھٹھوی سندھی، میرک محمود کے نام سے مشہور تھے۔ حنفی مسک کے حامل تھے۔ اپنے وقت کے شیخ اور عظیم عالم تھے۔ ان کا شمار فقہاء حنفیہ اور ان کے مشاہیر علماء میں ہوتا تھا۔ نقل احکام میں ممتاز اور علم فتویٰ میں اپنے دور کے منفرد عالم تھے۔ بیک وقت متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ نہایت خوش خط تھے اور خطِ نستعلیق میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حسن اخلاق میں یکتا، میل جول میں بے نظیر، بے حد نرم مزاج اور منکسر و متواضع بزرگ تھے۔ زہد و عبادت اور جود و سخا میں اپنی مثال آپ تھے۔ والی سندھ مرزا شاہ حسین نے ان کے اوصاف گوناگوں اور علمی و طبعی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو سرزمینِ سندھ کا شیخ الاسلام مقرر کر دیا تھا۔ تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔

اس بلند مرتبت عالم و فقیہ نے ۹۶۲ھ کو وفات پائی۔ بعض علمائے ان کی تاریخ وفات ”رفت میرک آہ آہ“ سے نکالی ہے۔ اللہ

۲۱۷۔ قاضی محمود بن احمد نانٹلی

قاضی محمود بن احمد بن ابو محمد نانٹلی بیجاپوری، شیخ عصر اور فقیہ تھے۔ علم ظاہری اور سلوک و طریقت سے بہرہ مند تھے۔ مدت تک منصبِ قضا پر فائز رہے۔ پھر سفر حج پر روانہ ہوئے، وہاں علم کی دولت حاصل کی۔ بعد ازاں واپس بیجاپور آئے اور وہیں عالم آخرت کو سدھارے۔ ان کی وفات کے بعد ۹۹۴ھ کو ان کے بیٹے رضی الدین مرتضیٰ مسندِ قضا پر متعین ہوئے۔ غالباً قاضی محمود بن احمد نانٹلی

۱۵۵ تاریخ معصومی، ص ۲۷۳ — تحفۃ الکرام، ص ۲۳۶ — تذکرہ علمائے ہند،

ص ۲۱۷ — نزہۃ الخاطر، ج ۴، ص ۳۳۳ — آثار رحیمی، ج ۲، ص ۳۱۹، ۳۲۰۔

کی وفات ۹۹۴ھ کو ہوئی ۲۱۸ھ

۲۱۸- شیخ محمود بن بابو گجراتی

شیخ محمود کا نسب نامہ یہ ہے۔ محمود بن بابو بن صدر الدین بن جلال الدین بن ایاس عمری۔ یہ شیخ قطب الدین محمود گجراتی کے نام سے مشہور تھے۔ ۸۵۶ھ کو گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ سید محمد بن عبداللہ بن محمود حسینی بخاری گجراتی سے علم حاصل کیا۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے اور صالح علمائیں سے گردانے جاتے تھے۔ اپنے علاقے کی مسندِ مشیخت پر فائز تھے۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ و استفادہ کیا۔ ۱۰ جمادی الاخریٰ ۴۳۳ھ کو فوت ہوئے اور جان پور میں دفن کیے گئے۔ ۲۱۸ھ

۲۱۹- ملک محمود بن پیارو گجراتی

ملک محمود گجراتی کے والد ملک پیارو، برہان پور کے وزیر تھے۔ ۹۴۴ھ میں انھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد ان کے بیٹے محمود گجرات گئے اور وہاں سید عرب شاہ حسینی بخاری گجراتی کے سلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان سے اخذِ طریقت کیا اور حرمین شریفین چلے گئے۔ حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور واپس ہندوستان آ گئے۔ حنفی مسک کے حامل تھے۔ بہت بڑے عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ گجرات کے مشاہیر فضلا میں سے تھے۔ چوں کہ حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ملک محمود کے نام سے معروف تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کے جلیل القدر عالم تھے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد جلال الدین کبر

۲۱۸ھ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۳ بحوالہ تاریخ النوائط۔

۲۱۹ھ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۳۴۔

کے پاس آگرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ نہایت فصیح اللسان، مدبر اور دانش ور تھے۔ اسی بنا پر بادشاہی محفلوں میں اکبر کی میزبانی کا انھیں شرف حاصل تھا۔ اولیاء اللہ کے بڑے معتقد تھے، یہی وجہ ہے کہ اکبر نے ان کو شیخ معین الدین چشتی کے مرقا کا مولیٰ مقرر کر دیا تھا۔ بعد ازاں اس منصب سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ۹۸۵ھ میں اکبر سے ہجرت جانے کی درخواست کی۔ اکبر ان کے اخلاص، حسن نیت، علم و فضل اور عذوبت کلام سے بہت متاثر تھا، لہذا اجازت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ بالآخر بڑے پس و پیش کے بعد اجازت دینا پڑی اور وہ احمد آباد چلے گئے۔ وہاں توکل و تقا اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔

فارسی پر عبور رکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ یہ شعر ان ہی کا ہے :
 دارم دلی گرداں کہ من قبلہ نمائی خویش روسوئے ابرویش کند ہر چند می گردنیش
 ارض ہند کے اس عالم و فقیہ اور مردِ جلیل نے ... احمد آباد میں دفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ۱۰۱۵ھ

۲۲۰۔ قاضی محمود بن حامد گجراتی

قاضی محمود بن حامد بن محمد علوی پیر پوری گجراتی، شیخ وقت، فقیہ اور عابد و زاہد تھے۔ پہلے احمد آباد میں سکونت پذیر تھے۔ بعد کو ۹۲۰ھ میں احمد آباد کے قریب ایک گاؤں میں منتقل ہو گئے تھے، جس کا نام پیر پور تھا۔ وہاں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ عالم دین ہونے کے ساتھ صاحبِ طریقت بھی تھے۔ ۶۷ سال کی عمر پر ۱۳ ربیع الثانی ۹۴۱ھ کو پیر پور میں فوت ہوئے۔ ان کے والد قاضی حامد گجراتی قاضی چاند کے نام سے معروف تھے۔ ۱۰۱۵ھ

۱۰۱۳ھ منتخب التواریخ، ص ۳۲۶۔ اذکار ابرار، ص ۳۹۶۔ نزهة الخواطر، ج ۲، ص ۳۳۴، ۳۳۵۔

۱۰۱۵ھ اذکار ابرار، ص ۳۳۶، ۳۳۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۶۔ نزهة الخواطر، ج ۲، ص ۳۳۵، ۳۳۶۔

۲۲۱۔ مفتی محمود بن عطار اللہ امر وہوی

مفتی محمود کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ محمود بن عطار اللہ بن میران بن خطیر بن محمود بن عثمان بن مودود بن خطیر حسینی مودودی امر وہوی، شیخ عصر، عالم باعمل اور فقیہ تھے۔ سلطان بہلول لودھی ان کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کو شہر امر وہہ کی مسند قضا پر فائز کیا اور ان کے علم و فضل کی وسعت سے متاثر ہو کر ۸۷۰ھ میں اعلم العلماء اور ملک العلماء کے دو خطاب عطا کیے۔ تمام عمر امر وہہ کے منصبِ افتا پر متمکن رہے۔ ہند کے اس عالم دین نے ۹۱۷ھ میں انتقال کیا ۱۰۲۵ھ

۲۲۲۔ قاضی محمود گجراتی

قاضی محمود بن ابو محمود مورپی گجراتی، ایک قریہ مورپ میں پیدا ہوئے، جو اعمالِ گجرات میں واقع تھا۔ وہیں پلے بڑھے اور علم حاصل کیا۔ یہاں تک کہ علومِ مروجہ میں راسخ ہو گئے اور خطہ ہند کے بہت بڑے عالم، فقیہ اور شیخ شمار کیے گئے۔ طریقت سے بھی تعلق تھا۔ یہ علم شیخ لشکر محمد عارف سے اٹھا کیا۔ شیخ لشکر نے ان سے فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کا درس لیا اور انھوں نے شیخ لشکر سے نقد النصوص اور مرآة العارفین وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ شیخ محمود کافی عرصہ درس و تدریس میں بھی مصروف رہے۔ زمانہ تدریس میں ان سے مولانا موسیٰ سندھی اور حکیم عثمان سندھی نے علومِ عربیہ اور علمِ نحو کی تحصیل کی۔

دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم کے سن ولادت اور سن وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ ۱۰۷۵ھ

۱۰۷۵ھ نزہۃ الخواصر ج ۲، ص ۳۳۷۔

۱۰۷۵ھ اذکار ابرار، ص ۳۶۹۔ نزہۃ الخواصر، ج ۲، ص ۳۳۸، ۳۳۹۔

۲۲۳۔ میر مرتضیٰ شریفی شیرازی

میر سید مرتضیٰ شریفی شیرازی، شیعہ تھے اور اپنے دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ سید شریف الدین علی جرجانی کی اولاد سے تھے۔ منطق و حکمت، ریاضی، انشا و شعر اور دیگر علوم کے ماہر تھے اور ان پر مجتہدانہ عبور رکھتے تھے۔ نہایت اعتماد کے ساتھ ان علوم کی تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آگرہ میں ان کا سلسلہ درس جاری تھا، جس میں بے شمار علمائے استفادہ کیا۔

میر مرتضیٰ نے منطق و حکمت کی تحصیل شیخ عبدالصمد بنداری سے کی اور حدیث کے لیے سید میرک شاہ کے سامنے زانوائے تلمذ تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسماعیل صفوی کے دورِ حکومت میں خراسان کی مسندِ صدارت پر متمکن ہوئے اور کافی عرصہ یہ خدمت انجام دی۔ بعد ازاں حج و زیارت کا قصد کیا اور مکہ مکرمہ میں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ پھر عازم ہند ہوئے اور دکن میں سکونت اختیار کی۔ دکن سے عازم آگرہ ہوئے۔ وہاں نہایت سکون کی زندگی بسر کی۔ علم نحو میں منظومہ الکافیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ فارسی کے شاعر تھے اور شریفی تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ ۹۴۲ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ ۱۰۲۸ھ

میر مرتضیٰ شریفی کو دہلی میں امیر خسرو کی قبر کے قریب دفن کیا گیا تھا۔ جب لوگوں نے صدر الصدور، قاضی شہر اور شیخ الاسلام سے کہا کہ امیر خسرو ہندی اور سنی ہیں، اور میر مرتضیٰ عراقی اور شیعہ ہیں، اس لیے دونوں کی رُوح ایک دوسرے سے اذیت محسوس کرے گی؛ چ۔

روحِ راصحبتِ ناجنسِ عذابیتِ الیم

۱۰۲۸ھ منتخب التواریخ، ص ۳۳۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔ نزهة الخواطر، ج ۴، ص ۳۵۰۔

نو شاہی حکم کے مطابق ان کی نعش وہاں سے نکال کر مشہد لے جانی گئی۔ اس ضمن میں تذکرہ علمائے ہند کے فارسی الفاظ یہ ہیں:

چوں صدور و قاضی و شیخ الاسلام بعرض رسانیدند کہ امیر خسرو ہندی است و سنی، و میر مرتضیٰ عراقی است و شیعہ، درینکہ روح ہر دو از صحبت یکدیگر متاثری باشند شکی نیست؛

روح را صحبتِ ناجنس عذابیت الیم

پس بموجب حکم عالی نعش او، ازاں جا کشیدہ بہ مشہد بردند۔

میر محسن رضوی نے یہ تاریخ وفات نکالی:

رفت تا میر مرتضیٰ از دہر علم گویا ز نسلِ آدم رفت

بہر تاریخِ رحلتش محسن گفت علامہ ز عالم رفت

میر مرتضیٰ فارسی کے شاعر تھے۔ یہ شعر ان ہی کا ہے:

خاطر جمع از اسباب میسر نہ شد تخم جمعیت دل تفرقہ اسباب است

انھوں نے ۹۴۲ھ کو وفات پائی ۹۴۹ھ

۲۲۲۔ مولانا مرشد الدین صفوی

مولانا مرشد الدین بن رفیع الدین محدث حسینی صفوی شیرازی ثم اکبر آبادی، شیخ وقت اور صالح عالم دین تھے۔ علم و طریقت کی آغوش میں تربیت پائی اور اونچے مرتبے کو پہنچے۔ اپنے والد گرامی شیخ رفیع الدین محدث شیرازی سے اخذ علم کیا اور ان کی وفات کے بعد مسند تدریس کو زینت بخشی۔ نہایت سخی، بے حد فیاض اور پیکیر جو دو کرم تھے۔ اکبر آبادی (آگرہ) میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔

۹۴۹ھ منتخب التواریخ، ص ۳۲۳۔ طبقات اکبری، ص ۳۰۹، ۳۱۰۔ تذکرہ

علمائے ہند، ص ۳۲۳، ۳۲۴۔ نزهة الخواجا، ج ۵، ص ۳۵۰

دسویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ ۱۵ھ

۲۲۵۔ شیخ مصطفیٰ بن عبدالستار سہارن پوری

شیخ مصطفیٰ بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری، اپنے دور کے فقیہ اور شیخ و زاہد تھے۔ ان کا شمار کبار علمائے ہند میں ہوتا تھا۔ مدتِ مدید تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ بحر تصوف و طریقت کے شناس اور تھے اور اس سلسلے میں شیخ رکن الدین گنگوہی کے فیض یافتہ تھے۔ ۴ شعبان ۱۰۰۰ھ کو فوت ہوئے ۱۵ھ

۲۲۶۔ شیخ مصلح الدین لاری

شیخ مصلح الدین لاری، حنفی المسک تھے۔ فاضل عصر اور علامہ دوراں تھے۔ علوم عربیہ اور معارفِ حکمیہ میں اپنے تمام اقران و معاصرین میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ طویل مدت تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں والی سندھ مرزا شاہ حسین بھی شامل تھا۔ بے شمار علما و طلبانے ان سے اخذِ علم کیا۔ ۹۶۰ھ میں مکہ مکرمہ گئے اور پھر واپس ہندوستان میں آئے۔ اونچے درجے کے مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات ہیں۔

- ۱۔ شمائلِ ترمذی کی بسیط و مفصل شرح۔
- ۲۔ تفسیر بیضاوی پر تعلیقات
- ۳۔ شرح المنطق۔ یہ کتاب فارسی میں ہے۔

۱۵ھ اذکار ابرار، ص ۳۱۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۵۰

۱۵ھ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۵۴، بحوالہ مرآت عالم۔

۴- الرسالة فی بحث تمام المشترك۔

۵- الرسالة فی بحث القدرة والادادة۔

۶- الرسالة فی بحث الحركة۔

۷- الرسالة فی تحقیق المعاد والمبدء۔

۸- شرح تہذیب المنطق

۹- شرح ہدایۃ الحکمتہ

معاصر رحیمی میں ان کے حالات میں درج ذیل الفاظ مرقوم ہیں۔
مولانا مصلح الدین لاری علوم عربیہ را خواب می دانستہ۔ با فادۃ درس مرزا شاہ حسین
مشغول بودہ، و در نہصد و شصت بمکر رفت۔ شرح شمائل نبوی و حاشیہ تفسیر
بیضاوی و شرح منطق و دیگر رسائل مشہور دارد۔

یعنی مولانا مصلح الدین لاری علوم عربیہ پر بہت عبور رکھتے تھے مرزا شاہ حسین
والی سندھ کے استاذ تھے۔ ۹۶۰ھ میں مکہ مکرمہ کا سفر کیا۔ شرح شمائل نبوی، حاشیہ
تفسیر بیضاوی، شرح منطق اور دیگر رسائل ان کی تصنیفات ہیں۔

تاریخ معصومی میں ان کے حالات میں جو الفاظ لکھے گئے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے،
مولانا مصلح الدین لاری انتہائی دانش مند اور متبحر عالم تھے اور علوم عربیہ میں
اچھی مہارت رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ مرزا شاہ حسین کو بھی درس دیتے رہے۔ ۹۶۱ھ
میں اجازت لے کر حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ گئے۔ شرح شمائل نبوی، حواشی تفسیر
بیضاوی، شرح منطق اور دیگر رسالے ان کی تصانیف میں سے ہیں۔
اپنے دور کے اس جلیل القدر عالم دین نے ۹۷۹ھ کو وفات پائی۔ ۳۵۵ھ

۳۵۵ھ تاخر رحیمی، ج ۲، ص ۳۲۰۔ تاریخ معصومی، ص ۲۸۰، ۲۸۱۔ نذرینۃ الخواص ج ۴

ص ۳۵۴، ۳۵۵۔ عربی ادبیات میں پاک و بہتر کا حصہ، ص ۳۵۵۔

۲۲۷۔ سلطان مظفر حلیم والی گجرات

والی گجرات سلطان مظفر بن محمود، اپنے دور کا وہ بادشاہ تھا جو بیک وقت متعدد اوصاف کا حامل تھا۔ عالم و فاضل بھی تھا اور عادل و مصنف بھی، محدث و فقیہ بھی تھا اور منسک و متواضع بھی، جنگ جو بھی تھا اور حلیم الطبع بھی، ماہر حرب و ضرب بھی تھا اور صلح کل بھی، فاتح و کشور کشا بھی تھا اور رحم دل بھی، بہادر و جری بھی تھا اور انتہائی نیک و متقی بھی، مجاہد بھی تھا اور کریم النفس بھی۔ علما کا بدرجہ غایت قدر دان اور علم پرور بادشاہ تھا۔ جمعرات کے روز ۲۰ شوال ۸۷۵ھ کو ارض گجرات میں پیدا ہوا۔ سلطنت و حکومت کے ماحول اور علم و فضل کی آغوش میں تربیت پائی۔ سلطان محمود نے اپنے اس بیٹے کی تعلیم کے لیے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا۔ ابتدائی تعلیم علامہ مجد الدین محمد بن محمد ابی اور دیگر علمائے عصر سے حاصل کی۔ کتب احادیث ان سے بھی پڑھیں اور وقت کے مشہور شیخ و محدث جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک حمیری حضرمی المعروف بہ بحر حق کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ سلطان مظفر حلیم تمام اصناف علم کا ماہر اور اخلاق حمیدہ کا پیکر تھا۔ انتہائی نرم خور و متحمل مزاج تھا۔ اپنے علم کی بنا پر وہ مظفر حلیم کے نام سے معروف ہو گیا تھا۔ یعنی لفظ "حلیم" اس کے نام کا مستقل جز بن گیا تھا۔ علم و ادب اگرچہ اول درجہ ہی سے اس کے خاندان میں موجود تھا، مگر اس نے باقاعدہ اساتذہ و وقت سے تعلیم حاصل کی اور اس سلسلے میں اپنے اسلاف سے سبقت لے گیا۔

مظفر حلیم بیالیس سال کی عمر میں منگل کے روز سہ رمضان المبارک ۹۱۷ھ کو اپنے باپ کی وفات کے بعد گجرات کے تخت حکومت پر متمکن ہوا اور نہایت عدل و انصاف کے ساتھ اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ تقویٰ و طہارت، عزیمت و شجاعت اور عفو و درگزر میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ لوگوں کی غلطیاں دیکھتا اور نظر انداز کر دیتا۔ اس معاملے میں ہمیشہ تسامح سے کام لیتا۔ اونچے درجے کا خوش نویس تھا۔ ہر قسم کے مرد و عورتوں کو

کا ماہر تھا۔ خط نسخ، خط ثلث اور خط رقاہ میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ قرآن مجید کی کتابت اپنے ہاتھ سے کرتا اور حرمین شریفین بھیجتا۔ قرآن سے اس کو بہت ہی لگاؤ تھا۔ اپنے باپ کی زندگی میں عالم شباب میں حافظ قرآن ہوا

اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ ہر قول و فعل میں آثار سنت نبویہ کو ملحوظ رکھتا اور نصوص حدیث پر عمل کی بنیادیں استوار کرتا۔ موت کو کثرت سے یاد کرتا اور اس کے ڈر سے آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ علما و مشائخ کی تعلیم و تکریم میں مبالغے کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔

ہر وقت با وضو رہتا، نماز باجماعت کی پابندی کرتا، رمضان کے روزے رکھتا، مکروہات و محرمات سے دامن کشاں رہتا، اپنے آپ کو اسراف و تبذیر سے محفوظ رکھتا اور فضول خرچی کا تصور بھی دل میں نہ لاتا۔ گزشتہ دور کے ملوک و سلاطین کے حالات کا مطالعہ کرتا، عام طور پر دن اور رات کو بھیس بدل کر شہر میں گھومتا اور رعیت کے حالات سے بذات خود مطلع ہونے کے لیے کوشاں ہوتا۔

اس کی زندگی کے بہت سے عجیب و غریب واقعات کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ معدلت گستری اور عدل پروری میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ ملک کی حفاظت اور اس کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع میں انتہائی تیز تھا۔ گجرات کے اس عالم و ضل اور محدث و فقیہ سلطان نے کم و بیش پندرہ سال اورنگ سلطنت پر متمکن رہنے کے بعد ۲ جمادی الاولیٰ ۹۳۲ھ کو وفات پائی ۳۱۵ھ

۲۲۸۔ قاضی منجھلہ جون پوری

قاضی منجھلہ جون پوری، شیخ اور فقیہ تھے۔ چوں کہ وہ فقہ اور علوم عربیہ میں کامل

۳۱۵ھ تفصیلات کے لیے دیکھیے: مرآت احمدی، ج ۱، ص ۶۶ تا ۷۱۔ تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۲۷۱

ص ۳۱۳ تا ۳۲۲۔ مرآت سکندری، ص ۱۳۵ تا ۱۹۲۔ آثار جمعی، ج ۲، ص ۱۵۱ تا ۱۶۴۔

دسترس رکھتے تھے، لہذا انہیں جون پور کا قاضی مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس منصب پر وہ طویل عرصہ تک فائز رہے۔ بعد ازاں طبیعت تصوف کی طرف مائل ہوتی تو شیخ علی بن قوام الدین حسینی جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اخذِ طریقت کیا۔

۲۲۹۔ شیخ منجمن کمال پوری

شیخ منجمن شطاری کمال پوری، عالم اور صالح بزرگ تھے، نہایت متورع اور متقی فقیہ تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں انتہائی شدت سے کام لیتے اور سختی سے لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے تھے۔

۲۳۰۔ شیخ منصور لاہوری

شیخ منصور بن ابو منصور حنفی لاہوری، اپنے دور کے فاضل آدمی تھے علومِ عربیہ، علمِ نحو اور اکثر مروجہ علوم و فنون میں شہرت و مہارت رکھتے تھے۔ شیخ سعد اللہ لاہوری کے داماد تھے اور ان علوم کی تکمیل ان ہی سے کی تھی۔ اس زمانے کے ایک اور عالم دین شیخ اسحاق بن کاکو کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہ کر استفادہ کرتے رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسند تدریس پر متمکن ہوئے اور علماء و طلباء کو مستفید فرمایا۔ نہایت خوش مزاج، سلیم الطبع اور فہیم تھے۔ بحث و مناظرہ میں علم و دلائل کے زور سے حریف پر چھا جاتے۔ ان کی گرفتِ استدلال بڑی مضبوط تھی۔ کچھ عرصہ مالوہ کے قاضی القضاة بھی رہے۔ امرائے سلطنت اور ارکانِ حکومت کے نزدیک بڑے معزز و محترم تھے۔ جس زمانے میں جلال الدین اکبر لاہور میں مقیم تھا،

یہ مالوہ سے آکر اسن سے ملے، اس نے ان کو بجاوڑہ اور کوہستان کی سرحدوں کے نظمو نسق پر مامور کر دیا تھا۔ بادشاہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔

شیخ منصور کے ایک بیٹے کا نام علاء الدین تھا۔ یہ بھی عالم دین تھے۔ تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ شیخ علاء الدین عرصہ تک خاں خانان کے پاس رہے۔ بادشاہ کے دربار میں جاتے تو وہ نہایت عزت سے پیش آتا۔ بادشاہ نے ان کو فوجی ملازمت اختیار کرنے کی بارہا پیش کش کی لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا اور دوس و تدریس کو ترجیح دی — شیخ علاء الدین لاہوری بہت فیاض سخی اور ایشاہ پیشہ تھے، جو کچھ ان کو اپنی جاگیر سے حاصل ہوتا، طلباء پر صرف کر دیتے۔ مصنف بھی تھے، علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح عقائد پر حاشیہ لکھا جو بہت مشہور ہے۔ حج کے لیے گئے اور وہیں وفات پائی ۱۱۵۵ھ

۲۳۱۔ قاضی من اللہ کاکوروی

قاضی من اللہ بن نعیم اللہ بن تاج الدین بن شہاب الدین صدیقی کاکوروی عالم دین اور زفیہ تھے۔ ان کا شمار دسویں صدی ہجری کے مشہور علما میں ہوتا تھا۔ تصوف و سلوک سے بھی تعلق خاطر تھا اور یہ علم انھوں نے علامہ سعد الدین بن بڑھن بن محمد خیر آبادی سے حاصل کیا تھا جو مجمع السلوک کے مصنف تھے۔ ۱۱۵۵ھ

۲۳۲۔ شیخ میران سندھی

شیخ میران بن مولانا یعقوب سندھی، کبار علمائے سندھ میں سے تھے صفات

۱۵ منتخب التواریخ، ص ۳۳۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۱، ۲۷۷۔ نزہۃ الخواطر

ج ۴، ص ۱۶۳، ۳۶۷۔

۱۶ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۶۸۔

حمیہ اور اخلاقِ پسندیدہ میں مشہور اور علوم معقول و منقول کے جامع تھے۔ طویل عرصہ تک درس و تدریس میں مصروف رہے اور کثیر طلبا نے ان سے علم حاصل کیا۔ علوم مروجہ میں ماہر تھے۔ مرزا شاہ حسین والی سندھ نے کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ اس عالمِ دین نے ۱۲۶۹ھ کو ٹھٹھہ میں عالمِ آخرت کو رحلت کی۔ تاریخ وفات وراثت الانبیا سے نکلتی ہے ۱۲۵۸ھ

۲۳۳۔ قاضی مینا بن یوسف مندوی

قاضی مینا بن یوسف بن حامد بن ابوالمفاخر بن یسین مندوی، مانڈوی پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بچپن ہی میں چندیری کے سفر پر روانہ ہوئے اور مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ شیخ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اس دور کے فحولِ علم میں ہوتا تھا، علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ جب رانا ساگا نے چندیری پر حملہ کیا تو یہ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں سے نکل کر چھترہ چلے گئے تھے۔ وہاں کافی عرصہ مقیم رہے، پھر قادر شاہ مالوی کے عہد میں واپس مانڈو گئے۔ ان کے پروردادیسین، محمود شاہ غلجی کے زمانے میں مانڈو کے منصبِ قضا پر متعین رہے تھے۔ قاضی مینا نے قادر شاہ سے ملاقات کی تو اس نے مانڈو کا قاضی مقرر کر دیا اور اپنے مشیروں اور ندیموں میں شامل کیا۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ ۱۲۵۹ھ

www.KitaboSunnat.com

۲۳۴۔ شیخ میاں جیو گجراتی

شیخ میاں جیو بن داؤد پٹنی گجراتی۔ علاقہ گجرات کے شہر پٹن میں پیدا ہوئے۔

۱۲۵۸ھ تاریخ معصومی، ص ۲۷۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۰۔

۱۲۵۹ھ اذکار ابرار، ص ۲۶۷، ۲۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۲۔

یہ بارہ سال کی عمر کے تھے کہ ان کے والد داؤد، سلطان ناصر الدین خلجی کے زمانے میں پٹن سے مانڈو آجسے تھے۔ میاں جیونے مانڈو سی میں پرورش پائی۔ پھر حصول علم کی غرض سے برہان پور اور دہاں سے گجرات گئے اور مشہور اساتذہ معصر سے مروجہ کتب درسیہ پڑھیں، یہاں تک کہ علم و فضل کے اونچے مقام پر پہنچے اور اپنے وقت کے شیخ، فقیہ اور بہت بڑے عالم گردانے گئے۔ بعد ازاں شیخ احمد بن جعفر شیرازی اور شیخ صدر الدین ذاکر بروہی سے اخذ طریقت کیا اور عرصہ تک ان سے اسلا و ملازمت اختیار کیے رکھی اور کبار شیوخ کے ہم نگر ہوئے۔

شیخ میاں جیو کی آمدنی کا ذریعہ تجارت تھا، جو کچھ کماتے قرب و جوار کے لوگوں اور مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ اس عالم دین اور مرد درویش نے اسی سال عمر پاکر ۹۸۵ھ کو شہر مانڈو میں انتقال کیا۔

ن

۲۳۵۔ قاضی نجم الدین گجراتی

قاضی نجم الدین گجراتی، شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ والی گجرات سلطان محمود سیکرہ کے عہد میں گجرات کے قاضی القضاة تھے۔ عدل و انصاف اور امور خیر کی تنفیذ میں نہایت سخت تھے اور لوگوں پر شدید محاسبہ کرتے تھے۔ ان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز ایک شخص کے ہاتھ میں رباب دیکھا جو اُس نے سلطان محمود کے لیے بنایا تھا قاضی نے رباب اس کے ہاتھ سے پکڑا اور توڑ ڈالا۔ سلطان کو اس کا علم ہوا تو اس نے مزاح کے انداز میں کہا، قاضی نجم الدین کمزوروں پر تو اس درجہ جبری ہیں، ہمارے رسول آباد پر ان کے احتساب کا دار کیوں نہیں چلتا، جو ریشیم کا لباس پہنتے اور غنا سنتے ہیں۔ اس کا اشارہ شیخ محمد بن عبداللہ حسینی بخاری کی طرف تھا، جو علی الاعلان

۱۱۷۰ھ اذکار ایرار، ص ۳۴۱ — نزمہ الخواطر، ج ۲، ص ۳۷۲، ۳۷۳

لباس حریر زیب تن کرتے اور سب کے سامنے سماعتِ غنا کرتے تھے۔ سلطان کی یہ بات قاضی نجم الدین کے کانوں میں پہنچی تو وہ رسول آباد گئے، مگر شیخ کو دیکھتے ہی اس درجہ مرعوب ہوئے کہ بولنے کی جرأت نہ کر سکے اور ان کے حلقہ طریقت میں شامل ہو گئے۔ قاضی نجم الدین ۱۱۹۱ھ کو اس دنیائے دوں سے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ ۱۷

۲۳۶۔ قاضی نصر اللہ بھکری سندھی

قاضی نصر اللہ بن ابو سعید بن زین الدین حنفی بھکری سندھی، دسویں صدی ہجری کے شیخ سندھ اور اس نواح کے عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار اس عصر کے مشاہیر فقہاء میں ہوتا تھا۔ اپنے برادرِ کبیر قاضی قاضن کے بعد شہر بھکری مسندِ قضا پر متمکن ہوئے۔ ۱۷

۲۳۷۔ شیخ نصیر الدین گجراتی

شیخ نصیر الدین بن مجد الدین بن سراج الدین بن کمال الدین عمری گجراتی اجمالیہ میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور اپنے شہر کے اساتذہ سے تحصیلِ علم کی یہاں تک کہ خطہ گجرات کے شیخ صالح اور فقیہ نام دار مانے گئے۔ ان کے والد شیخ مجد الدین اپنے دور کے صاحبِ طریقت اور عالمِ دین تھے۔ ان کی صحبت میں تصوف و سلوک کی منزلیں طے کیں اور ان کے بعد مسندِ مشیخت کو زینت بخشی۔ ترک و تجرید اور عبادت و زہد میں اپنے اسلاف کا صحیح نمونہ تھے۔ ۲۷ رجب

۱۷ نزیہ الخواطر، ج ۲، ص ۳۷۳۔

۱۸ تاریخ معصومی، ص ۲۷۷۔ تحفۃ الکلام، ص ۳۳۳، ۳۳۴۔ نزیہ الخواطر، ج ۲،

۹۱۰ھ کو احمد آباد میں فوت ہوئے۔ ۱۷

۲۳۸- شیخ نظام الدین کا کوروی

شیخ نظام الدین بن سیف الدین بن نظام الدین علوی کا کوروی، شیخ بھیکہ یا بھیکن کے نام سے مشہور تھے۔ ۸۹۰ھ کو کوروی میں پیدا ہوئے جو اعمال لکھنؤ میں واقع تھا۔ اپنے والد شیخ سیف الدین اور شیخ عبد اللطیف ہردی سے تحصیل کی۔ صحیح بخاری اور جامع الاصول کے لیے مولانا ضیاء الدین محدث کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ یہ کتابیں انھوں نے نہایت غور و فکر اور محنت کے ساتھ پڑھیں۔ سرزمین ہند کے اس عالم کبیر نے شیخ ابراہیم بن معین الدین حسینی ایرجی سے اخذ طریقت کیا اور عرصہ تک ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ پھر کوروی واپس آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ سالہا سال تک علما و طلبا کو علوم مزوہ سے مستفید فرماتے رہے۔ بعد ازاں عازم کالپی ہوئے اور وہاں شیخ ابراہیم بن احمد بن حسن شریف حسینی گیلانی سے کسب فیض کیا۔ کچھ عرصہ بعد کوروی کی راہ لی اور واپس آ کر تدریس و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔ نہایت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ وہ بے شک بہت بڑے صاحب طریقت بزرگ تھے، لیکن حقائق طریقت عوام کے سامنے بیان نہ کرتے تھے۔ خود سماع کرتے مگر دوسروں کو سماع سے روکتے تھے۔ حافظ قرآن اور قرأت سبعہ کے ماہر تھے۔

شیخ نظام الدین کا کوروی مصنف بھی تھے۔ اصول حدیث سے متعلق المنہج اول تصوف و طریقت کے بارے میں المعارف اور شرح المہمات القادریہ ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ انھوں نے ۹۸۱ھ میں اس دنیا سے فانی سے رحلت کی۔ ۱۷

۱۷ نزمۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۴

۱۷ منتخب التواریخ، ص ۲۸۶- نزمۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۷- کشف المتوازی۔

۲۳۹- شیخ نظام الدین امیٹھوی

شیخ نظام الدین کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ نظام الدین بن محمد سلیمان بن فخر الدین بن ابوالفضل بن تاج الدین عثمانی امیٹھوی۔ کیا رماشخ چشتیہ میں سے تھے اور شیخ سری سقطی عثمانی کی نسل سے تھے۔ ۹۰۰ھ کو امیٹھی میں پیدا ہوئے جو ہندوستان میں ابجودھیا کے قریب ایک مشہور شہر ہے اور جس کو علم و علما کے قدیم مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بچپن ہی سے حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جون پور گئے، وہاں شیخ معروف بن عبدالواسع جون پوری کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور کئی سال ان کے زیر تعلیم رہے۔ شیخ معروف، مولانا اللہ داد شارح کافینہ کے مرید تھے۔ پھر عازم مانک پور ہوئے اور شیخ نور الدین بن حامد سنی مانک پوری سے اخذ طریقت کیا۔ وہاں سے واپس جون پور اور پھر امیٹھی گئے۔ بہت بڑے فقیہ، شیخ، عالم دین، زاہد و عابد اور متقی تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس اور تلقین و تذکیر کی شمع روشن کیے رکھی۔ یہ خدمت انھوں نے حسن نیت، اخلاص قلب اور خوفِ الہی کے جذبے کے ساتھ انجام دی۔ ان سے بے شمار علما و طلبا نے استفادہ کیا۔ صحیح معنوں میں علمائے ربانی میں سے تھے۔ کبھی کسی نے ان کو گھر یا مسجد کے باہر نہیں دیکھا۔ تین شہروں کے علاوہ سفر پر نہ جاتے۔ یا تو شیخ نظام الدین سنی خیر آبادی کی ملاقات کے لیے خیر آباد کا قصد کرتے، یا شیخ عبدالغنی بن حسام الدین فتح پوری کی خدمت میں حاضری کے لیے فتح پور کا عزم فرماتے یا پھر شیخ مبارک بن شہاب الدین گوپاموی کی مزاج پرسی کی غرض سے گوپامو کے سفر پر روانہ ہوتے۔

وہ بلاشبہ بہت بڑے عارف اور صوفی تھے لیکن ان کی عادت تھی کہ کسی پر اسرار معرفت دانہ کرتے اور اس مسئلے پر ہمیشہ خاموشی کو ترجیح دیتے۔ سلوک و طریقت کے موضوع پر احیاء علوم الدین، عوارف المعارف، الرسالة المکیہ اور آداب المریدین وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ ایک مرتبہ شیخ ابوالفتح نظام الدین خیر آبادی کے ہاتھ

میں ابن عربی کی فصوص الحکم دیکھی تو چھین لی اور مطالعہ کے لیے کوئی دوسری کتاب عطا کی۔

نماز جمعہ سے پہلے بطور احتیاط چار رکعت نماز پڑھتے، خطبہ میں سلاطین میں سے کبھی کسی کا نام نہ لیتے۔ کسی کو حتی الامکان حلقہ بیعت میں داخل نہ کرنے۔ اپنے اصحاب و مریدین میں سے کسی کو اشغال و اوراد پر کار بند ہونے کے لیے نہ کہتے، نہ کسی کو وظائف کی تلقین کرتے، جوتے سمیت نماز پڑھ لیتے۔ فرمایا کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تاپس کر نماز پڑھنا ثابت ہے۔ فجر کی نماز غلس میں پڑھتے۔ سماع سے خود بھی احتراز کرتے اور اپنے مریدین و تلامذہ کو بھی روکتے۔ فرمایا کرتے، اگر کسی مسئلہ میں دونوں پہلوؤں کی گنجائش ہو، جواز کی بھی اور عدم جواز کی بھی یا حلت کی بھی اور حرمت کی بھی، تو ایسی صورت میں اولیٰ یہ ہے کہ احوط پر عمل کیا جائے۔

شیخ نظام الدین ایٹھوی اسی سال سے زائد عمر پا کر، ۲۸ ذی القعدہ ۹۷۲ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ محمد غوثی نے گلزارِ ابرار میں اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبارِ الاخیار میں سن وفات ۹۹۱ھ تحریر کیا ہے۔ ۵۵

۲۴۰۔ شیخ نظام الدین نرنولی

شیخ نظام الدین بن عبد الکریم حنفی نرنولی، اپنے زمانے کے زبردست عالم تھے۔ ساتھ ہی کبار مشائخ چشتیہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا نام اصل میں اللہ داد تھا، اور نظام الدین لقب تھا۔ ان کے والد شیخ عبد الکریم نرنولی، شیخ محمد غوث گویاری کے مریدین میں سے تھے۔ شیخ نظام الدین بھی باپ کے ساتھ گویار گئے اور وہیں شیخ

۵۵ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، منتخب التوارخ، ص ۲۸۲ تا ۲۸۶۔ اخبارِ الاخیار میں

۲۸۵، ۲۸۴۔ اذکارِ ابرار، ص ۵۷۷ تا ۵۷۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۰، ۲۴۱۔

نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۷۸ تا ۳۸۰۔ طبقاتِ اکبری، ص ۳۹۳۔

محمد غوث کی خانقاہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ حصول علم کو مشغلہ ٹھہرایا اور اس درجہ کمال کو پہنچے کہ علوم عالیہ و آلیہ میں اپنے معاصرین سے فوقیت لے گئے۔ ناولوں میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، جس میں متواتر چالیس سال تک اس عالم دین نے درس و تدریس کا غفلہ جاری رکھا۔ یہ اپنے دور کے صاحبِ طریقت بھی تھے، اور شیخ خانون بن علاء الدین ناگوری کے فیض یافتہ تھے۔ ان سے علماء و مشائخ کی کثیر تعداد نے استفادہ و استفاضہ کیا۔ ۲۸ صفر ۹۹۷ھ کو اس دنیائے فانی سے عالمِ آخرت کو روانہ ہوئے۔

۲۲۱۔ شیخ نظام الدین خیر آبادی

شیخ نظام الدین خیر آبادی کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ نظام الدین بن سید بن بن نور بن مدن بن سعید بن قاضی شیخ بن انعام الدین بن رکن الدین بن محمد بن نور بن احمد بن محمود حسینی شیورانی۔ سندیلہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ شیخ سعد الدین بن قاضی بڑھن خیر آبادی سے بیعتِ طریقت کی، پھر حصول علم کے لیے سنبل گئے۔ وہاں علامہ عزیز اللہ تلمیذی کے درس میں شامل ہوئے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں دیگر بلادِ ہند کے مختلف علماء تحصیل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خیر آباد واپس آئے اور خود سلسلہ تدریس جاری کیا اور مسندِ اکتاپر رونق افروز ہوئے۔ ان کی تدریسی سرگرمیوں اور علمی رفعتوں کا یہ عالم تھا کہ اپنے اساتذہ کرام کی زندگی ہی میں ان کا شمار اکابرِ علم میں ہونے لگا تھا اور ملک کے دور دراز حصوں سے طلباء ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے اور ان کے فیوضِ علمی سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ پھر اثنائے تدریس

۱۵ اذکارِ برابر، ص ۳۹۰، ۳۹۱۔ منتخب التواریخ، ص ۲۸۶، ۲۸۷۔ نزهة الخواطر

ص ۲۷۸۔

ہی میں قلب کی دنیا میں ایک اور ہنگامہ بپا ہوا اور ان پر جذبہ ربانی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اسی دوران میں سائین پور کی راہ لی اور وہاں جا کر شیخ صنفی الدین عبدالصمد سائین پوری کی صحبت اختیار کر لی اور ان کی رہنمائی میں سلوک و طریقت کی منزلیں طے کرنے لگے۔ پھر خیر آباد گئے اور سب علاقے سے منقطع ہو کر عبادت الہی اور ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے۔ اس جلیل القدر عالم دین اور مسافر راہ طریقت نے ۱۰۹۷ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

۲۴۲۔ علامہ نظام الدین بدخشی

علامہ نظام الدین حنفی بدخشی، حضرت حسن بصری کی اولاد سے تھے۔ اصل وطن بدخشاں تھا۔ وہیں پیدا ہوئے اور مولانا محمد سعید اور علامہ عصام الدین ابراہیم اسفرائینی اور دیگر اساتذہ عصر سے علم حاصل کیا۔ کسی زمانے میں ذکر و فکر کی وادی روح پرور میں بھی گھومے پھرے اور اس کی مختلف منزلیں شیخ حسین خوارزمی کی صحبت میں طے کیں۔ مقتدر عالم اور نامور مصنف تھے۔ علمی اعتبار سے بدخشاں اور ماوراء النہر کے تمام علما پر فوقیت رکھتے تھے اور بدخشاں کے شاہی امرا کی جماعت کے اہم رکن تھے۔ ۹۸۲ھ کو ہندوستان آئے اور اسی سال ۹ جمادی الاخریٰ کو خان پور کے مقام پر، جو جون پور کے مضافات میں واقع ہے، شاہ ہند جلال الدین اکبر سے ملاقات کی۔ اس نے ان کے علم و فضل اور ذہنی و فکری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر، پہلے قاضی خاں اور پھر غازی خاں کے خطاب سے مفتخر کیا۔ بڑے فصیح اللسان اور خوش بیان تھے۔ اکبر نے ان پر خوب عنایات کیں اور بہت سے مناصب جلیلہ سے نوازا۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ شرح عقائد پر حاشیہ سپرد قلم کیا اور ایک رسالہ تحقیق و تصدیق ایمان کے

کہ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۸۰، ۳۸۱ بحوالہ اخبار الانصاف۔

بیان اور بحث میں لکھا۔

علامہ بدخشی، اکبر کے حاشیہ نشینوں اور مقررین میں سے تھے۔ یہ دربار اکبری کا پہلا شخص ہے، جس نے فتح پور میں، اکبر کے سامنے سجدہ تہمت ادا کرنے کی رسم ایجاد کی اور اس طرح اپنے علم و فضل کی ساری متاع اور عمل و کردار کا تمام سرمایہ اکبر کے پاؤں میں رکھ دیا۔ اس نے اپنے زورِ بیان اور قوتِ گویائی سے بادشاہ کی بے حد خدمت کی اور بالآخر اس کے قدموں میں سر جھکا کر اس کا حق نمک ادا کر دیا۔ نظام الدین بدخشی اور اس قماش کے دربار کے دیگر لوگوں کے علم کلام کی فراوانی اکبر کے لیے بہت ممد ثابت ہوئی اور اس کو مرتبہ ابو بیت تک پہنچانے میں انھوں نے اس کو پورا مواد فراہم کیا۔ العیاذ باللہ۔

بدایونی کے الفاظ ہیں: اقول کسے کہ اختراع سجدہ پیش بادشاہ کر د۔ در فتح پور

اولود۔

نظام الدین بدخشی نے ستر برس کی عمر پائی اور ۹۹۳ھ کو ارضِ اودھ میں انتقال کیا۔ ۵۵

۲۴۴۔ شیخ نوح بن نعمت اللہ سندھی

شیخ نوح بن نعمت اللہ صدیقی سندھی، علامہ وقت اور فاضل عصر تھے۔ اعمالِ سندھ کے ایک مقام ہالہ کنڈی میں اقامت گزین تھے۔ اس زمانے کی تمام علمی سرگرمیوں کا مرکز یہی عالم دین تھے۔ قرآن مجید کی نہایت عمدہ تفسیر بیان کرتے تھے اور اس کے معانی دقیقہ کی وضاحت میں منہرِ حیثیت کے مالک تھے۔ دیارِ سندھ کے اس عالم دین نے ۲۷ رذی القعدہ ۹۹۸ھ کو جمعرات کے

۵۵ منتخب التواریخ، ص ۳۳۰، ۳۳۱۔ مآثر جمی، ج ۳، ص ۱۹، ۲۰۔ تذکرہ علمائے

ہند، ص ۲۴۲، ۲۴۳۔ نزهة الخواطر، ج ۲، ص ۱۰۱۔

دن ہالہ کنڈی میں وفات پائی۔

و

۲۲۲- مولانا وحیہ الدین علوی گجراتی

شیخ وحیہ الدین بن نصر اللہ بن عماد الدین علوی گجراتی، ماہ محرم ۹۱۱ھ کو سرزمین گجرات کے ایک گاؤں جانپانیر میں پیدا ہوئے اور اساتذہ عصر سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ پھر علامہ عماد الدین محمد بن محمود طارمی کے حلقہ درس میں داخل ہوئے۔ ان سے اصول و کلام، معانی و بیان اور منطق و فلسفہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں تک کہ تمام علوم مروجہ میں درجہ کمال کو پہنچے۔ علوم آلیہ عالیہ میں مہارت۔ پیدائی اور اپنے دور کے عالم کبیر، مفسر و فقیہ اور شیخ و امام گردانے گئے۔ درس و تدریس کے منصب علیا پر فائز ہوئے اور مسند افتا کو زینت بخشی۔ اس کے علاوہ علوم طریقت میں بھی بہرہ وافر حاصل کیا اور شیخ قاضی خاں چشتی نر والی سے جو شیخ قاضی کے نام سے معروف تھے اور صاحب جوہر الخمسة شیخ محمد غوث گوالیاری سے مستفیض ہوئے۔

شیخ وحیہ الدین گجراتی بے شمار اوصاف کے حامل تھے۔ صاحب صدق و اخلاص، پاک باطن، شریف النفس، عابد و زاہد، فیاض و جواد اور قانع بالیسیر تھے۔ گوشہ نشینی اور عزلت و تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے اور ہمیشہ علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ وضع و لباس کے معاملے میں سادگی پسند تھے اور عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہ رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر قانع رہتے۔ جو کچھ کہیں سے حاصل ہوتا، وہ طلباء میں خرچ کر دیتے۔ اللہ نے ان

۹۹ اذکار برابر، ص ۳۹۲۔ تحفۃ الکرام، ص ۶۹ تا ۷۱۔ تاریخ معصومی

ص ۲۸۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۲، ص ۳۸۳۔

کی دعائیں، بڑا اثر اور شفا بخش تھی۔ انھوں نے علاقہ دنیا سے الگ ہو کر اپنے آپ کو درس و تدریس اور عبادت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ کبھی امرائے دولت اور ارکانِ حکومت کے دروازے پر دستک نہ دیتے۔ صرف ایک دو مرتبہ کسی رکنِ حکومت کے پاس جانا پڑا تو بہت ہی جبر اور استکراہ کے ساتھ گئے۔ کسی نے ان کو کبھی اپنے گھر یا مسجد کے علاوہ کہیں نہیں دیکھا۔ یا تو طلباء کے ہجوم میں درس و تدریس میں مصروف ہوتے یا عبادت و ذکرِ الہی میں منہمک۔

شیخ موصوف مسندِ افتاء پر فائز تھے مگر فتویٰ دینے اور اس پر دستخط کرنے کے بارے میں بے حد محتاط تھے۔ وہ گجرات (کاٹھیاواڑ) میں سکونت پذیر تھے۔ اور والی گجرات سلطان محمود ان کا انتہائی احترام کرتا تھا۔ تحقیق مسائل اور افتاء کے باب میں وہ ان ہی سے رجوع کرتا۔ اس سلسلے کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ سلطان مذکور کے عہد میں شیخ محمد غوث گوالیاری گجرات گئے تو صاحبِ کنز العمال شیخ علی متقی نے جو اس عہد کے بہت بڑے عالم اور دربارِ سلطانی میں بڑے اثر و اقتدار کے مالک تھے، بعض مسائل میں اختلاف کی بنا پر شیخ محمد غوث کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ جب سلطان محمود کے پاس یہ فتویٰ پہنچا تو اس نے اس پر عمل درآمد کو اس وقت تک ملتوی کر دیا جب تک کہ شیخ وجیہ الدین اس کی تصدیق نہ کر دیں۔ شیخ وجیہ الدین چونکہ شیخ محمد غوث کے افکار و خیالات سے آگاہ تھے، اس لیے انھوں نے فتویٰ دیکھتے ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ شیخ علی متقی کو اس کا علم ہوا تو وہ شیخ وجیہ الدین کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے اور مضطرب ہو کر کہا، آپ آخر کس بدعت اور دین میں رخنہ اندازی کے حامی بن گئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا، ظاہر شریعت کی رو سے ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیخ وجیہ الدین کے اس عمل سے شیخ محمد غوث پھانسی سے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد شیخ وجیہ الدین اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے:

ظواہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے، جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق

پر ایسی جیسی کہ شیخ محمد غوث کی ہے۔

شیخ وجیہ الدین بہت بڑے مصنف، شارح اور محشی بھی تھے، انھوں نے مختلف علوم و فنون پر مشتمل کم و بیش ستائیس اہم درسی اور غیر درسی کتابوں پر شرح اور حواشی تحریر کیے جو اہل علم میں مقبول ہوئے اور لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱- حاشیہ تفسیر بیضاوی: یہ قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے اور اس کا ابتدائی حصہ داخل درس ہے۔

۲- حاشیہ علی شرح نخبۃ الفکر، اس کا نام نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر ہے۔ اصول حدیث کی کتاب ہے۔ صاحب فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے اور شامل نصاب ہے۔

۳- حاشیہ ہدایہ: یہ فقہ کی اہم اور مشہور کتاب ہے اور باقاعدہ مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

۴- حاشیہ شرح وقایہ: یہ بھی فقہ کے مشہور متون میں سے ہے اور نصاب میں شامل ہے۔

۵- حاشیہ علی العضدی۔

۶- حاشیہ علی اصول البرزوی۔

۷- حاشیہ علی المطول۔

۸- حاشیہ علی مختصر المعانی۔

۹- حاشیہ علی التلویح۔

۱۰- حاشیہ علی شرح التجرید۔

۱۱- حاشیہ علی شرح العقائد النسفی: العقائد النسفی اصول دین میں ایک

مختصر رسالہ ہے۔ اس کے مصنف شیخ نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد (متوفی ۷۵۳ھ) ہیں، اس کی مختلف علما نے نثر میں لکھی، جن میں ایک شرح علامہ سعد الدین نقضانی

(متوفی ۷۹۲ھ) نے سپرد قلم کی جو مدارس دینیہ میں متداول ہے۔ شیخ وحیہ الدین گجراتی نے علامہ تقنارانی کی شرح پر حاشیہ لکھا۔

۱۲۔ حاشیہ علی الحاشیة القدیمة للمحقق الدروانی۔ یہ شیخ جلال الدین محقق دہلی کے حاشیہ پر حاشیہ ہے۔

۱۳۔ حاشیہ علی شرح المواقف للبرجانی۔

۱۴۔ حاشیہ علی حکمة العین۔ یہ کتاب علم منطق میں ہے۔

۱۵۔ حاشیہ علی شرح المقاصد۔

۱۶۔ حاشیہ علی شرح چغینی۔

۱۷۔ حاشیہ شرح قطبی

۱۸۔ حاشیہ علی شرح الشمسیہ، للرازی۔

۱۹۔ حاشیہ علی شرح جامی۔

۲۰۔ حاشیہ علی شرح الارشاد۔ یہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب

الارشاد کی شرح پر حاشیہ ہے۔ یہ کتاب علم نحو سے متعلق ہے۔

۲۱۔ شرح رسالہ ملا علی قوشچی۔ یہ رسالہ علم ہیئت کے موضوع پر ہے۔

۲۲۔ شرح ابیات التسمیل۔

۲۳۔ شرح اللوائح۔

۲۴۔ شرح جام جہان نما۔ یہ رسالہ علم تصوف میں ہے۔

۲۵۔ شرح کلید مخازن۔ رسالہ کلید مخازن شیخ محمد غوث گوالیاری کی

تصنیف اور حقیقتِ مبداء و معاد کے موضوع پر ہے۔ شیخ وحیہ الدین نے اس کی شرح قلم بند کی۔

۲۶۔ رسالہ حقیقتِ محمدیہ۔

۲۷۔ شرح تحفہ شہابی۔ تحفہ شاہی علامہ قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی

(متوفی ۷۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب انھوں نے وزیر امیر شاہ محمد بن صدر السعید

تاج الدین ابن معتر کے لیے لکھی، جو ایک جلد اور چار ابواب پر مشتمل ہے شیخ وجیہ اللہ
اس کی شرح ضبط تحریر میں لائے۔

ارض ہند کے اس عظیم المرتبت عالم و فقیہ اور مصنف نے ۹۹۸ھ کو احمد آباد
میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

۵

۲۲۵۔ علامہ مہتہ اللہ شیرازی

علامہ مہتہ اللہ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ مہتہ اللہ بن عطار اللہ بن لطف اللہ
بن سلام اللہ بن روح اللہ حسینی شیرازی، شاہ میر کے نام سے معروف تھے۔ شیراز
میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ حصول علم کے لیے مختلف علمائے عصر کی
خدمت میں حاضری دی۔ کتب احادیث اپنے نانا حافظ نور الدین ابو الفتح طائوسی
سے پڑھیں اور اپنے زمانے کے علامہ اور فاضل کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔
تصوف و طریقت میں بھی بلند مرتبے کو پہنچے۔ سلطان محمود بیگرہ کے عہد میں ۸۹۸ھ
کو گجرات آئے اور جانا نیر میں سکونت اختیار کی اور علم و فضل اور نیکی و تدین کی
بنیاد پر اس درجہ شہرت حاصل کی کہ ملک کے مختلف بلاد و امصار سے طلبائے علم

- ۱۔ مجموعہ حالات حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی، ص ۷۱ تا ۷۵۔ مائثر جی، ج ۳
ص ۱۸۱، ۱۸۲۔ مرآت سکندری، ص ۲۹۶۔ مرآت احمدی، ج ۳، ص ۶۸ تا ۷۰۔ منتخب التواریخ، ص
۳۹۲، ۳۹۳۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۹، ۲۵۰۔ مفتاح التواریخ، ص ۱۹۴۔ اجماع العلوم، ص ۹۶
۸۹۷۔ مائثر الکرام، ص ۱۸۱، ۱۸۲۔ اذکار ابرار، ص ۴۰۵ تا ۴۰۹۔ تہذیب الخواطر، ج ۲، ص ۲۸۵
۳۸۶۔ طبقات اکبری، ص ۳۹۵۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۸۸، ۳۸۹۔ معجم المؤلفین، ج ۱۳،
ص ۱۶۰۔ الاعلام، ج ۹، ص ۱۲۴، ۱۲۵۔ مقدمہ عمدۃ الرعاہ فی حل شرح الوقلیہ، ص ۲۶۔
ردود کوثر، ص ۳۹۳، ۳۹۴۔ یاد ایام، ص ۶۵، ۶۶۔

فقہائے ہند جلد سوم

اور سترشدین کثیر تعداد میں حاضر خدمت ہونے لگے۔
علامہ ہبۃ اللہ، مصنف بھی تھے اور تصنیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ اسنی الکواشف فی شرح المواقف۔

۲۔ لوامع البرہان فی قدم القرآن۔

۳۔ شرح تہذیب المنطق و الکلام۔

۴۔ المحاکمۃ علی شرح التسمیۃ فی المنطق۔

۵۔ رسالۃ فی الہیئۃ۔

۶۔ رسالۃ فی اصول الحدیث

۷۔ رسالۃ فی المسلسلات علیہ

دسویں صدی ہجری کے اس عالم دین کے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں

ہوسکے۔

ی

۲۴۶۔ مولانا یار محمد سندھی

مولانا یار محمد بن عبدالعزیز ابہری ثم کاہانی سندھی، شیخ اور عالم کبیر تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے فحول علما میں ہوتا تھا۔ ۹۲۸ھ کو جام فیروز کے عہد حکومت میں شیخ عبدالعزیز ابہری کے ساتھ ہرات سے سندھ آئے اور کاہان میں اقامت گزین ہوئے جو نواح سیوستان میں ایک قریہ تھا۔ وہاں درس و تدریس اور افادۂ طلباء کا غفلہ بلبت کیا۔

مولانا یار محمد، جلیل القدر عالم، خوش اخلاق بزرگ، نرم مزاج اور متواضع انسان تھے۔ انھوں نے اپنے باپ سے اخذ علم کیا اور خود ان سے خلق کثیر نے استفادہ

لے اذکار ابرار، ص ۲۳۸، ۲۳۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۸۸، ۳۸۹۔

کیا۔ کابل میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۲۲۷۔ شیخ یحییٰ بن ابوالفیض احراری

شیخ یحییٰ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ شیخ یحییٰ بن ابوالفیض بن عبداللہ بن شیخ عبید اللہ احراری سمرقندی۔ جلال الدین اکبر کے عہد کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ شیخ عصر اور عالم و فقیہ تھے۔ فن طب میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ خوش خطی میں اپنے دور کے لاثانی شخص تھے۔ کتابت کی رو سے لفظ ”سبع“ نہایت عمدگی سے لکھتے۔ ساتھ ہی خوش اخلاق، خوش خصال، کریم النفس اور ایثار پیشہ تھے۔ جو کچھ کہیں سے حاصل ہوتا لوگوں پر خرچ کر دیتے اور ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش میں رہتے۔

دربار اکبری میں جب فتنہ پردازان دین کا عمل دخل بہت بڑھ گیا اور پرانی علمی و دینی محفلیں اُجڑ گئیں تو دربار شاہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بادشاہ سے حجاز جانے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے ان کو قافلہ حجاج کا امیر مقرر کیا اور کافی خرچ دے کر رخصت کیا۔ حرمین شریفین گئے، حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور واپس آگئے۔ آگرہ میں ان کا زیادہ وقت ریاضت و عبادت میں گزرتا تھا۔ اسی شہر میں ۹۹۹ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔

۲۲۸۔ سید سلیمان سامانوی

شیخ سلیمان بن ابولسین سامانوی، شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی کے تلمیذ

۱۔ آثارِ رحیمی، ج ۲، ص ۲۷۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۲۔ تحفۃ الکرام، ص

۲۲۲۔ تاریخِ معصومی، ص ۱۰۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۷۹۔

۲۔ منتخب التواریخ، ص ۳۱۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۳، مہر جہان تاب۔

اور صالح عالم دین تھے۔ حجاز گئے، سعادت حج حاصل کی اور وہاں کے مشائخ سے کتب احادیث پڑھیں۔ پھر واپس ہندوستان آئے اور عرصہ تک بعض امرائے دولت کے پاس لاہور میں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد ان پر ایسا دور آیا کہ مشائخ و فقہاء کا سالباس پہنا اور امور دنیا سے منقطع ہو گئے اور یادِ خدا اور ذکرِ الہی کو شب و روز کا مشغلہ ٹھہرا لیا۔ سر ہند میں گوشہ نشین ہو گئے تھے اور مریدین و سالکین کی خدمت کو اپنا معمول بنا لیا تھا۔ ابتدا میں شیخ وحیہ الدین کی صحبت میں گجرات رہے۔ دوسری مرتبہ پھر وہیں جانا چاہتے تھے۔ وہاں سے عازم حجاز ہونے کے متمنی تھے، مگر اس کا موقع نہیں ملا۔ البتہ بنگال گئے اور بہار کے ایک گوشے میں مدت تک مقیم رہے۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ عہد اکبری کے عالم دین تھے، ان کی تاریخ وفات کا علم نہ ہو سکا۔ ۱۰۱۵ھ

۲۲۹۔ قاضی یعقوب مانگ پوری

قاضی یعقوب بن ابو یعقوب مانگ پوری، قاضی کمال الدین مانگ پوری کے نام سے معروف تھے۔ اکبری دور کے مشہور علماء میں سے تھے۔ علم فقہ اور اصول میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ حنفی المسلك تھے اور قاضی فیضیت کے داماد تھے۔ ان کی وفات کے بعد منصب قضا پر متعین ہوئے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاجاً عربی شعر ہندی بچروں میں کہتے۔ ابتدائی دور میں بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے مقربین میں سے تھے۔ چند سال ہندوستان کے قاضی القضاة رہے۔ منقول ہے کہ اس زمانے میں وہ مقوی و بسبی معجون بہت کھاتے تھے۔

ایک روز اکبر کی مجلس میں اکل و شرب کی سرور انگیز چیزیں لائی گئیں۔ بادشاہ نے قاضی کو دعوتِ شرکت دی۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا، تم کس قسم کا

۱۰۱۵ھ منتہی التواریخ، ص ۲۲۹، ۲۲۸۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۵۴۔ نزهة الخواصر، ج ۴، ص ۳۹، ۳۹۳۔

نشہ کرتے ہو۔“ ایک ہندی مصاحب فوراً بولا ”پارہ کھاتے ہیں۔“ ان کو قاضی القضاۃ کے عہدہ سے معزول کر کے بنگال کے محکمہ قضاۃ پر منتعین کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب معصوم کابلی نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس کے معاذن ہو گئے۔ اکبر نے اس جرم کی پاداش میں منصب قضاۃ سے معزول کر کے قلعہ گوالیار میں محبوس کرنے کا حکم دیا۔ مگر وہاں پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں انتقال کر گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تقریباً ۹۹۸ھ کا واقعہ ہے۔

انہوں نے آگرہ اور فتح پور کے نواح میں بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرائیں، نہریں کھدوائیں، حوض بنائے اور کئی باغ لگائے۔ ایک بہت بڑا حوض موضع ہنسوہ میں بنایا جو اس زمانے میں فتح پور کے قریب ایک قریہ تھا۔

۲۵۰۔ شیخ یوسف بن احمد گجراتی

شیخ یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان حسینی گجراتی، دسویں صدی ہجری کے دیار ہند کے مشہور افاضل میں سے تھے۔ ان کی بہت بڑی علمی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے والی گجرات سلطان محمود بیگرہ کے لیے ابن خلدان کی مشہور تاریخ، دقیات الاعیان کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام منظر الانسان، ترجمہ تاریخ ابن خلدان رکھا۔ غالباً یہ ترجمہ انہوں نے ۸۸۹ھ میں کیا تھا۔ کہتے ہیں، یہ نہایت عمدہ اور اوجہانہ ترجمہ ہے۔ اس سے ان کی علمی قابلیت اور زبان و انداز بیان پر عبور کا پتا چلتا ہے۔

۲۵۱۔ مولانا یوسف سندھی

مولانا یوسف بن ابویوسف حنفی سندھی، شیخ وقت اور صالح عالم دین تھے۔

۴ منتخب التواریخ، ص ۳۰۵۔ طبقات اکبری، ص ۳۹۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۵۵۔

نوبتہ الخواطر، ج ۴، ص ۲۹۲، ۲۹۵۔ نوبتہ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۵۔

علوم شرعیہ میں ماہر، معارفِ ادیبہ میں ممتاز، تیز ذہن اور روشن فکر تھے۔ علمی و تحقیقی معاملات میں خطا و صواب میں خوب امتیاز کرتے تھے۔ یہ والی سندھ مرزا محمد باقی کے عہد کے صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ مآثر رحیمی کا مصنف ان کے نقوی اور علوم میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے

مولانا یوسف بغایت پرہیزگار و در علوم شرعیہ و فنون بے مثل زبان خود بود۔^{۱۷}

۲۵۲۔ علامہ یونس سمرقندی

علامہ یونس بن ابویونس سمرقندی ثم سندھی، علوم حکمیہ کے کبار اور ماہر علما میں سے تھے۔ مرزا شاہ حسین کے عہد میں ماوراء النہر سے سندھ تشریف لائے۔ ارض سندھ میں علمی اعتبار سے ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور درجہ مشیخت پر فائز تھے۔ ان کی علمی رفعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ والی سندھ مرزا شاہ حسین نے ان کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا اور جرجانی کی شرح المواقف، اور بعض دیگر کتابیں باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھیں۔ بھکر کے شیخ النسب سید تھے اور بھکر کی مسند مشیخت و ولایت ہمیشہ اس عالم دین کے خاندان کے ذمہ علم حضرات کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ سندھ کا یہ عالم کبیر ۹۵۱ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوا۔^{۱۸}

^{۱۷} مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۲۷۔ نیز ملاحظہ ہو، تاریخ معصومی، ص ۲۹۹۔ تحفۃ الکریم، ص ۵۸۱۔

نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۳۹۷

^{۱۸} مآثر رحیمی، ج ۲، ص ۳۲۰، ۳۲۱۔ تاریخ معصومی، ص ۲۸۱۔ نزہۃ الخواطر

ج ۴، ص ۳۹۸

مراجع و مصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا :

- ۱- آئینِ اکبری - شیخ ابوالفضل - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۹۳ء
- ۲- ابجد العلوم : نواب صدیق حسن خاں - مطبع صدیقیہ بھوپال - ۱۲۹۵ھ
- ۳- اتحاف النبلاء : نواب صدیق حسن خاں - مطبع نظامی، کان پور - ۱۲۸۸ھ
- ۴- اخبار الاخیار : شیخ عبدالحق محدث دہلوی - مطبع مجتہبی، دہلی - ۱۳۳۲ھ
- ۵- ادبی دنیا لاہور، کشمیر نمبر: مضامین عبداللہ قریشی - شمارہ ماہج، اپریل - ۱۹۶۶ء
- ۶- اذکار ابرار - اردو ترجمہ گلزار ابرار: محمد غوثی شطاری مانڈوی - ترجمہ فضل احمد چیمڑی مطبع مفیدعام، آگرہ - ۱۳۳۶ھ
- ۷- اردو دائرہ معارف اسلامیہ : دانش گاہ پنجاب، لاہور
- ۸- الاعلام : خیرالدین زرکلی - طبع ثانی - بیروت
- ۹- الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام : قطب الدین نہروالی الملکی - لیٹرگ - بروکلین - ۱۸۵۹
- ۱۰- انوار العارفين : حافظ محمد حسین مراد آبادی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۷۶ء
- ۱۱- ایضاح المکتون فی الذیل علی کشف الظنون : اسماعیل پاشا - مطبع بیہیمہ، استنبول - ۱۹۴۵ء/۱۳۶۴ھ
- ۱۲- البدل الطالع جلد اول، ثانی : امام محمد بن علی شوکانی - مطبعة السعادة، طبع اولیٰ قاہرہ مصر، ۱۳۴۸ھ
- ۱۳- برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ : محمد اسحاق بھٹی - ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۳ء
- ۱۴- برہان پور کے سندھی اولیا، المعروف بتذکرہ اولیائے سندھ : سید محمد مطیع اللہ راشد برہان پوری - سندھی ادبی بورڈ، کراچی - ۱۹۵۷ء
- ۱۵- بزم تیموریہ : سید صباح الدین عبدالرحمن - دار المصنفین اعظم گڑھ
- ۱۶- تاریخ شخصتہ الکرام جلد اول، دوم، سوم : مطبع حسینی اثنا عشری - محلہ فراش خانہ وزیر گنج

لاہور، ۱۳۰۴ھ۔ مطبع ناصری، واقع دہلوانی۔

۱۷۔ تاریخ داؤدی: عبداللہ۔ تصحیح پروفیسر شیخ عبدالرشید۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء

۱۸۔ تاریخ شیرازہ ہند جون پور: سید انبال حسین۔ ادارہ شیرازہ ہند پبلشنگ ہاؤس

جون پور۔ ۱۹۶۳ء

۱۹۔ تاریخ طاہری: سید طاہر محمد سیانی، مٹھی مٹھی۔ سندھی ادبی بورڈ۔ حیدرآباد ہند

۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء

۲۰۔ تاریخ ظفر: گردھاری لعل احقر۔ مطبوعہ حکیم برہم۔ گورکھ پور۔ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء

۲۱۔ تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۳۳ء

۲۲۔ تاریخ کشمیر غظلی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر، غلام محمد نور محمد، تاجران کتب

سری نگر۔

۲۳۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۴۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۵۔ تحقیقاتِ پستی: مولوی نور احمد پستی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۶۴ء

۲۶۔ تذکرہ ہولڈنا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ احباب، لاہور

۲۷۔ تذکرہ صوفیائے بنگال: اعجاز الحق قدوسی۔ مرکز اردو بورڈ، لاہور۔ ۱۹۶۵ء

۲۸۔ تذکرہ عالم: بلال قی داس۔ میوہ پریس، دہلی۔ ۱۹۰۸ء

۲۹۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۳۰۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

کراچی۔ ۱۹۶۱ء

۳۱۔ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی (ترجمہ رسالہ مناقب) تالیف شیخ عبدالوہاب

اقضی القضا، منوفی ۱۰۸۶ھ۔ ترجمہ سید ابو ظفر ندوی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔

۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء

۳۲۔ تنگ بابری: فارسی ترجمہ، خان خانان، بیرم خاں۔ چتر پریس ممبئی۔ ۱۳۰۸ھ

۳۳- تعلیمات مجددیہ: ملک حسن علی جامعی۔ انجمن اشاعت التوحید والسنة، شرق پور۔

۱۹۶۵ء۔

۳۴- چار باغ پنجاب: گنیش داس و ڈیرا۔ مرتبہ پروفیسر کریال سنگھ، امرتسر۔ ۱۹۶۵ء

۳۵- حیوۃ العلماء: مولانا سید محمد عبد الباقی سہسوانی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۲۲ء

۳۶- حدائق الخفیہ: مولوی فقیر محمد جمالی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

۳۷- خزینۃ الاصفیاء: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی مہراج پنڈت بیچنا تھ،

الموسوم بہ شمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۳۹۰ھ

۳۸- خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی۔ تبصیح ظفر احسن۔ مطبع جی اینڈ سنز،

دہلی۔ ۱۹۱۸ء

۳۹- دربار اکبری: محمد حسین آزاد۔ دارالاشاعت پنجاب، لاہور۔ مطبع رقاد عام، لاہور

۱۸۹۸ء۔

۴۰- درود کوثر: شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۴۱- سبحة المرجان فی آثار ہندوستان۔ غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔ ۱۳۰۳ھ

۴۲- سفینۃ الاولیاء: دارالاشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء

۴۳- سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔

۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء

۴۴- سیر العارفين: جلال الدین جمالی۔ مطبع رضوی دہلی۔ ۱۳۱۱ھ

۴۵- سیر المتأخرین: غلام حسین خاں طباطبائی۔ نول کشور، لکھنؤ۔

۴۶- شذرات الذهب، جلد ۸: ابو الفلاح عبدالحی بن العباد حنبلی۔ مکتبۃ القدسی

قاہرہ، مصر۔ ۱۳۵۱ھ

۴۷- الصارم المسلول علی شاتم الرسول۔ امام ابن تیمیہ۔ ترتیب محی الدین عبدالمجید۔

دار الفکر، بیروت۔

۴۸- الضوء اللامع۔ حافظ شمس الدین محمد بن عبد الرحمن سخاوی۔

۴۹ - طبقات اکبری - نظام الدین ہروی - طابع، نول کشور مطبع گرامی قدر اودھ

اخبار، لکھنؤ - ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء

۵۰ - ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، جلد اول - عبداللہ محمد بن عمر الاصفی العثماني طبع لندن - ۱۹۱۰ء

۵۱ - ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، جلد ثانی - عبداللہ محمد بن عمر الاصفی العثماني طبع لندن - ۱۹۲۱ء

۵۲ - عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ - [دی کنسٹری بیوشن آف انڈیا ٹودی عربک

لٹریچر از ڈاکٹر زبید احمد] ترجمہ - شاہ حسین رزاقی - ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۳ء

۵۳ - الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات البینتہ معلامہ عبداللہ لکھنوی -

طبع اول - مصر - ۱۳۲۲ھ

۵۴ - قضاہ الارب من ذکر علماء النحو والادب : ذوالفقار احمد مطبع فیض منبع مفید

آگرہ - ۱۳۱۶ھ

۵۵ - کشف الظنون، جلد اول - حاجی خلیفہ - مطبع بہیہ استنبول (۱۹۴۱/۱۳۶۰ھ)

۵۶ - کشف الظنون، جلد ثانی - حاجی خلیفہ - مطبع بہیہ استنبول -

۵۷ - کشمیر سلطین کے عہد میں [کشمیر انڈر سلطانت، از پروفیسر محب الحسن] ترجمہ

پروفیسر علی حماد عباسی - دار المصنفین، اعظم گڑھ - ۱۹۶۷ء / ۱۳۸۶ھ

۵۸ - لطائف قروسی [مشتمل بر حالات و مقالات شیخ عبدالقدوس گنگوہی] از شیخ

دکن الدین بن عبدالقدوس گنگوہی - مطبع مجتہبائی، دہلی - ۱۳۱۱ھ

۵۹ - نانڈو - غلام یزدانی [ترجمہ، مرزا محمد بشیر ایم اے] مفید نام پریس لاہور - ۱۹۴۱ء

۶۰ - آثار الامراء - جلد سوم، نواب مصمصام الدولہ شاہ نواز خاں - ایشیاٹک سوسائٹی

بنگال، کلکتہ - ۱۸۹۱ء

۶۱ - آثار رحیمی - جلد اول، دوم، سوم : ملا عبدالباقی نواز ندوی - تصحیح محمد ہدایت حسین -

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ، طبع جلد اول ۱۹۲۲ء - جلد دوم، ۱۹۲۵ء - جلد سوم،

۱۹۳۱ء -

۶۲ - آثار الکرام : غلام علی آزاد بلگرامی - مکتبہ اخبار العلوم الشرقیہ لاہور - ۱۹۷۱ء

۶۳۔ مجموعہ حالات حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی۔ مطبع شہابی بھنڈی بازار ممبئی۔

۶۴۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن۔ عبدالجبار خاں صوفی۔ مطبع نامی فخر نظامی۔

حیدر آباد دکن۔

۶۵۔ مرآت احمدی، جلد اول؛ مرزا احمد حسن الملقب بہ علی محمد خان بہادر۔ مطبعہ

کلکتہ، ۱۹۲۸ء

۶۶۔ مرآت احمدی، جلد دوم؛ مرزا احمد حسن الملقب بہ علی محمد خان بہادر، مطبعہ

کلکتہ، ۱۹۲۷ء

۶۷۔ مرآت سکندری؛ سکندربن محمد عرف منجمو ابن اکبر تصحیح و تنقیح۔ ڈاکٹر

ستیش چند مرزا، و محمد لطف الرحمن، جامعہ ہمارا اجیہ سیواؤجی راول، بطورہ۔ ہمارا اجیہ

سیواؤجی یونیورسٹی پریس، بطورہ۔ ۱۹۶۱ء

۶۸۔ مرآت عالم؛ بٹنوارخان [قلمی نسخہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور]

۶۹۔ مصباح العاشقین؛ از شیخ بہار الدین بن محمود بن ابراہیم نمبرہ قاضی شیخ حمید الدین

ناگوری [قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور]

۷۰۔ معجم المؤلفین؛ عمر رضا کمال۔ المکتبۃ العربیہ دمشق۔ مطبعۃ الترقی۔ دمشق ۱۹۵۷ء

۷۱۔ مفتاح التواریخ؛ فشی دانشور۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۸۷ھ

۷۲۔ مقدمہ [بر کتاب التمانہ فی مرثیۃ الخزانہ، تصنیف علامہ مخدوم محمد جعفر یوکانی]

مولانا ابوسعید غلام مصطفیٰ قاسمی سندھی، سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء

۷۳۔ مقدمہ مرقات شرح مشکوٰۃ، ملاحظی قاری۔

۷۴۔ مکتوبات قدوسی؛ شیخ عبدالقدوس گنگوہی۔ مطبع احمدی، دہلی۔

۷۵۔ منتخب التواریخ؛ ملا عبدالقادر بدایونی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۸۷ھ

۷۶۔ منتخب اللباب، جلد اول؛ محمد ہاشم الخاطب بہ خانی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی

بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء

۷۷۔ نرہنۃ الخواطر، جلد ۲؛ علامہ سید عبدالرحمن حسنی لکھنوی۔ مجلس دائرۃ المعارف

حیدرآباد دکن - ۲/۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۲ء

۷۸ - النور السافر فی اخبار القرآن العاشر: عبدالقادر بن عبداللہ عمیر روسی -

ناشر المکتبۃ العربیہ بغداد - مطبعتہ الفرات، بغداد - ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۲ء

۷۹ - ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین، جلد اول - اسماعیل پاشا -

مطبع بہیہ استنبول - ۱۹۵۱ء

۸۰ - ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین و آثار المصنفین، جلد ثانی - اسماعیل پاشا -

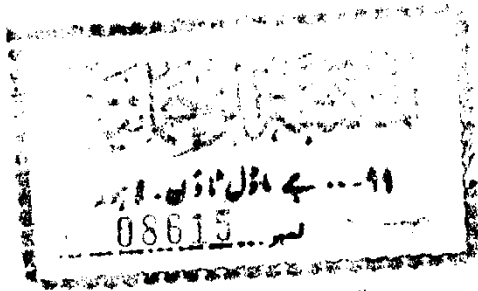
مطبع بہیہ استنبول - ۱۹۵۵ء

۸۱ - مہفت اقلیم، جلد سوم: امین احمد رازی تصحیح و تعلیق، جواد فاضل ناشر -

کتاب فروشی علی اکبر و کتاب فروشی ادبیہ، طهران -

۸۲ - یاد ایام: مولانا سید عبدالرحمن حسینی لکھنوی - مطبعہ انسٹیٹیوٹ علی گڑھ کالج -

۱۹۱۹ء / ۱۳۳۷ھ



www.KitaboSunnat.com

